

# انعام کتب

مُحَمَّد اسحاق بہٹی

ادارۂ ثقافت اسلام آباد

۲۔ کتب خانہ روضہ لاہور

# اُسْفَانِ حَنِيفُ

مُتَبِّرًا  
مُحَمَّدُ حَسَنُ قَاضِي

إِدَارَةُ ثِقَافَتِ اِسْلَامِيَّةِ  
۲۔ کلب روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

طبع اول ۱۹۸۹ء

---

ناشر : سراج منیر  
ناظم ادارۃ اشاعت اسلامیہ  
۲، کلب روڈ، لاہور

مطبع : کبیر پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۱۰۰ روپے

---

# ترتیب

۹

۱۔ کچھ ارمغانِ حنیف کے بارے میں  
۲۔ ابتدائیہ

۱۱

سراج منیر

۱۷

۳۔ مولانا محمد حنیف ندوی خود اپنی زبانی

۴۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات

۲۳

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے

محمد اسحاق مہیٹی

۵۵

۵۔ تفسیر سراج البیان

محمد سعید الرحمن علوی

۶۔ مولانا محمد حنیف ندوی اور ان کی

۸۷

خدمات گونا گوں

محمد اسحاق مہیٹی

۷۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا اسلوب نگارش

۱۸۷

چند اشارات

میرزا ادیب



۱۹۷

۸۔ دین حنیف اور مولانا محمد حنیف ندوی

تحسین فراقی

۲۰۹

۹۔ مولانا محمد حنیف ندوی

بہشت ریڈیو مقرر

عبدالحمید قریشی

۲۱۵

۱۰۔ مولانا محمد حنیف ندوی

واقعات و لطائف کے آئینے میں

محمد اسحاق بھٹی

۳۵۱

۱۱۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا سفر آخرت

محمد اسحاق بھٹی

# کچھ ارمغانِ حنیف کے بارے میں

آج سے ساڑھے چار سال پہلے ۳۰ جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیرِ اہتمام واپڈا آڈیٹوریم (لاہور) میں مولانا محمد حنیف ندوی کے ساتھ ایک شام منائی گئی تھی، جس کی صدارت اس زمانے کے وفاقی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر محمد افضل نے کی تھی۔ اس تقریب میں علوم و فنون کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات نے شرکت کی تھی اور مولانا کی تحقیق و کاوش کے مختلف پہلوؤں پر متعدد اصحابِ علم نے مقالے تحریر کیے تھے۔ مقالہ نگاروں میں جناب میرزا ادیب، پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی، مولانا قاری سعید الرحمن علوی اور ان سطور کا راقم شامل تھے۔ یہ مقالے مولانا کی زندگی اسی میں کتابت کے مراحل سے گزر گئے تھے اور

”ارمغانِ حنیف“ کے نام سے جلد ہی ان کو طبع کرانے کا ارادہ تھا — ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سرج منیر صاحب کا خیال تھا کہ کتاب چھپنے کے بعد مولانا کے اعزاز میں ایک اور تقریب منعقد کی جائے گی، جس میں یہ کتاب مولانا کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ لیکن اس اثنا میں مولانا شدید بیماری کی گرفت میں آ گئے۔ پھر علاج کے لیے لندن چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح کتاب کی طباعت و اشاعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔

اس مجموعہ مضامین میں صرف دو مضمون ایسے ہیں جو مولانا کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ ایک جناب سراج منیر صاحب کا 'ابتدائیہ' اور ایک راقم عاجز کا، جس کا عنوان ہے "مولانا محمد حنیف ندوی کا سفر آخرت"۔ باقی تمام مضامین میں مولانا زندہ ہیں اور یہ مضامین مولانا کے مطالعے میں بھی آچکے ہیں۔

اس کا افسوس ہے کہ "ارمغانِ حنیف" مولانا کی خدمت میں پیش نہ ہو سکی، لیکن یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے عقیدت مندوں اور ان پر کام کرنے والوں کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

محمد اسحاق بھٹی

۱۶۔ فروری ۱۹۸۹ء

## ابتدائیہ

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی روایتِ علم کا اپنا ایک خاص مزاج رہا ہے اور یہ مزاج اس اعتبار سے پورے عالمِ اسلام میں ہمیشہ ایک شانِ امتیاز کا حامل رہا کہ اس کی ترتیب میں عالمِ اسلام کے مختلف منطقوں کے عناصر نے اپنا ایک نادر توازن دریافت کیا۔ اس میں منقولات کا عرب مزاج اگر ایک طرف پوری طرح کار فرما دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف عجم کی روایتِ دانش جلوہ نما نظر آتی ہے۔ صدیوں پر پھیلے ہوئے اس نظامِ علم کو اکابرِ علما اور اہل دانش نے مرحلہ وار کمال تک پہنچایا اور اس اعتبار سے اس نظام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں انسانی شخصیت کی تکمیل کے لیے ضروری تمام عناصر کو یکجا کر دیا گیا۔ عہدِ جدید میں ہمیں اس نظامِ علم کا نقشِ اول مدرسہٴ ریحیمیہ کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ عین اس وقت جب برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار چراغِ سحری تھا دینی میدان میں دو بڑے کارنامے سرانجام دیے گئے۔ فتاویٰ عالمگیری کی

تدوین ہوئی اور مدرسہ رحیمہ کی بنیاد رکھی گئی۔ یہی وہ وقت ہے جب مغلوں کا شاہجہان آباد روحانی انوار کے پر تو سے جھمگ رہا ہے اور اس کی کرنیں پورے برصغیر بلکہ اس سے باہر کے علاقوں کو بھی منور کر رہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے روایتِ علم و فکر کی جو تجدید کی اور تصورِ جہاد کی جو عملی صورت حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی شکل میں سامنے آئی وہ ہماری تاریخ کا عظیم سرمایہ ہے۔ ایک خاص وقت میں ان تجدیدی کارناموں کا یکجا ہونا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عموماً جب روایتی تمدن ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے پہلے دور میں حاصل کیے ہوئے سارے سرمائے کی ترتیب نو کرتے ہیں۔ زمانے اور اُس کے مطابق نفوسِ انسانیہ میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کے لیے نظاموں میں رد و بدل کر کے ایک ایسا سانچہ ترتیب دیا جاتا ہے جو مقاصدِ دین کو پورا کرنے کے لیے زیادہ سازگار اور مناسب ہو۔ یہی عمل اٹھارویں صدی کے آغاز سے برصغیر میں دکھائی دیتا ہے اور تیزی سے اپنے تمدن اور علومِ دینیہ کے لیے ایک ایسا نظام وضع کرتا ہے کہ وہ طوفانِ بلائیں جو اس کے فوراً بعد اس خطہٴ ارض پر نمودار ہوا اور یہاں کی دوسری تہذیبوں کی مذہبی روایت کو سمیٹتا ہوا چلا گیا، وہ اسلامی علوم اور نظامِ علم کو سلبی طور پر کہیں متاثر نہیں کر سکا۔

مسلمانوں کا نظامِ علم دنیاوی سلطنت کے عین وسط میں وہ روحانی اقلیم تھی جو زمانے کی گردشوں سے منزہ رہی اور اس طرح اس نے اپنے لوگوں کے عقائد اور علوم کی حفاظت کا فریضہ اس کمال کے ساتھ سرانجام دیا کہ آج اس کا شمار ایک عظیم

تاریخی کرامت کے طور پر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دینی علوم کے منظر پر اس سے مدارس کا ایک پورا نظام پیدا ہوا جس میں دیوبند اور ندوۃ العلماء کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب جدید سائنس اور فلسفے کی یورش کا اصل نشانہ مسلمانوں کی دینی روایت ہو اور مغرب میں تاریخ کے نئے تنقیدی تصورات کا تختہ مشق نہایت فیاضی سے اسلامی تاریخ کو بنایا جا رہا ہو، اس وقت یہ ضروری تھا کہ ایک نئے کلامی اسلوب کی بنیاد رکھی جائے اور تاریخ کو ایک ایسے نقطہ نظر سے مرتب کیا جائے کہ وہ صحت بیان کے ساتھ ساتھ دنیا میں تاریخ نگاری کے اعلیٰ ترین معیاروں پر پوری اتر سکے۔ نظام علم میں تصنیفی عنصر کی اہمیت بھی اس بات کی متقاضی تھی کہ تحقیق کی ایک نئی روش جو کسی طور دنیا کے کسی اور تحقیقی اسلوب سے کمتر نہ ہو آغاز کی جائے۔ یہ وہ عناصر ہیں جو ندوۃ العلماء میں خصوصی توجہ کا مرکز رہے اور دینی میدان میں آج ہماری روایت، علم کا دامن ان شعبوں میں ندوہ کی ہی اس کاوش سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کے زیر اثر جو نقطہ نظر اور اسلوب بیان پیدا ہوا اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کے قلم سے بیسویں صدی کی اختتامی دہائیوں تک پہنچا اس کا اپنا ایک اہم کردار ہے۔ ندوۃ العلماء نے میدان علم میں جو نمایاں لوگ پیدا کیے، ان میں مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جگہ ایک یگانہ روزگار تابعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ایک بڑا اعزاز یہ بھی ہے کہ ادارے کو مولانا کی سرپرستی سے طویل استفادے کا موقع ملا اور ادارے

کے علمی مزاج پر اُن کی چھاپ بہت گہری ہے۔ مولانا کا قلم علوم دینیہ کے تمام میدانوں میں یکساں سہولت و اعتماد کے ساتھ چلتا تھا۔ قرآن، حدیث، تفسیر، تاریخ، کلام، اخلاقیات، مسائل جدید، غرض کوئی اہم شعبہ ایسا نہیں جس میں مولانا کی تصنیف اپنے موضوعات پر اُن کی گرفت کی کامل شہادت نہ دیتی ہو۔ آپ کی طبیعت میں ایک ایسی نادر لطافتِ فہم موجود تھی کہ عہدِ جدید میں نفوسِ انسانیہ اور تاریخ کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ نے گویا علوم دینیہ کے تمام بڑے شعبوں میں نشانِ راہ قائم کیے اور ان سارے شعبوں میں آپ کو سنہ کی حیثیت حاصل رہی۔ علمی کاموں میں اس قدر استغراق کے باوجود آپ انتہائی شگفتہ مزاج، علومِ مجلسی کی لطافتوں سے آشنا اور شعر و سخن کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ تھے کسی بھی محفل میں آپ کی موجودگی مولانا روم کے اس مصرعے کی مصداق ہوا کرتی تھی۔

### کارِ مرداں روشنی و گرمی است

مولانا کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ایک تمدن کتنا مکمل آدمی پیدا کر سکتا ہے اور کس طرح مختلف پہلوؤں سے متوازن شخصیت کی تربیت کر سکتا ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی جدائی برصغیر میں مسلمانوں کی پوری علمی دنیا کے لیے ایک عظیم صدمہ تھی اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے تو اہم ترین علمی سرپرستی سے محرومی کا جانکاہ واقعہ تھا۔ مولانا نے اپنی علمی زندگی کا بیشتر حصہ ادارے میں بسر کیا۔ ادارے میں اپنے قیام کے دوران، نہ صرف یہ کہ انھوں

نے متعدد کتابیں تصنیف کیں بلکہ اپنے رفقاء کے علمی تربیت اور رہنمائی بھی فرمائی۔ مولانا کی جامع کمالات شخصیت اور ان کے علمی کارناموں پر مشتمل یہ کتاب ”ارمغان حنیف“ شائع کی جا رہی ہے۔ یہ کتاب ادارے پر مولانا کے احسانات کا بدلہ تو نہیں، ان کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنے کی صرف ایک ادنیٰ کوشش ہے۔

سراج منیر



# مولانا محمد حنیف ندوی

## خود اپنی زبانی

یہ نہایت مختصر مضمون تین سال پہلے مولانا محمد حنیف ندوی نے گورنمنٹ کالج  
گوجرانوالہ کے مجلہ ”ممک“ کے خصوصی نمبر سلسلہ کالج کے جشن سیمیں (سلور جوبلی)  
کے لیے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے ابتدائی دورِ زندگی اور اپنے شہر گوجرانوالہ کی  
چند اہم شخصیتوں کے بارے میں کچھ اشارے کیے ہیں جو بیخ بھی ہیں اور دلچسپ  
بھی۔ (مرتب)

میں ان عالی قدر مرتبین مجلہ کی، جو گوجرانوالہ کی علمی و فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے  
مرتب کر رہے ہیں، یاد فرمائی گا بہر حال ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے فراموش نہیں کیا میں ذاتی طور  
پر سستی شہرت کو پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی علم و دانش کے معنی میرے نزدیک یہ نہیں کہ کوئی  
شخص فقہ و حدیث، قرآن و سنت اور مردِ جہِ علوم و معارف کو کس حد تک جانتا اور ان پر عبور  
رکھتا ہے۔ میں اس شخص کو عالم، دانشور اور محقق سمجھتا ہوں جو اپنے حدودِ چل کو اچھی طرح پہچانتا  
ہو اور اس حقیقت سے آشنا ہو کہ جن حقائق سے وہ آگاہ ہے، مقدار و اہمیت کے اعتبار  
سے وہ بہت کم ہیں، اور علم و فن کے جن دروازوں پر اس نے دستک نہیں دی، ان کی تعداد بہت  
زیادہ، بہت وسیع اور پھیلی ہوئی ہے۔

میں اس حقیقت پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ جس شخص نے بھی اپنی زندگی میں علم و آگاہی کی تکمیل کا  
دعویٰ کیا، اس نے اپنی موت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ میں چونکہ اس بڑھاپے میں بھی اپنے ذہن و  
فکر کی نشاط آفرینیوں کو زندہ و تابندہ دیکھنے کا آرزو مند ہوں، اس لیے خوب جانتا ہوں کہ اس  
کاوش و محنت کے باوجود جو میں نے فکر و علم کی زلف و کاکل کو سنوارنے اور سجانے کے سلسلے میں انجام

دی، ہنوز اپنے جہل کا اعتراف کروں۔ میں اس بات کا قطعی سزاوار ہوں کہ میرا نام گوجرانوالہ کے مشاہیر کی فہرست میں نہ آنے پاتا۔ مجملہ کی تکمیل کے آخری مرحلے میں غالباً میری یاد فراموشی کی ایک معقول وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں نے جو کچھ بھی علم کے دائروں میں کیا دھرا، اس کا تعلق، گوجرانوالہ سے صرف اس قدر ہے کہ میں نے اس شہر و فاشعار میں جہنم لیا اور اپنی تعلیم و تدریس کے ابتدائی مرحلے اس شہر مردم آفریں میں طے کیے۔

میری ساری زندگی میں کوئی معرکہ آرائی، مہم جوئی اور غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ ہاں کچھ پڑھا اور لکھا ضرور ہے۔ کچھ مسائل پر اپنے مخصوص زاویہ نظر سے اظہارِ خیال بھی کیا ہے۔ یہ ہے میری زندگی کی کل کائنات۔

مختصر حالات و کوائف کا انداز کچھ اس طرح ہے کہ ۸-۶۱۹ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز میونسپلٹی کے پرائمری سکول میں ہوا۔ درجہ چہارم تک پڑھا اور پھر والد محترم کی خواہش و آرزو کے مطابق دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ ابتدا میں دینی تعلیم پر کُشش ثابت نہ ہوئی۔ لیکن جوں جوں تعلیم کے قدم آگے بڑھتے گئے، اس اسلوبِ تعلیم کی عظمت و گہرائی کے نقوش لوح و قلب پر برابر مرتسم ہوتے چلے گئے۔

سکول کی تعلیم میں جس شخص نے پہلے پہل ذوق و آگاہی کو جلا بخشی وہ خاندانِ حکیمان کے ایک فرد حلیل حکیم ظہور الدین تھے، جن کو فارسی ادب پر بہت عبور حاصل تھا۔ وہ کلاس میں اکثر حافظ کے اشعار لے کے ساتھ اور سکرومستی کے وجد آفریں عالم میں ہمیں سناتے رہتے حکیم ظہور الدین گوجرانوالہ کے معروف عالم اوطیب حکیم شہاب الدین کے فرزند اور مشہور عالم دین مفتی جعفر حسین مرحوم کے تایا زاد بھائی تھے۔

عربی میں درسِ نظامیہ کی تکمیل حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ مولانا مرحوم نہ صرف میرے گرامی قدر استاد تھے بلکہ میرے مربی و مرشد بھی تھے۔ علم و ادراک کی پہلی قدیل انہی کی کوشش سے دل میں فروزاں ہوئی۔ ان کے مطالعو و استعداد کے دائرے بہت وسیع اور بہت پھیلے ہوئے تھے۔ اگر اپنی اصلاحی کوششوں کو گوجرانوالہ کے ماحول تک محدود نہ رکھتے تو ان کا شمار علمی اعتبار سے برصغیر کے عظیم لوگوں میں ہوتا۔

انہی میں سے ہم عصر جن سے اگرچہ میں نے کچھ پڑھا نہیں، لیکن ان کے استحضارِ علمی اور جامعیت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ان کی ذات میں منقول و معقول کا ایسا اونچا، گہرا اور عمیق امتزاج پایا جاتا ہے کہ ان کے بے شمار تلامذہ میں سے اگر کوئی شخص ان کے فیوضِ علمی کی پہنائیوں کو قلم بند کر لیتا تو ان کی عظمت کا لوہا ہر پڑھا لکھا عالم بغیر کسی تحفظ کے جان لینے پر مجبور ہو جاتا۔ ان کا نام نامی مولانا حافظ محمد گوندلوی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ان کے سینکڑوں تلامذہ میں سے کسی کو بھی یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی۔

میں نے اپنے دور کے جید عالم مولانا عبدالعزیز خطیب جامع مسجد کی صحبتوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مرحوم کی علوم حدیث اور عربی کے ادبی و علمی لطائف و نکات پر بہت دسترس تھی۔ مزاج میں انکسار اور تواضع کا عنصر عجیب بہار دکھاتا تھا۔

قاضی عبدالرحیم سے بھی جو اپنے وقت کے مشہور طبیب، عالم اور نہایت شریف النفس انسان تھے، میں نے مولانا اسماعیل مرحوم کی غیر حاضری میں چند اسباق پڑھے۔ میں نے پہلی دفعہ ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحات کی تمام جلدیں نہ صرف ان کے ہاں دیکھیں بلکہ بعض مشکل مقامات کی تشریح بھی ان کی زبان فیض تر جہان سے سُنی۔

آشنائی کا یہ نقطہ آغاز تھا جس نے آگے چل کر تصوف کے اسرار و رموز کو سمجھنے میں مدد دی۔ میں واضح الفاظ میں کہتا چاہتا ہوں کہ ان کی صحبت سے اگر مجھے مستفید ہونے کا موقع نہ ملتا تو آج کل کے مشہور محقق، صوفی اور عظیم فلسفی و مفکر شوآن کی کتابیں قطعی سمجھ نہ پاتا جو مغرب میں وحدت الوجود اور وحدت ادیان کے زبردست حامی اور ترجمان ہیں۔ یوں کہیے کہ وہ اسی دور کے ابن عربی ہیں۔

نا انصافی ہوگی اگر اس سلسلے میں شیخ برادری کے کھاتے پیتے گھرانے کے مذہب و شائستہ عالم دین شیخ نور الدین کا ذکر نہ کروں، جن کی تقریروں کے سلجھاؤ، روانی اور تاثیر نے مجھے خطابت کے گڑ سلجھائے۔ ان کے دلچسپ اور باموقع مواظ کا اثر اب تک مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آفاق و ابعد فکر کی وسعت و گیرائی کے متعدد درجے شہر کے مشہور وکیل اور قانون دان دین محمد کی ایک تقریر دل پذیر سے کھلے جو اسلام کے فضائل و محامد پر مشتمل تھی۔ میں نے

جب گوجرانوالہ کے ایک اجلاس میں ان کی یہ تقریر سنی تو اس سے فکر و نظر کے دائرے نہ صرف کشادہ ہوئے بلکہ مطالعہ و تحقیق کے نئے موڑ فکر و نظر کے سامنے آئے۔

میرے دور کے ایک اور فاضل مولانا عبد اللہ منہاس تھے، جن سے متعدد بار گفتگو کے مواقع میسر آئے۔ یہ عربی زبان و ادب کے بہت بڑے رمز شناس تھے۔

پاکستان کی بالخصوص اور مردم آفریں بلدہ طلیبہ گوجرانوالہ کی بالعموم میرے نزدیک اس دور میں کیا اہمیت ہے۔ اس کو چند جملوں میں بیان کر کے اپنے تاثرات کو شکسپیئر اور میزینی کے الفاظ میں یوں ختم کرتا ہوں۔ انگلستان کے بارے میں شکسپیئر نے کہا تھا۔

”یہ خوش آئند انسانوں کا مقام ہے۔ یہ پورے کارخانہ عالم کا ننھا سا آئینہ دار ملک ہے۔ یہ وہ قیمتی پتھر ہے جو سیمیں سمندریں نصب ہے۔ یہ برکت آفریں جگہ ہے۔ اس قلم کا نام انگلیکینڈ ہے۔“

میزینی نے اٹلی کے بارے میں کہا تھا۔ ”اٹلی میرا مذہب ہے۔“

میں کہتا ہوں، میرا ملک پاکستان اور میرا شہر گوجرانوالہ مادی و روحانی خزانوں سے مالا مال ہے۔ اس شہر نے عظیم علما، صحافی اور شاعروں کو جنم دیا ہے۔ یہ علم و فضل کا گوارہ ہے اور اس کا مستقبل روشن و تابندہ ہے۔ میرے ملک اور شہر کی مٹی میں الوقت، محبت اور اخلاص کی مہک ہے۔ اور میری رائے میں وہ صبح صادق جلد طلوع ہونے والی ہے، جس سے زندگی، دین اور اعلیٰ انسانی اقدار کے آفاق دمک اٹھیں گے۔ میرے شہر کے مکیں مخلص، متدین اور نہماں نوازی ہیں۔ خدا کرے ان میں علم و عرفان کے خوابیدہ جذبے جاگ اٹھیں اور یہ پورے ملک میں اپنے لیے ایک مقام حاصل کر لیں۔

# مولانا محمد حنیف ندوی

کی خدمات  
ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے

محمد اسحاق مہٹا

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ۱۹۵۰ میں قائم ہوا۔ اس کے بانی ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم تھے۔ اس زمانے میں مولانا محمد حنیف ندوی گوجرانوالہ میں اقامت گزیرے تھے اور ہفت روزہ ”الاعتصام“ کے ایڈیٹر تھے جو ان دنوں گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا۔ میں اس اخبار کا معاون ایڈیٹر تھا۔ خلیفہ صاحب مرحوم کو مولانا کی منزلتِ علمی کا پتا چلا تو انھیں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ مولانا لاہور آئے اور خلیفہ صاحب سے ملے۔ گفتگو ہوئی تو انھوں نے مولانا سے ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور اس سے وابستگی اختیار کرنے کی درخواست کی۔ یہ اوائل مئی ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔

خلیفہ صاحب سے ابتدائی گفتگو کے بعد مولانا نے ان کی پیش کش کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے۔ اس وقت مولانا کی عمر تینتالیس برس کی تھی۔ اس وقت سے اب (۲۰ ستمبر ۱۹۸۶ء) تک جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، مولانا ادارے سے منسلک ہیں۔ شمسی حساب سے اس پر سینتیس برس چار مہینے پانچ دن کا عرصہ گزر چکا ہے۔

اس اثناء میں مولانا نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے پندرہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں بعض کتابیں وہ ہیں، جنھیں عربی سے اردو میں منتقل کیا اور پاکستان کی قومی زبان کو نئی اصطلاحات، نئے اسلوب اور نئے علوم و فنون سے روشناس

کر لایا۔ اس طرح انھوں نے جہاں علیم و فتون کی گراں مایہ خدمت انجام دی، وہاں اُردو زبان کو بھی ایک نیا آہنگ اور نیا عنوان عطا کیا۔ عربی زبان کو بھی لغت و لحن کے خاص میدان سے نکال کر اصحابِ تحقیق و کاوش کے نئے حلقے سے متعارف کرایا۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ عربی اور اُردو دونوں زبانیں مولانا کی زیر بارِ احسان ہیں۔

مولانا کا اندازِ فکر و بیان خالص فلسفیانہ ہے اور زبان و طرزِ ادا ان کی اپنی ہے، جس کی شگفتگی و شیرینی اور سلاست و روانی انہی سے مخصوص ہے۔

انھوں نے قرآن و حدیث کے بحرِ بے کراں میں بھی غوطے لگائے، اسلامی اوامر و احکام کو بھی ہدفِ فکر ٹھہرایا، فلسفہ و کلام کی وسعتوں کا بھی ان کے قلمِ حقیقت رقم نے احاطہ کیا اور منطق و حکمت کی وادیوں کے بھی مہر گوشتے کی ان کے خامہٴ عبرتِ شاہ نے جی بھر کر سیاحت کی۔ تحریر کے ہر موڑ پر، تصنیف و تالیف کے ہر مرحلے میں اور ترجمے کی ہر منزل میں، ادبیت کی لطافت اور زبان کی چاشنی ان کے ہم رکاب رہی۔ بعض مقامات پر وہ الفاظ و اصطلاحات کی انتہائی مشکلات سے بھی دوچار ہوئے اور وادیِ فن کی نہایت کٹھن منزلیں بھی ان کے سامنے آئیں، لیکن ان کی رسائیِ فہم نے ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا اور ان کا رہوارِ قلم علم و فن کے تمام نشیب و فراز سے نہایت سبک رفتاری سے گزرتا اور ہر گھائی کو انتہائی ہنرمندی سے عبور کرنا گیا۔

ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ و منطق کے پیچیدہ اور گنجگاہ ترین مسائل و مضامین کو ادب کا دلاویز خلعت پہنا دیا ہے اور قاری ان کی تصنیفات سے بیک وقت دو فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ زیرِ بحث موضوع میں وسعتِ معلومات سے بھی اپنا دامن طلب بھر سکتا ہے اور ادب و زبان کی لطافتوں اور حلاوتوں سے بھی بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ بوسنت اور عبوسنت کا کوئی شائبہ نہ ان کی تحریر میں دخل انداز کی جرات کر سکتا ہے، نہ تقریر اور عام گفتگو میں راہ پاسکتا ہے۔

مولانا حنیف ندوی کا شمار اصحابِ جبہ و قبا میں نہیں ہوتا اور انھوں نے کبھی اپنا



کوئی خاص حلقہ قائم کرنے کی طرف بھی عنانِ توجہ مبذول نہیں کی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ تحقیقِ موضوع اور سلاست و شگفتگیِ بیان کے سلسلے میں طبقہٴ علما میں ان کا کوئی حریف نہیں، علومِ اسلامی پر درک و عمق میں کوئی ان کا لگا نہیں کھا سکتا اور ذہین و فکر کی صفائی اور نیچ ادا میں کوئی ان کی انفرادیت کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ کا خاص عطیہ ہے اور اللہ نے اس سے ان کو خوب نوازا ہے۔

قرآن و تفسیر، حدیث و سنت، فقہ و اصول، کلام و منطق اور فلسفہٴ قدیم و جدید پر مولانا کو عبور و استحضار حاصل ہے اور ان تمام موضوعات پر انھوں نے لکھا اور بہت لکھا جو ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آیا۔ تصنیفات کے علاوہ ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ کے ترجمانِ دو ماہانہ رسالوں — ”ثقافت“ اور ”المعارف“ — میں بھی مختلف علمی و تحقیقی عنوانات پر ان کے بہت سے مضامین شائع ہوئے اور طبقہٴ اہلِ علم میں مستحقِ داد و تحسین قرار پائے۔

”ثقافت“ پہلا ماہانہ رسالہ تھا جو جنوری ۱۹۵۵ء میں ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس میں مولانا نے متعدد مضامین سپردِ قلم کیے۔ ثقافت میں انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کیا، جس کا عنوان تھا، ایک آیت کی تفسیر“ یہ سلسلہ عرصے تک جاری رہا۔ اس میں وہ قرآن مجید کی کسی مشکل اور ایسی اہم ترین آیت کی تفسیر بیان کرتے تھے، جس میں کوئی خاص علمی، ادبی، فقہی، نجومی یا لغوی نکتہ نہ تھا۔

مولانا طبعاً مشکل پسند ہیں اور زیادہ تر کسی ایسے ہی موضوع کو منتخب کرتے اور زیرِ بحث لاتے ہیں، جس میں کوئی اشکال پایا جاتا ہو۔ پھر اپنے اسلوبِ خاص سے اس اشکال کی عقدہ کشائی کرنا یا بقول ان کے اس کی ”معقدہ پریشان کو سلجھانا“ ہمیشہ ان کا محبوب مشغلہ رہا۔

جنوری ۱۹۶۸ء میں ”ثقافت“ کا نام بدل کر اُسے ”المعارف“ کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ اس میں بھی مولانا کے بہت سے مضامین شائع ہوئے جو انتہائی ذوق و

شوق سے پڑھ گئے۔

مولانا ندوی کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنی بات کہہ کر آگے نکل جانے کے عادی ہیں۔ کوئی اس سے کیا اثر لیتا ہے اور اس کا کیا جواب دیتا ہے، اس کی انہیں پروا نہیں ہوتی۔ پیچھے گردن موڑ کر دیکھنا، حریف کا انتظار کرنا اور پھر اس سے جھگمگھٹھا ہونا، ان کا شیوا نہیں۔ بعض حضرات نے ان کے بعض افکار پر تنقید بھی کی اور انہیں نشانہ اعتراض بھی بنایا، حتیٰ کہ بعض لوگ ذاتیات پر بھی اتر آئے لیکن انہوں نے نہ کبھی کسی کو اپنا حریف گردانا اور نہ کسی کی تنقید و اعتراض کو قابل جواب یا لائقِ اعتنا ٹھہرایا۔

مولانا نے اپنی تحقیق کے مطابق ہمیشہ کتاب و سنت کو مشعلِ راہ بنائے رکھا اور یہی ان کا عقیدہ اور یہی ان کا اصل سرمایہٴ حیات ہے۔ لیکن اس ضمن میں ان کی اپروچ سائنٹیفک اور فلسفیانہ ہے اور ان کے نزدیک منقول و مقبول دونوں اپنی اپنی جگہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے نقطہٴ نظر سے دونوں سے کسبِ ضیاء کرنا ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

وہ اس اعتبار سے مقدمت پسند ہیں کہ ان کے نزدیک ہمارے تمام معاملات کا اصل ماخذ و مرجع کتاب و سنت ہے اور اسی کی روشنی میں ہمیں آگے بڑھنا اور اپنے لیے ترقی و تقدّم کا راستہ تلاش کرنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ عصری تقاضوں اور دورِ جدید کے مسائل سے بھی کسی صورت میں روگرداں ہونے کو تیار نہیں۔ ان کا نقطہٴ فکر یہ ہے کہ کوئی فرد یا معاشرہ اپنے عہد کے مسائل اور تقاضوں کو نظر انداز کر کے سفرِ حیات کی طویل اور کٹھن منزلیں ہرگز طے نہیں کر سکتا۔ پیش آئند مسائل کے حل و کشود کے لیے جہاں کتاب و سنت سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے، وہاں فقہ و اصول، اجماع و قیاس اور اجتہاد کے بابِ عالی پر دستک دینا بھی لازم ہے۔ اور یہ باتیں اپنی تصنیفات میں مختلف مقامات پر انہوں نے تفصیل سے لکھی ہیں۔

آئیے پہلے ترتیبِ تصنیف کے اعتبار سے مولانا کی ان کتابوں کا شمار کریں جو انہوں نے

ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے لکھیں۔ اس کے بعد تقدیسِ موضوع کی روشنی میں ان کا تعارف کرایا جائے گا۔

۱۔ مسئلۂ اجتہاد : یہ ادارے کی طرف سے ان کی پہلی تصنیف ہے۔ سالِ اشاعت ۱۹۵۲ء۔

۲۔ افکارِ ابنِ خلدون : ۱۹۵۴ء۔

۳۔ افکارِ غزالی : ۱۹۵۶ء۔

۴۔ سرگزشتِ غزالی : ۱۹۵۹ء۔

۵۔ تعلیماتِ غزالی : ۱۹۶۲ء۔

۶۔ مکتوبِ مدنی : ۱۹۶۵ء۔

۷۔ عقلیاتِ ابنِ تیمیہ : ۱۹۶۶ء۔

۸۔ مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد اول) : ۱۹۶۸ء۔

۹۔ مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد دوم) : ۱۹۷۰ء۔

۱۰۔ اساسیاتِ اسلام : ۱۹۷۳ء۔

۱۱۔ تہافتِ الفلاسفہ (تلخیص و تفہیم) : ۱۹۷۴ء۔

۱۲۔ مطالعۃ قرآن : ۱۹۷۸ء۔

۱۳۔ مطالعۃ حدیث : ۱۹۷۹ء۔

۱۴۔ لسان القرآن (جلد اول) : ۱۹۸۳ء۔

۱۵۔ لسان القرآن (جلد دوم) : ۱۹۸۴ء۔

یہ پندرہ کتابیں ہیں جو مولانا نے ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے تصنیف کیں یا جن کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ مولانا کا طریقِ ترجمہ کچھ ایسا ہے کہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ ترجمہ شدہ کتاب ہے تو قطعی پتا نہیں چلتا کہ اسے کسی دوسری زبان سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اگر یہ ممکن ہو کہ خود مصنف اپنی کتاب کا وہ ترجمہ پڑھ سکے جو مولانا نے کیا تو اسلوب و انداز اور زبان و ادب کے لحاظ سے ترجمے کو اپنی اصل

کتاب پر ترجیح دینے کے لیے مجبور ہو جائے۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ مولانا جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہ الفاظ کو منتخب نہیں کرتے، بلکہ خود الفاظ اپنے وسیع حلقہ الفاظ سے منتخب ہو کر اور نہایت ادب سے قطار بنا کر ان کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کا قلم حسن آشنائی سیلے اور دلکش ترتیب سے ان کو جملوں اور فقروں کی خوب صورت لڑی میں پروتا جاتا ہے۔ شروع سے آخر تک یہ سلسلہ پورے وقار اور تمام لوازم احترام کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

اب ذیل میں مولانا کی تصنیفات کا قدرے تفصیل سے تعارف کرایا جاتا ہے۔ اس تعارف میں تقدیس موضوع کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی پہلے قرآن حکیم سے متعلق کتابیں آئیں گی، اس کے بعد حدیث، پھر اسلام، بعد ازاں اجتہاد اور پھر جن حضرات سے متعلق کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی ترتیب زمانی کو سامنے رکھا گیا ہے۔ تو آئیے سب سے پہلے قرآن مجید۔!

### مطالعہ قرآن

ایک عرصے سے مولانا محمد حنیف ندوی کے دل میں یہ خواہش شدت سے کروٹ لے رہی تھی کہ قرآن اور حدیث کو موضوع تحقیق ٹھہرایا جائے۔ اس کی بنیادی وجہ اس مقدس اور جاں فزا موضوع سے ان کا روحانی اور قلبی تعلق ہے۔ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز بھی اسی سے کیا تھا اور ”سراج البیان“ کے نام سے پانچ جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی جو پندرہ سولہ دفعہ چھپ چکی ہے۔ اب عمر کے آخری دور میں بھی وہ یہی خدمت انجام دینا چاہتے تھے۔ اس کا آغاز انھوں نے ”مطالعہ قرآن“ سے کیا۔

مطالعہ قرآن میں انھوں نے قرآن کریم سے متعلق ان تمام مباحث و مسائل پر محققانہ اظہار خیال کیا ہے، جن سے قرآن فہمی میں مدد ملتی ہے، اور اس کتاب بڑی کی عظمت و رفعت واضح شکل میں فکر و نظر کے زاویوں میں آتی ہے۔ نیز جن سے قرآن کے علوم و معارف اور دعوت و اسلوب کی معجز طرزوں کا تفصیلی نقشہ سامنے آتا ہے۔

مطالعہ قرآن میں مولانا نے اپنے خاص شگفتہ اسلوب اور حکیمانہ انداز میں مستشرقین کے قرآن کے بعض مضامین پر پیدا کردہ ان اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیا ہے جو لوگوں کے قلب و ذہن میں شکوک و شبہات ابھارنے کا باعث ہو سکتے ہیں۔  
مطالعہ قرآن میں درج ذیل سولہ عنوانات کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے:

- ۱۔ قرآن کا تصویری و تفسیری۔
  - ۲۔ قرآن مجید اور کتبِ سابقہ۔
  - ۳۔ اسفارِ خمسہ۔
  - ۴۔ عہد نامہ مجید اور اناجیلِ اربعہ۔
  - ۵۔ قرآن حکیم اور اس کے اسما و صفات۔
  - ۶۔ قرآنی سورتوں کی قسمیں اور ترتیب۔
  - ۷۔ قرآنی سورتوں کی زمانی و مکانی تقسیم۔
  - ۸۔ جمع و کتابتِ قرآن کے تین مراحل۔
  - ۹۔ قرآن حکیم کی لسانی خصوصیات۔
  - ۱۰۔ اعجازِ قرآن اور اس کی حقیقت۔
  - ۱۱۔ محتویاتِ قرآن۔
  - ۱۲۔ مشکلاتِ قرآن۔
  - ۱۳۔ قرآن کے رسم الخط کے بارے میں نقطہ اختلاف۔
  - ۱۴۔ تفسیر۔
  - ۱۵۔ تفسیر کے مشہور مدرسہ فکر۔ اصحاب الحدیث اور اہل الرائے۔
  - ۱۶۔ اولیاتِ قرآن۔
- مطالعہ قرآن کا ”پیش لفظ“، جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان مرحوم و مغفور کا تحریر کردہ ہے۔

یہ کتاب ۳۱۰ صفحات پر مکتوی ہے۔ فرست مضامین اور مقدمے کے آخر صفحے

اس کے علاوہ ہیں۔

مطالعہ قرآن پہلی بار ۱۹۷۸ء میں طبع ہوئی۔

## لسان القرآن۔ جلد اول

قرآن مجید اور اس کے مضامین و متعلقات پر غور و فکر مولانا محمد حنیف ندوی کا مرغوب اور چہیتا موضوع ہے۔ ۱۹۷۸ء میں انھوں نے ”مطالعہ قرآن“ لکھی، اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں ”مطالعہ حدیث“ تصنیف کی۔ پھر قرآن مجید کے توضیحی لغت کو محور تحقیق ٹھہرایا اور اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس عظیم کام کا آغاز انھوں نے ۱۹۷۹ء کے آخر میں کیا اور ۱۹۸۲ء کے آخر میں اس کی ایک جلد مکمل ہو گئی، جس کا نام ”لسان القرآن“ رکھا گیا۔ یہ جلد حرف الف، ”اب“ سے شروع ہوئی اور حرف ج (ج ی د) ”جید“ پر ختم ہوئی۔

یہ قرآن مجید کا ایک جامع تفسیری اور توضیحی لغت ہے، جس میں مولانا نے قرآن حکیم کے الفاظ اور مطالب و معانی کو نہایت عمدہ طریقے سے نکھار کر بیان کیا ہے۔ بلاشبہ قرآن کے متعلق ان کی یہ ایک گراں قدر کوشش ہے۔ اس میں قرآن، حدیث، محاورات عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ لیا گیا ہے، جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات، تاریخ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق و ربط ہے۔ کثرتِ معلومات کے اعتبار سے ”لسان القرآن“ کو قرآن کے حکم و معارف کا گنجینہ قرار دینا چاہیے۔ مولانا کا پیرایہ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعہ سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمتِ قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہو جاتا ہے۔

لسان القرآن کی اس پہلی جلد پر ۳۳ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں قرآن فہمی کے اصول اور تقاضے بیان کیے گئے ہیں۔

کتاب ۴۰۰ صفحات پر محیط ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں اشاعت پذیر

ہوئی۔

## لسان القرآن - جلد دوم

لسان القرآن کی دوسری جلد حرفِ ح (ح ب ب) ”الحب“ سے شروع ہو کر حرفِ د (د ح ن) ”و الدین“ پر ختم ہوئی ہے۔ پہلی جلد کے آخری صفحے کا نمبر ۴۰۰ ہے۔ دوسری جلد مسلسل صفحات نمبر کے مطابق صفحہ ۴۰۱ سے شروع ہوئی اور ۹۳ صفحات تک پہنچی۔ اس حساب سے دوسری جلد ۳۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

لسان القرآن کی دوسری جلد ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔

جلد سوم حرفِ ذ سے شروع کی گئی ہے۔ مولانا یہ کام نہایت تیزی اور مستعدی سے کر رہے تھے کہ بیمار پڑ گئے۔ مسودہ تقریباً سو صفحات تک پہنچا ہے۔ اب کم و بیش ایک سال سے مولانا بیمار ہیں اور کام رک گیا ہے۔ وہ اس اہم کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بے تاب ہیں۔ لیکن بیماری کے ہاتھوں بے بس ہیں، ایک لفظ بھی لکھنے کی ہمت نہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحتِ عاجلہ و کاملہ سے نوازے اور وہ اس عظیم کام کو جس کا آغاز انھوں نے انتہائی شوق و ذوق سے کیا تھا، مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

## مطالعہ حدیث

مستشرقین اور استشرق زدہ حضرات نے ایک مدت سے حدیث و سنت کے بارے میں اس ہرزہ سرائی کو ”علمی و تحقیقی“ سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد شروع کر رکھی ہے کہ اس کی تدوین و تسوید کا سلسلہ محض تاریخی عوامل کی بنا پر معرضِ ظہور میں آیا۔ ہمارے ہاں کے کچھ لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے مستشرقین کے اس اندازِ فکر کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کی کوشش کی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ”مطالعہ حدیث“ میں اس کا مثبت اسلوب میں جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ حدیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اشاعت و فروغ اور حفظ و صیانت کا سلسلہ عہدِ نبوی سے لے کر صحاح ستہ کی تدوین تک ایک خاص نوع کا تسلسل لیے ہوئے ہے، جس میں شک و ریب کی

کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی - علاوہ ازیں مولانا نے اس کتاب میں حدیث کے علوم و معارف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور دلائل سے واضح کیا ہے کہ یہ مکمل سائنس ہے جس میں رجال و روایات کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی تشریح کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور ان اصولوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے، جن سے محدثین نے متنِ حدیث کی صحت و استواری کا تعین کیا ہے -

یہ بہت اہم سوالات ہیں کہ اسلام کے احکام و فرامین میں حدیث و سنت کا کیا درجہ ہے ؟

اس نے کب اور کس طرح تدوین و ترتیب کے محنت طلب مرحلے طے کیے ؟  
 کن مؤثر اور معتبر ترین علمی ذرائع سے ہم تک پہنچی ؟  
 یہ اپنے آغوش میں تحقیق و تفسیر کے کن معیاروں کو سمیٹے ہوئے ہے ؟  
 مولانا نے ان تمام سوالات کا جو بعض ذہنوں میں خلجان پیدا کرتے ہیں، ”مطالعہ حدیث“ میں تحقیقی جواب دیا ہے -

مطالعہ حدیث پندرہ عنوانات پر مشتمل ہے جو حسبِ ذیل ہیں :

- ۱- قرآنِ حکیم اور اطاعتِ رسول -
- ۲- سنتِ کن حقائق سے تعبیر ہے ؟
- ۳- سنتِ عمدہ نبوی میں -
- ۴- آنحضرت کا اسلوبِ دعوت و ارشاد -
- ۵- صحابہ اور تابعین کے دور میں علمِ حدیث کی اشاعت کا جذبہ -
- ۶- صحابہ اور تابعین کے زمانے میں اشاعتِ حدیث کے اسباب و عوامل -
- ۷- روایت کی دو قسمیں -
- ۸- تدوینِ حدیث -

۹- حدیث کے بارے میں فنِ جرح و تعدیل -

۱۰- فتنہ و ضلعِ حدیث اور محدثین کی مساعیِ جمیلہ -



۱۱۔ اصطلاحاتِ حدیث -

۱۲۔ علومِ حدیث -

۱۳۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ -

۱۴۔ امام زہریؒ -

۱۵۔ کتبِ حدیث اور ان کے مؤلفین -

مولانا کو حدیث و سنت سے قلبی شغف و محبت ہے اور منکرین و معترضین حدیث سے انتہائی نفرت - ! یہی جذبہ صادقہ اور داعیہ حق اس کتاب کی تصنیف کا باعث بنا -

مطالعہ حدیث ۲۱۵ صفحات پر محنتی ہے - مقدمہ اور فہرستِ مضامین کے بارہ صفحے اس کے علاوہ ہیں -

پہلی دفعہ یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں طبع ہوئی -

## اساسیاتِ اسلام

مولانا محمد حنیف ندوی کی تصنیفات میں ”اساسیاتِ اسلام“ اس بنا پر نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مولانا نے تعبیر و استدلال کی ایک بالکل نئی اور خوش آئند روایت کی طرح ڈالی ہے - اس دور کا بنیادی سوال یہ ہے کہ موجودہ تحریکات اور رائج الوقت فلسفوں کے مقابلے میں اسلام کا موقف کیا ہے ؟ اور ان حالات میں اسلامی احکام کو کس نہج سے لوگوں کے قلب و روح میں اُتارا جاسکتا ہے ؟

اس سوال کے جواب میں عام طور پر دو اسلوب اختیار کیے جاتے ہیں - ایک معذرت خواہانہ اسلوب، جس میں فقط یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام علم و دانش کی مروجہ تحریکات کا ہرگز مخالف نہیں - دوسرا اسلوب یہ ہے کہ مخالفانہ نظریات کو پورے زور سے ہدفِ تنقید ٹھہرایا جاتا ہے اور ان کے نقائص کی نشان دہی کی جاتی ہے - اس کے بعد یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے کہ یہ نظریات چونکہ غلط ہیں، لہذا اسلام کا تصورِ حیات صحیح ہے -

تعبیر و تشریح کے یہ دونوں اسلوب قرینِ صحت نہیں اور ان سے جدید تعلیم یافتہ لوگ قطعاً متاثر نہیں ہوتے، کیوں کہ اس سے یہ حقیقت واضح نہیں ہو پاتی کہ اسلام جو دنیا کا آخری اور فلاح انسانی کا ضامن مذہب ہے، فرد اور معاشرے کے تمام روحانی اور تہذیبی و ثقافتی مسائل کا سائنسی اور علمی زبان میں، متعین و مثبت اور چچا تھلا حل پیش کرتا ہے۔ جواب کی ان دونوں نہجوں سے اسلام کی روحِ اجتہاد کا فعال اور تخلیقی کردار بھی فکر و نظر کے زاویوں میں نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ معذرت خواہان اندازہ لوگوں پر کوئی اثر ڈال سکتا ہے اور نہ منفی اندازہ۔

مولانا حنیف ندوی نے ”اساسیاتِ اسلام“ میں جواب کی ان دونوں صورتوں سے ہٹ کر بات کی ہے اور اس اسلوب سے اسلامی احکام کو پیش کیا ہے کہ جس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں ہمارے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور روحانی مسائل کا حل بہ طریقِ احسن موجود ہے۔ اگر اس کے تمام پہلوؤں پر صدقِ دل سے غور کیا جائے اور ان کو محورِ عمل بنایا جائے تو پتا چلے گا کہ یہاں ہر شے موجود ہے۔ کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے جو یہ ہیں:

- باب ۱ - اساسیاتِ اسلام -
- باب ۲ - کیا اساسی نہیں ہے -
- باب ۳ - تعمیرِ فرد -
- باب ۴ - نظریہ توحید اور اس کی اساس -
- باب ۵ - نماز اور اس کے اثرات -
- باب ۶ - اسلام کا تصویرِ ثقافت -
- باب ۷ - اسلام اور اس کی سیاسی قدریں -
- باب ۸ - اقتصادیات میں اسلام کا موقف -
- باب ۹ - اسلام کا نظریہ اخلاق -

سہراب کے تحت ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن کی تعداد ۱۹۴ ہے۔ مقدمہ اور فہرستِ مضامین سمیت کتاب ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اساسیاتِ اسلام پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

### مسئلہ اجتہاد

مولانا محمد حنیف ندوی نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں آنے کے بعد سب سے پہلی کتاب ”مسئلہ اجتہاد“ تصنیف کی تھی۔ اس زمانے میں مولانا گو جرنالہ میں قیام پذیر تھے اور روزانہ وہاں سے لاہور آتے تھے۔ اس موضوع پر ان کی یہ نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام ایک مکمل اور ابدی ضابطہٴ حیات ہے۔ اسلام جہاں اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ توحید کیا ہے، دلوں میں ایمان کے داعیے کس طرح پیدا ہوتے ہیں، تقویٰ کیسے ابھرتا ہے اور کردار و سیرت کی تشکیل کے کیا ذرائع ہیں، وہاں اس میں اس بات کا بھی پورا اہتمام پایا جاتا ہے کہ بدلتے ہوئے اجتماعی اور معاشرتی حالات میں احکام و مسائل کی کیا شکل ہو۔ یعنی وہ کون سے اصول اور پیمانے ہیں جن پر قیاس اور اجتہاد کا قصرِ فیج تعمیر ہوتا ہے۔ کتاب میں ان فقہی بنیادوں اور پیمانوں کی بھی تشریح کی گئی ہے، جن کی روشنی میں فقہِ جدید کی تدوین و ترتیب کا مسئلہ آسانی سے ذہن و فکر کی گرفت میں آ جاتا ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ چھوٹے بڑے ۸۵ عنوانات پر مشتمل ہے اور ۸۴ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

### مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد اول)

علامہ ابوالحسن اشعری چوتھی صدی ہجری کی جلیل القدر شخصیت تھے جو ۲۶۰ھ کو بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ ہجری کے لگ بھگ بغداد میں جنت کو سدھارے۔ وہ مسلسل چالیس برس تک اعتزال و جہمیت کی فتنہ سامانیوں کا شکار رہے۔ اس کے بعد ان کے فکر و تعمق نے ایسی انگڑائی لی کہ اعتزال و جہمیت کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور اجتہاد و کلام کا اپنا ایک علیحدہ اور منفرد دبستان سجایا۔ انھوں نے سو

سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں جو اپنے مضامین و محتویات کے اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

ان کی تصنیفات میں سے ایک مشہور ترین کتاب ”مقالات الاسلامیین“ ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ان کا وہ علمی شاہ کار ہے جسے افکار و نظریات کے دائرۃ المعارف سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس میں انھوں نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل یعنی اپنی زندگی تک ابھرنے والے وہ تمام عقائد و افکار بغیر کسی تعصب اور ذہنی تحفظ کے بیان کر دیے ہیں جو طویل عرصے تک مسلمانوں کے فکری مناظروں اور کلامی مجادلوں کا محور بنے رہے۔

کتاب کے مطالعہ سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمان نفسیات، اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کو منظر عام پر لائے ہیں، وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو قائم اور برقرار رکھا۔ آج آفتاب اسلام پوری طرح تابندہ و درخشندہ ہے اور تمام دنیا اس سے کسبِ ضیا کر رہی ہے اور وہ تمام گمراہیاں اور ضلالتیں جو کئی سو سال پیشتر اسلامی احکام کو ختم یا مجروح کرنے کے درپے تھیں، دنیا سے نابود ہو گئی ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ”مسلمانوں کے عقائد و افکار“ کے نام سے اس عربی کتاب کو اردو کا خلعت پہنا دیا ہے۔ زبان نہایت عمدہ ہے، جلد اول پر ۳۸ صفحات کا مقدمہ ہے۔ فہرستِ عنوانات، مقدمہ اور اشاریہ سمیت یہ جلد ۳۸۰ صفحات کو گھیرے ہوئے ہے۔ جلد اول ۱۹۶۸ کو معرضِ اشاعت میں آئی۔ کل عنوانات ۲۵ ہیں۔

مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد دوم)

یہ ”مقالات الاسلامیین“ کی جلد دوم کا اردو ترجمہ ہے اور اس پر فاضل مترجم نے ۳۰ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ سرورق کے دو صفحے اور فہرستِ مضامین

کے بائیس صفحات شامل کر کے کتاب ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد کے کل عنوانات ۳۰۶ ہیں اور سنِ طباعت ۱۹۷۰ء ہے۔

### سرگزشتِ غزالی

امام غزالی طوس کے ایک گاؤں میں ۴۵۰ھ کو پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ کو وفات پائی۔ ان کی تصنیفات میں ”المنقذ من الضلالی“ کو اہل علم میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ غزالی کی دلچسپ اور دلآویز سرگزشت ہے جو انھوں نے خود اپنے قلم سے رقم کی۔ اس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ان کے فکر و ذہن میں کیوں تبدیلی پیدا ہوئی اور ان کے افکار کس طرح انقلاب و تغیر کی خوش خرام موجوں سے روشناس ہوئے۔ وہ جبہ و عبا اور مسند و دستار کی نہایت شان دار زندگی بسر کر رہے تھے اور تعلیم و تعلم کے ہنگاموں میں مشغول تھے کہ ان کے فہم و فراست نے اس اسلوب سے پلٹا کھایا کہ جبہ و عبا اتار پھینکے اور دنیا سے بے زار ہو کر بادیہ پیمائی شروع کر دی۔ فقر و درویشی کی روش اختیار کر لی اور فلسفہ و حکمت کے میدانوں سے نکل کر کتاب و سنت کی روح پروردادی میں سکونت پذیر ہو گئے کہ اطمینانِ قلب اور سامانِ سکینت اسی میں ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ ذہنی و فکری انقلاب کیوں بپا ہوا؟ کتاب میں اس سوال کا مفصل جواب دیا گیا ہے جو دل کی گہرائیوں میں اُترتا اور روح و ضمیر میں پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔

غزالی نے المنقذ من الضلالی میں اپنے وقت کی تمام مروجہ مذہبی و فکری تحریکات کا کھل کر جائزہ لیا ہے اور اذعان و یقین کی ان بنیادوں کی نشان دہی کی ہے جو کتاب و سنت سے ہم آہنگ اور مسلکِ سلف سے ہم دوش ہیں۔ کتاب میں نفسیات، فلسفہ، منطق، تنقید، تمام چیزیں انتہائی اعتدال و توازن کے ساتھ موجود ہیں اور قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں تصویری نبوت کو نہایت معقول، بے حد سلجھے ہوئے اور بہ درجہ غایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ غزالی کے دور میں تعلیم اور قرامطہ (جنھیں باطنیہ بھی کہا جاتا ہے) کا فتنہ زوروں

پر تھا اور انہی کے عقائد و تصورات کی خطرناکیوں سے اثر پذیر ہو کر انہوں نے یہ کتاب سپردِ قلم کی۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ کون تھے؟ ان کے عقائد و افکار کیا تھے؟ ان میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور فکر و فلسفہ میں انہوں نے کیا اضافہ کیا؟

مولانا محمد حنیف ندوی نے ”المنقذ من الضلال“ کا ”سرگزشتِ غزالی“ کے نام سے ترجمہ کیا ہے اور اس پر ۸۹ صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں اس دور کی فکری تفصیلات اور غزالی کے قدیم رجحانات کو اجاگر کیا ہے، نیز ان میں تبدیلی کے وجوہ و اسباب اور ان کے فلسفہ و حکمت کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ مع فرستِ مضامین اور مقدمے کے کتاب ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اُردو ترجمہ اتنا جان دار اور دلکش ہے کہ اگر غزالی زندہ ہوتے اور اس ترجمے کا مطالعہ کرتے تو زیادہ نہیں تو اسے اپنی عربی کتاب کے برابر ضروری جگہ دیتے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں چھپی تھی۔

### افکارِ غزالی

امام غزالی سے مولانا محمد حنیف ندوی کو خاص تعلق خاطر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں انہوں نے تین کتابیں لکھیں، ایک افکارِ غزالی، دوسری تعلیماتِ غزالی اور تیسری سرگزشتِ غزالی۔ تعلیماتِ غزالی، ”احیاء علوم الدین“ کے بعض ابواب کی تلخیص ہے، سرگزشتِ غزالی ”المنقذ من الضلال“ کا ترجمہ ہے اور افکارِ غزالی میں ”احیاء علوم الدین“ کے مضامین و مشمولات کا خلاصہ اور اختصار بیان کر دیا گیا ہے۔ ان تینوں کتابوں پر علیحدہ علیحدہ مبسوط مقدمات تحریر کیے گئے ہیں جو اپنی جگہ مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ افکارِ غزالی کا مقدمہ ۱۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرگزشتِ غزالی کا مقدمہ ۸۹ صفحات پر ممتوی ہے اور تعلیماتِ غزالی کا مقدمہ ۱۰۳ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح ہر مقدمہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کتبِ ثلاثہ میں باعتبار ترتیب تصنیف کے پہلا نمبر افکارِ غزالی کا، دوسرا سرگزشتِ غزالی کا اور تیسرا تعلیماتِ غزالی کا ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ”افکارِ غزالی“، احیاء علوم الدین کے بعض اہم مضامین کا خلاصہ ہے۔ اس کے بڑے بڑے عنوان یہ ہیں: فضائلِ علم، قلب کی موت، حصولِ علم کے فضائل، تعلیم، علم کے محاذِ شواہد عقلیہ کی روشنی میں، وہ علوم جن کا سیکھنا فرضِ کفایہ ہے، علمِ المکاشفہ اور علمِ المعاملہ، مشاغباتِ علمِ الکلام، ائمہ فقہ کا زہد و وزر، مضمر علوم، وہ الفاظ و مصطلحات جن کے معنوں میں تغیر و تبدل ہوا ہے، بحث و جدل سے لوگوں کی دلچسپی کے اسباب و وجوہ اور اس کے شرائط، بحث و مناظرہ سے کیا کیا نفسی برائیاں پیدا ہوتی ہیں، استاد اور شاگرد کے آداب، ارشاد و تعلیم کی ذمہ داریاں، عقل اور اس کی قسمیں، مدارکِ عقل میں تفاوت، عقائد کی تفصیل، عقائد کی تلقین میں تدریج کا لحاظ، ظاہر و باطن کی تقسیم، ظاہر و باطن میں فرق کی نوعیت، ایمانیات میں پہلا رکن توحید، دوسرا رکن اللہ کی صفات، تیسرا رکن اللہ کے افعال کا علم، چوتھا رکن سمعیات، ایمان اور اسلام کے اطلاقات، کیا ایمان میں کمی بیشی ممکن ہے؟ ایمانیات میں استثنائے استعمال — ان موٹے موٹے عنوانات میں بہت سے ضمنی عنوانات ہیں۔

احیاء علوم الدین کے ان ابواب میں امام غزالیؒ نے عقائدِ اسلامی کا پورا تجربہ کیا ہے، تہذیب و اخلاق کے تمام گوشوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ایمان کی گتھیوں کو سلجھایا ہے، عبادات کی روح متعین کی ہے اور ان کی تہ میں جو فلسفہ کار فرما ہے، اس کی نشان دہی کی ہے، معاملات کی وضاحت فرمائی ہے۔ غرض بحیثیتِ مجموعی بنِ اسلام کی ایسی دلائل و تشریح کی ہے کہ جس سے الحاد و زندقہ کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور احکامِ دین میں جو روشنی پنہاں ہے، وہ پوری آب و تاب کے ساتھ قلب و نظر میں سما جاتی ہے۔

مولانا ندوی کی اپنی زبان اور اپنا انداز ہے جو انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے غزالی کے ان مضامین کو صفحہ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔

مقدمہ کتاب میں، جو ۱۱۳ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا نے امام غزالی کے حالات و سوانح پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ان کے خیالات و افکار کی اہمیت بیان کی ہے اور

علمی دنیا میں ان کے مقام و مرتبہ کی وضاحت کی ہے۔  
فہرست مضامین کے سولہ صفحات سمیت کتاب ۵۱۴ صفحات پر محیط ہے۔ پہلی  
مرتبہ ۱۹۵۶ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

### تعلیماتِ غزالی

امام غزالی کی مشہور تصنیف ”احیاء علوم الدین“ حلقہٴ اہل علم اور اصحابِ تصوف  
میں ہمیشہ متداول رہی ہے۔ غزالی نے اس کتاب میں ارکانِ دین، احکامِ اسلام، زوہرِ  
تصوف اور فرامینِ الہی کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں کیا اسرار  
پنہاں ہیں اور کس رکنِ دین کی بجا آوری میں کیا فلسفہ و حکمت کار فرما ہے۔  
مولانا محمد حنیف ندوی نے غزالی کی اس معرکہٴ الآرا کتاب کے گیارہ ابواب کی  
تلخیص کی ہے اور وہ ابواب یہ ہیں:

- ۱۔ ابوابِ صلوٰۃ۔
- ۲۔ ابوابِ زکوٰۃ۔
- ۳۔ حدیثِ صوم۔
- ۴۔ اسرارِ حج۔
- ۵۔ ذکر و دعا۔
- ۶۔ تہذیب و آداب۔
- ۷۔ نکاح و معاشرت۔
- ۸۔ محبت و اخوت۔
- ۹۔ معاملات۔
- ۱۰۔ فہمِ قرآن۔
- ۱۱۔ تفسیرِ بالرائے۔

احیاء علوم الدین کے یہ انتہائی اہم اور بنیادی ابواب ہیں۔ مولانا نے نہایت  
شگفتہ زبان میں اُن کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور اس کو ”تعلیماتِ غزالی“



کے دلکش نام سے مرتب کیا ہے۔

کتاب پر ۱۰۳ صفحات کا مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں تصوف کے رموز و نکات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مقدمے میں بتایا گیا ہے کہ تصوف جو ذوق و وجدان کا قیمتی سرمایہ ہے، تزکیۂ باطن اور تعمیرِ سیرت کے اعتبار سے کن اہمیتوں کا حامل ہے اور ارتقا کے کن کن مراحل سے دوچار ہوا ہے۔ اس کے مشائخ کون کون ہیں اور اس کی اصطلاحات کیا ہیں۔ نیز اس سے وارداتِ قلب کی کن کیفیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اپنے مندرجات و مشمولات کے اعتبار سے تعلیماتِ غزالی، ”نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس کے گیارہ ابواب میں جو اوپر درج کیے گئے ہیں، بہت سے ضمنی عنوانات بھی ہیں۔

تعلیماتِ غزالی کا پہلا ایڈیشن جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا، ۵۶۰ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فہرستِ مضامین کے سات صفحے اس کے علاوہ ہیں۔

تہافت الفلاسفہ (تلخیص و تفہیم)

غزالی اور ابن رشد دونوں نے حکمت و فلسفہ کے امام و مجتہد کی حیثیت سے شہرت پائی۔ غزالی کی تصنیفات میں سے ایک مشہور کتاب ”تہافت الفلاسفہ“ ہے اور ابن رشد کی قابلِ قدر فلسفیانہ تصنیفات میں سے ایک بہت معروف تصنیف تہافت التہافہ ہے جو انھوں نے غزالی کی تہافت الفلاسفہ کے جواب میں لکھی۔ یہ دونوں کتابیں اسلامی عقائد و افکار کے سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں یونانی فلسفے اور انسانی فکر و کاوش کی کمزوری اور واماندگی کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسانی فکر اور عقیدے کی اپنی منطق اور فہم و استدلال کا اپنا اسلوب ہے، جس کو صرف اسی کی روشنی میں سمجھنا ممکن ہے۔

ابن رشد نے اس کے جواب میں تہافت التہافہ لکھی، جس میں یونانی فلسفے کی رو سے غزالی کے اعتراضات کا خالص فلسفیانہ زبان میں جواب دیا — اپنے موضوع کے اعتبار سے دونوں کتابیں اصحابِ فلسفہ کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور نہایت

دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے غزالی کے شاہ کار ”تہافت الفلاسفہ“ کی نہایت شگفتہ اور رواں دواں اردو میں تلخیص و تفسیم کی ہے۔ علاوہ ازیں اس پر ایک طویل اور شاندار مقدمہ لکھا ہے، جس میں غزالی اور ابن رشد کے افکار و خیالات پر چچاٹا محاکمہ کیا ہے۔ اس محاکمے میں مولانا نے علامہ طوسی اور خواجہ زادہ کے تاریخی محاکموں سے بھی استفادہ کیا ہے اور موجودہ فلسفے کے رجحانات کو بھی پیشِ نگاہ رکھا ہے، اور پھر اپنی آرا کا بھی خاص انداز سے اظہار کیا ہے۔

اسلامی فلسفے کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے والے حضرات کے لیے مولانا کی یہ کوشش نہایت قیمتی دستاویز ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یونانی فلسفے نے اسلامی علمِ کلام کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی فکر و نظر کی سطح پر ابھرتی ہے کہ مسلمان حکما و متکلمین نے یونانی افکار و تصورات کے کن کن گوشوں میں مجتہدانہ اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں فکر و نظر کی ان نئی جہتوں کی بھی نشان دہی ہوتی ہے، جن کی روشنی میں جدید علمِ کلام کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔

مولانا نے اس کتاب میں بیس فلسفیانہ مباحث و مسائل کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں:

- ۱۔ قدمِ عالم کا ابطال۔
- ۲۔ ابدیتِ عالم کا ابطال۔
- ۳۔ اللہ تعالیٰ کو اس عالم کا صانع اور فاعل قرار دینے کے معاملے میں حکما کی ابلہ فری۔
- ۴۔ وجودِ صانع کے بارے میں حکما کی بے چارگی۔
- ۵۔ کجیاتِ توحید کے بارے میں حکما کی ناکامی۔
- ۶۔ کیا مسئلہ ذات و صفات کی دوئی کثرت کا سبب ہے؟
- ۷۔ کثرت و تعدد کا دوسرا سبب۔
- ۸۔ کثرت و تعدد کا تیسرا سبب۔
- ۹۔ کثرت و تعدد کا چوتھا سبب۔

- ۱۰۔ حکما اثباتِ صانع سے قاصر ہیں۔
  - ۱۱۔ حکمایہ بات نہیں ثابت کر سکتے کہ مبداءِ اول تمام کائنات کے بارے میں ادراکِ کلی رکھتا ہے۔
  - ۱۲۔ حکما مبداءِ اول سے متعلق اس حقیقت کا اثبات بھی نہیں کر سکتے کہ اس کو ادراکِ ذات حاصل ہے۔
  - ۱۳۔ اس بات کی تردید کہ اللہ تعالیٰ جزئیاتِ زمانی سے آگاہ نہیں۔
  - ۱۴۔ حکما اپنے اس دعوے کو ثابت نہیں کر سکتے کہ آسمان ایک حیوان ہے جو اپنی حرکتِ دوریہ سے اللہ کے حکم کی اطاعت میں مصروف ہے۔
  - ۱۵۔ حکما نے حرکتِ افلاک کے جس محرک و غایت کی نشان دہی کی ہے، وہ باطل ہے۔
  - ۱۶۔ یہ بات غلط ہے کہ نفوسِ سماوی تمام جزئیات کو جانتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ لوحِ محفوظ سے مراد نفوسِ سماویہ ہیں۔
  - ۱۷۔ اسباب و مسببات میں رشتہ و تعلق کی نوعیت۔
  - ۱۸۔ انسانی و حیوانی قوی کی تفصیل۔
  - ۱۹۔ حکما کا یہ دعویٰ کہ نفوسِ انسانی سرمدیت کے حامل ہیں۔
  - ۲۰۔ حکما کی رُوسے نفس و روح کا انجام۔
- یہ کل بیس فلسفیانہ مسئلے ہیں۔ ان میں سے ہر مسئلے کے الگ الگ ضمنی اور ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔
- کتاب ۲۱۹ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۸۸ صفحات کا مقدمہ شامل ہے۔ فہرستِ مضامین کے چھ صفحے اس کے علاوہ ہیں۔ اس طرح کل ۲۲۵ صفحے بنتے ہیں۔
- مولانا ندوی کی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۴ء میں چھپی۔
- عقلیات ابنِ تیمیہ**
- مولانا کو متقدمین میں سے جن حضرات سے قلبی لگاؤ ہے، ان میں ایک امام ابنِ تیمیہ

ہیں جو علم و کمال اور عمل و سیرت کے اعتبار سے ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا ان کی تصنیفات، افکار و نظریات اور عقائد و تصورات سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کے منطق و فلسفہ کی علمی فراوانیوں کا بھی ان پر انتہائی اثر ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے امام کے حالات و سوانح سے زیادہ تعرض نہیں کیا کہ اس ضمن میں تین چار کتابیں معرضِ اشاعت میں آچکی ہیں۔ مولانا نے اپنی طبعِ مشکل پسند کے مطابق صرف امام کی منطق و عقلیات اور فلسفہ و حکمت کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے کہ اس پر اردو میں (یا غالباً کسی زبان میں بھی) کوئی کام نہیں ہو سکا۔ کوئی شک نہیں کہ امام ابن تیمیہ سے متعلق اس موضوع پر مولانا کا یہ اولین کارنامہ ہے۔

امام ابن تیمیہ اپنے دور کے بہت بڑے مفسر، جلیل القدر محدث، فقہ و اصول کے امام اور منطق و فلسفہ میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو حوران میں پیدا ہوئے اور ۲۸۔ ذی قعدہ ۷۲۸ھ کو وفات پائی۔ ان کا نام احمد، لقب تقی الدین اور کنیت ابو العباس تھی۔ ان کے حالات و سوانح میں عربی اور اردو وغیرہ زبانوں میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

امام ابن تیمیہ کی جامعیت تحقیق و ادراک کے دائرے نہایت وسیع بلکہ ہمہ گیر ہیں۔ امام غزالی کے بعد یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام کے نظامِ حیات کا انتہائی وقتِ نظر سے جائزہ لیا اور بتایا کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور اصول کی تشریح و تبیین میں کن امور کو پیشِ نگاہ رکھنا ضروری ہے اور یہ کہ علمِ کلام یا عقائد میں وہ کون کون سے موڑ ہیں، جہاں مسلمانوں کے فکر و بصیرت کے قافلوں نے یونانی تہذیب و ثقافت کی پرانی اور پٹی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اپنے لیے جداگانہ اور منفرد راستہ اختیار کیا۔

امام ابن تیمیہ وہ مردِ مجاہد ہیں جن کی حیاتِ مستعار کا ایک ایک لمحہ الحاد و زندقہ کے خلاف جہاد میں بسر ہوا۔ انھوں نے جس کامیابی اور حسنِ تدبیر سے کتاب و سنت کے مسخِ زہیا کو نکھارا، بدعات کی پُر زور تردید کی اور اسلام کے چہرہ روشن سے یونہی

اور عجیت کے درمیز نقابوں کو ہٹایا، یہ انہی کا حصہ ہے۔  
وہ جامعیتِ علم و فضل اور وسعتِ فکر و نظر کی بنا پر اپنے عہد کے عظیم مجدد اور بہت بڑے مصلح تھے۔ ان کے گونا گوں کارناموں میں ایک بہت بڑا کا نام یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی ”عقلیات“ کو کمالِ ثر و نفاہ سے کھنگالا اور تنقید و احتساب کی کسوٹی پر پرکھا اور ثابت کیا کہ اس کے مقابلے میں اسلام کا عقلی موقف کمزور نہیں بلکہ زیادہ صحیح، کمزور نہیں بلکہ زیادہ استوار اور متوازن ہے۔ مولانا ندوی نے ”عقلیاتِ ابن تیمیہ“ میں اسی کی وضاحت کی ہے۔

یہ کتاب آٹھ فصلوں پر محتوی ہے اور ہر فصل میں الگ الگ ضمنی عنوانات قائم کیے گئے ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۱۳۸ ہے۔ فہرستِ مضامین اور مقدمے سمیت یہ کتاب ۳۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں امام ابن تیمیہ کی منطق و عقلیات سے متعلق یہ اولین کتاب ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۶ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے اہتمام میں شائع ہوئی۔

### افکارِ ابنِ خلدون

بہ اعتبارِ ترتیب کے مولانا کی یہ دوسری کتاب ہے جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی۔

ابنِ خلدون عمرانیات و اجتماعیات کے ماہر اور تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے عظیم المثل عالم تھے۔ ان کی ”تاریخِ ابنِ خلدون“ نے جو شہرت حاصل کی، اس سے کہیں زیادہ ”مقدمہ ابنِ خلدون“ نے تداول و قبولیت کی منزلیں طے کیں۔

ابنِ خلدون ماہِ رمضان ۷۳۲ھ کو تونس میں پیدا ہوئے اور ۸۰۸ھ کو وفات پائی۔ انھوں نے بھرپور زندگی گزاری، بہت سی اونچی شخصیتوں سے تعلقات استوار کیے، بعض ملوک و سلاطین سے روابط بڑھائے، کئی ملکوں کی سیاسیات میں دخل ہوئے اور ان میں عجیب و غریب کردار ادا کیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ”افکارِ ابنِ خلدون“ میں مقدمہ ابنِ خلدون کے

بعض اہم حصوں کو خلعتِ اُردو سے مفتخر کیا ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ تاریخ کیا ہے؟

۲۔ انسان مدنی الطبع ہے۔

۳۔ موسم و ہوا کا اثر اخلاق و اطوار پر۔

۴۔ غذا کی فراوانی و عمدگی اور روایت و کمی کا اخلاق پر اثر۔

۵۔ نبوت کے علائم و خصوصیات۔

۶۔ حقیقتِ نبوت۔

۷۔ دیہاتی اور شہری کی تقسیم معاشی و ثقافتی ہے۔

۸۔ اہلِ بادیہ کی اقلیت۔

۹۔ سادہ زندگی میں خیر کے پہلو زیادہ قوی ہیں۔

۱۰۔ انسان اپنے حالات کا نتیجہ ہے۔

۱۱۔ احکام کی جبریہ پیروی سے نفسِ انسانی ذلیل ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ عصبیت کی اخلاقی اہمیت۔

۱۳۔ تہذیب و ثقافت کا اثر شجاعت و بسالت پر۔

۱۴۔ تقلیدِ اقوام اور ان کا فلسفہ۔

۱۵۔ عرب۔

۱۶۔ عربوں میں اصلاح کا ایک ہی انداز تھا۔

۱۷۔ دین سے سیاسی قوت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

۱۸۔ توسیعِ مملکت کی طبعی حد۔

۱۹۔ اشخاص کی طرح سلطنت و ریاست کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔

۲۰۔ گزشتہ قومیں جسمانی قوتوں کے اعتبار سے ہم سے زیادہ مختلف نہیں تھیں۔

۲۱۔ بادشاہ، اس کی تعریف اور ضروری اوصاف۔

۲۲۔ حکومت کی تین صورتیں — ملوکیت، سیاستِ عقلی اور خلافت۔

- ۲۳۔ خلافت کے شرائطِ انعقاد -
- ۲۴۔ خلافت، ملکیت کی طرف کیوں بوٹی؟ -
- ۲۵۔ عہدِ صحابہ کی لڑائیاں اور ان کا دینی موقف -
- ۲۶۔ عہدِ خلافت کے بڑے بڑے دینی عہدے -
- ۲۷۔ احتساب کے حدودِ اسلامی حکومت میں -
- ۲۸۔ خلافت کے مختلف القاب کیوں کر پیدا ہوئے؟ -
- ۲۹۔ محصولات کی کثرتِ عمرانی کو شششوں پر اثر انداز ہوتی ہے -
- ۳۰۔ ظلم سے عمرانی تنگ و دو میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے -
- ۳۱۔ رزق کی حقیقت -
- ۳۲۔ علوم و فنون کی تحصیل انسان کا فطری تقاضا ہے -
- ۳۳۔ تعلیم کا فطری طریق -
- ۳۴۔ تعلیمی سختی سے بچوں میں اخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں -
- ۳۵۔ ایک ہی فن میں شروح و حواشی کی کثرتِ علم کے لیے سخت مضر ہے -
- ۳۶۔ اختصارِ فنون کا عیب -
- ۳۷۔ تفسیر اور اس کی قسمیں -
- ۳۸۔ علومِ حدیث -
- ۳۹۔ ائمہ فقہ -
- ۴۰۔ فقہ و قیاس کی شرعی بنیادیں -
- ۴۱۔ علمِ کلام -
- ۴۲۔ تصوف -

یہ موٹے موٹے بیالیس عنوانات ہیں جو مولانا ندوی نے ترجمے کے لیے مقدمہ ابنِ خلدون سے منتخب کیے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا معیارِ اخذ و انتخاب کتنا اونچا، کس قدر صحیح اور اپنے اندر کس درجے استحکام اور استواری لیے ہوئے

ہے۔ ان عنوانات میں بہت سے ضمنی عنوانات بھی ہیں۔

زبان اتنی صاف، شگفتہ اور سلیس ہے کہ قاری کو کہیں شبہ نہیں پڑتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ افکار ابن خلدون پر اکثر صفحات کا مبسوط مقدمہ ہے، جس میں ابن خلدون کے حالات و سوانح، ان کے افکار و نظریات، اور ان کی اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا۔ ہے کہ عمرانیات و اجتماعیات میں ان کا مرتبہ کتنا بلند تھا، مختلف ملکوں کی سیاسیات میں انہوں نے کیا کردار ادا کیا، تاریخ کے تسلسل کو کس قدر آگے بڑھایا اور اس میں کن نئی قدروں کا اضافہ کیا۔

غرض مولانا نے ابن خلدون کی سرگزشتِ حیات کے تمام پہلوؤں کو مقدمہ کتاب میں اجاگر کیا اور ان کے خیالات و تصورات کے ہر گوشے کا کھل کر تجزیہ کیا ہے اور یہ کام دہی شخص کر سکتا ہے، جس کے خود اپنی نظر و بسر کے زاویے وسعت پذیر ہوں اور اس کے علم و مطالعہ کا دامن ہر سو پھیلا ہوا ہو۔ بھگواند مولانا محمد حنیف ندوی ان اوصاف سے پوری طرح متصف ہیں اور اس نوع کی خدمتِ علمی بہ طریقِ احسن سرانجام دینے کا کامل استحقاق رکھتے ہیں۔

”افکار ابن خلدون“ پہلی دفعہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ فہرستِ مضامین اور

مقدمے سمیت یہ کتاب ۲۳۲ صفحات پر مکتوی ہے۔

### مکتوبِ مدنی

الہیات کے سلسلے میں یہ بحث خاص طور سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور کائنات میں ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس ضمن میں ابن عربی نے ”وحدت وجود“ کا نظریہ پیش کیا ہے، جس کا دو لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ بحر وجود دراصل ایک ہے اور تمام کائنات اسی بحر بیکراں کی موجیں ہیں۔

مجدد الف ثانی نے اس کے مقابلے میں ”نظریہ شہود“ کی وضاحت کی ہے، جس میں دو وجود ہیں۔ ایک مادی دنیا کا اور دوسرا حقیقتِ وراہ اور اکا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان دونوں نظریوں کے درمیان تطبیق دینے



کی کوشش کی ہے۔ شاہ صاحب سے اس دور کے مشہور عالم اسماعیل بن عبداللہ اندزی ندوی مدنی نے اس سلسلے میں سوال کیا تو انھوں نے بذریعہ مکتوب اس کا تفصیلی جواب دیا جو کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مکتوب عربی زبان میں ہے اور ”مکتوب مدنی“ کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا حنیف ندوی نے شاہ صاحب کی اس اہم علمی کاوش کا شگفتہ اور سلیس اردو ترجمہ کر دیا ہے۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔

”مکتوب مدنی“ ۳۶ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ اسے ۱۹۶۵ء میں ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع کیا گیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی کی یہ پندرہ کتابیں ہیں، جن کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ کتابیں چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ تمام کتابیں ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ کے اہتمام میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ادارۃ کے لیے (۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۶ء تک) مولانا کی پینتیس سالہ خدمات کا یہ عظیم القدر نتیجہ ہے۔ ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ کے دو ماہانہ رسالوں — ثقافت اور المعارف — میں ان کے بہت سے مطبوعہ مضامین اور لسان القرآن کی تیسری جلد کے ایک سو غیر مطبوعہ صفحات اس کے علاوہ ہیں۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ادارۃ ثقافتِ اسلامیہ سے السلاک کے بعد مولانا تین مرتبہ شدید بیماری سے دوچار ہوئے۔

پہلی مرتبہ ۶۱-۱۹۶۲ء میں ان پر تبخیر کا حملہ ہوا، جس کی وجہ سے اس کیلئے چھ ماہ صاحبِ فراش رہے اور کوئی کام نہیں کر پائے۔

دوسری مرتبہ ۷۶-۱۹۷۷ء میں بیمار ہوئے اور سات آٹھ مہینے بیمار رہے۔ اس اثنا میں بھی کوئی تحریری کام نہیں ہو سکا۔

اب تقریباً ایک سال سے پھر بیمار ہیں۔ نہ لکھنے پڑھنے کی ہمت باقی رہی ہے اور

بچنے پھرنے کی سکت۔! ایلوپتھی، ہومیوپتھی اور یونانی ہر قسم کے علاج کرائے اور لاہور کے مشہور معالجوں کے زیرِ علاج رہے، لیکن کوئی افادہ نہ ہوا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو مولانا علاج کے لیے لندن گئے۔ ان کی صاحبِ زادی وردہ ضیا وہاں مقیم ہیں۔ لندن جا کر پہلے مٹانے کے سپیشلسٹ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا۔ اس لیے کہ لاہور کے ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق انھیں مٹانے کی تکلیف تھی۔ لیکن لندن کے ڈاکٹر نے تمام ٹیسٹ مکمل کرنے کے بعد بتایا کہ مٹانے کی تکلیف نہیں ہے، معدے کی تکلیف ہے۔ اب اس کی ہدایت کے مطابق معدے اور آنتوں کے ماہر سے رجوع کیا گیا تو پتا چلا کہ جو آنت معدے کو غذا پہنچاتی ہے وہ سکڑ گئی ہے۔ جب وہ کھلتی ہے تو افادہ ہو جاتا ہے اور جب بند ہو جاتی ہے تو تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ لہذا اس آنت کا علاج ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ڈاکٹر نے دواؤں لکھ دی ہیں اور خوراک وغیرہ کے سلسلے میں ہدایات دے دی ہیں اور مولانا ۷ جنوری ۱۹۸۷ء کو لاہور واپس آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق علاج ہو رہا ہے۔

مولانا ندوی نے ۱۹۷۹ء میں ”لسان القرآن“ کے کام کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر اکہتر برس کی تھی۔ آغازِ کار ہی میں مجھ سے کہا کہ یہ اہم کام عمر کے آخری حصے میں شروع کر رہا ہوں اور قلب و ضمیر کی شدید طلب سے مجبور ہو کر رہا ہوں۔ دعا کرو، اللہ تعالیٰ میری یہ دلی تمنا قبول فرمائے اور یہ اہم کام بخیر و خوبی اختتام پذیر ہو۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق بے تکلفی سے عرض کیا کہ شیر شاہ سوری ستر سال کی عمر میں ہندوستان کا بادشاہ بنا تھا، جب کہ اس کی زندگی کا سایہ ڈھل چکا تھا۔ وہ آئینہ دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ ”مجھے اس وقت حکومت ملی، جب میری زندگی کی شام ہو چکی ہے۔“ اس کا دورِ حکومت صرف پانچ سال پر مشتمل ہے، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے بے پناہ کام کیا اور ہندوستان میں ایک بالکل نئے طریقِ حکومت اور انوکھے اسلوبِ حکمرانی کی طرح ڈالی، جسے برصغیر کی تاریخِ سیاست میں ایک اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا، گھبراہٹ نہیں، اللہ تعالیٰ آپ سے بھی ان شاء اللہ مزید بہترین کام لے گا۔

مُعاہدے اللہ تعالیٰ مولانا حنیف ندوی کو شفاءِ کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے اولسان القرآن

کے اہم کام کو مکمل کرنے کی توفیق سے نوازے جو انہوں نے اپنے قلب و ضمیر کی شدید  
 خواہش کے تحت شروع کیا ہے اور جس کی تمنائے تکمیل کا جذبہ ان کے دل گہرائیوں میں  
 بدرجہ غایت شدت سے مچل رہا ہے۔ آمین یا ارحم الراحمین۔ واشف انت الشافی  
 لا شفاء الا شفاءؕ شفاء لا یغادر سقمًا اذہب الباس  
 رب الناس۔

# تفسیر سراج البیان

محمد سعید الرحمن علوی

مولانا محمد سعید الرحمن علوی ہمارے سراپا اخلاص دوست ہیں - ۳۰ جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے جب مولانا محمد حنیف ندوی کے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا گیا تو مقالہ نگاروں کی فہرست میں علوی صاحب کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ مولانا کی تفسیر سراج البیان پر مضمون لکھنا نہایت ضروری تھا۔ یہ موضوع علوی صاحب کے ذمے لگایا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع سے عمدہ براہونا بہت مشکل تھا اور کوئی دوسرا شخص یہ خدمت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ علوی صاحب نے (جیسا کہ آئندہ سطور سے پتا چلتا ہے) مضمون کی تکمیل کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی اور نہایت محنت سے یہ مضمون سپرد قلم فرمایا۔ اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین۔

(مرتب)

۱۴۰۴ھ کے رمضان المبارک کی کوئی تاریخ تھی کہ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ گیا، یہ جانا میرے معمول کا حصہ تھا کیونکہ میں جن اداروں اور شخصیات سے ربط و ضبط رکھتا ہوں، ان سے ملاقات کی غرض سے گاہ بگاہ جانا میری زندگی کا معمول ہے۔ اس ادارے میں مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا محمد اسحاق بھٹی دو ایسے محترم بزرگ ہیں جن سے میری سالہا سال سے یاد اللہ ہے، ان سے علمی استفادہ اور رسمی و غیر رسمی ملاقات مجھے ہینے میں ایک آدھ تہ نہ رہا ہر لے آتی ہے۔ ان کے علاوہ باقی انتظامی عملہ اور دوسرے حضرات بھی

محبت سے پیش آتے ہیں اور مجھے بھی ان سے ایک گونہ اُنس ہے۔

ادارے کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر صاحب سے بھی متعدد وجوہ سے میرا تعلق ہے اور ان سے طافاتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ میں نے وہاں یہ مژدہ جانفرا سنا کہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے سینئر ترین رکن اور متعدد کتبِ علمیہ کے مصنف مولانا محمد حنیف ندوی کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ میرے لیے یہ خبر نہایت خوش کن تھی۔ ابوسعید بزمی مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق اپنے تجزیاتی مضامین میں یہ شکوہ کیا تھا کہ ہماری قوم بدقسمتی سے مردہ پرست واقع ہوئی ہے، زندوں کی اس کیے یہاں کوئی قدر نہیں — حالات کو دیکھ کر اس کا احساس مجھے بھی تھا، اس لیے ایک زندہ وسلاست علمی شخصیت کے لیے اس قسم کی تقریب بہت بڑی خوشی کا باعث تھی۔

پڑوسی ملک ہندوستان میں اس قسم کے واقعات رونما ہو چکے ہیں جن میں سے دو تقریبوں کی تحریری رپورٹ مطبوعہ شکل میں میرے سامنے موجود ہے، یعنی ہندوستان کے مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے اعزاز میں ہونے والی تقریب جو ”نذرِ ذاکر“ کے نام سے شائع ہوئی اور آزاد سابھتہ اکیڈمی کے سربراہ مالک رام صاحب کے سلسلے کی تقریب جو ”ارمغانِ مالک“ کے نام سے طبع ہوئی اور میرے مرحوم بزرگ پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی نے مجھے عنایت فرمائی۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے اربابِ حل و عقد کا اس قسم کی تقریب کا اہتمام یقیناً ایک حوصلہ افزا کام تھا اور اس ملک میں ایک عالمِ دین سے متعلق یہ اپنی نوع کی پہلی تقریب ہے جس پر یہ حضرات بجا طور پر مستحقِ تبریک ہیں۔ مولانا ندوی کے بارے میں تقریب کی روح پرور غبر سنانے کے ساتھ ہی یہ بات سامنے آئی کہ جن حضرات گرامی کو اس سلسلے میں مقالات کی زحمت دی جا رہی ہے اس میں میرا نام بھی شامل ہے۔ یہ بات ادارے کی طرف سے بطور کائناتگی میرے محترم دوست محمد اسحاق بھٹی صاحب نے فرمائی، جس سے میں سخت حیران ہوا۔ میرے سامنے اگرچہ اپنی کم علمی کے تمام ابواب وا تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اربابِ ادارہ نے ایسا کیوں سوچا؟ لیکن نصرتِ خداوندی کی

امید پر ہیں نے ہاں“ کہ لی — بھٹی صاحب نے کہا کہ مولانا کی وہ چیزیں جو ادارے سے انسلاک سے قبل اشاعت پذیر ہو چکی ہیں ان پر کام ہونا چاہیے — ساتھ ہی انھوں نے فرمایا کہ ملک سراج الدین ایڈیٹرز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور کی طرف سے ایک زمانے میں مولانا کی تفسیر قرآن شائع ہوئی تھی — تفسیر قرآن کا لفظ سن کر مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، اپنے گھریلو ماحول کے اعتبار سے قرآن عزیز سے مجھے خاص لگاؤ ہے، اس کی مختلف تفاسیر کو دیکھنا اور ان سے استفادہ کرنا میرا خاص ذوق ہے — لسان القرآن کے نام سے مولانا کی جو کتاب ابھی تھوڑا عرصہ قبل ادارے کی طرف سے چھپی ہے اس نے مجھے بے حد متاثر کیا — میں نے ہفت روزہ ”غلام الدین“ لاہور کی اشاعت مجریہ ۱۶ اپریل ۱۹۸۴ء میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

”مولانا چونکہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ عصر نبوت کے استحضار، زبان عربی پر کامل عبور اور قرآن سے بدرجہ غایت محبت کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں، اس لیے وہ دل و دماغ کی تمام وسعتوں کے ساتھ اس میدان میں اترے ہیں۔ انھوں نے حضور ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم کی سیرت کو کھنگالا اور پوری طرح زبان عربی پر عبور حاصل کیا اور بلاآخر قرآن سے اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دیا کہ بس اب اسی کے ہو کر رہ گئے — وہ اس بات کو قطعاً تسلیم نہیں کرتے کہ ایک شخص چند تراجم کو سامنے رکھ کر یا مستشرقین کی تصریحات پڑھ کر فاضل قرآن ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن سے پہلے غیر قرآنی خم خاؤں کو کیسے مٹادیں اور اس کلام الہی کے اتھاہ سمندریں اس طرح غوطہ زنی کریں کہ آپ کی روح میں وہ پرچ بس جائے — تب قرآن اپنے خزانے آپ پر وا کرے گا۔“

یہ گفتگو لسان القرآن کے مقدمے کی ایک طرح کی تلخیص تھی جس میں مولانا کا پورا ذوق قرآن آگیا ہے۔ اس لیے جب میں نے یہ سنا کہ مولانا کی تفسیر قرآن چھپی تھی تو دل میں یہ خیال چکیاں لینے لگا کہ لسان القرآن کے ۵۰ سالہ باہمت بوڑھے کے دورِ جوانی کی تفسیر ضرور دیکھنا چاہیے۔

میں نے مولانا ندوی سے استفسار کیا کہ تفسیر آپ کے پاس تو ہوگی؟ مولانا نے جواب

دیا ”نہیں۔“ یہ ”نہیں“ مجھ پر قیامت بن کر گری۔ اتنی محنت کرنے والے کے پاس بھی اپنا شاہکار نہیں تو پھر وہ کہاں ملے گی۔؟ بھٹی صاحب سے معلوم کیا تو ان کا جواب بھی ”نہیں“ تھا۔ بعض اہم شخصیات کے معاملے میں پوچھا جن سے توقع تھی تو ہر ایک کے متعلق ایک ہی جواب تھا کہ ان کے پاس نہیں ہے۔

اب میں نے پنجاب پبلک لائبریری کا رخ کیا کہ شاید ”بیت القرآن“ کے ذخیرے میں موجود ہو، مگر وہاں بھی نہ تھی۔ لاہور میوزیم کی لائبریری گیا، لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ وہاں سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری گیا تو ایک کتاب دیکھی۔ کشمیری بازار جو کبھی لاہور میں علمی خزانوں کا واحد مرکز تھا، اس کی روایات کے مطابق، کتاب کا رنگ و روغن تھا۔ بے تابی سے کتاب کھولی تو وہ فقط پارہ ۱۹ سے آخر تک تھی، گویا آخری بارہ پارے۔ نمبر صفحات مسلسل تھے از ۸۶۵ تا ۱۴۴۸، ٹائٹل وغیرہ کچھ نہ تھا۔ لائبریری کی سلیپ پر ”قرآن حکیم مع تفسیر سراج البیان“ اور مولانا کا نام درج تھا۔

نمبر ح ۸۲ ت ۱۶ ، ۲۹۷ — ۷۴۵۸

چند صفحات پڑھے، دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی کہ کچھ تو ہاتھ آیا۔ باہر نکلا تو سوچا کہ دیال سنگھ لائبریری دیکھتا چلوں، لیکن وہاں بھی مایوسی ہوئی۔ قائد اعظم لائبریری گیا وہاں بھی تفسیر نہ ملی۔ دارالسلام لائبریری دیکھی، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگلے دن جب مولانا ندوی اور بھٹی صاحب سے تمام واقعہ بیان کیا تو وہ ایک جزو کے طے پر بے حد مسرور ہوئے۔ پوری تفسیر کے لیے گوجرانوالہ کے گرامی قدر علما مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالواحد علیہما الرحمہ کی لائبریریوں سے پتا کیا گیا تو وہاں بھی جواب نفی میں تھا۔ ایک سہو ہم سے یہ ہوا کہ ہم نے اپنے طور پر کسی غلط فہمی کی بنا پر یہ طے کر لیا کہ ملک سراج الدین کی فرم ختم ہو چکی ہے، حالانکہ وہ قائم ہے۔

تیسرے دن بھائی دروانے کے قریب ملک جلال الدین وقف ہسپتال کی دکان میں ملک سراج الدین کا بوڑھا نظر آیا، بے تابی سے اُدھر بڑھا تو وہاں سے جواب ملا کہ کشمیری بازار نہیں، صحیح بات وہاں سے معلوم ہوگی۔ کشمیری بازار گیا تو سنہری مسجد سے چند قدم اگے



دائیں ہاتھ ایک بڑا سا بورڈ نظر آیا — ملک سراج الدین — آگے بڑھ کر دکان پر پہنچا، معاملہ ایک صاحب کے گوش گزار کیا تو انھوں نے کہا کہ ایسی تفسیر چھی تو تھی لیکن میرے بڑے بھائی صاحب ہی صحیح بتائیں گے۔ اب شام ہو رہی ہے، وہ نہیں ملیں گے، آپ کل آئیں۔ پھر گیا اور مقصد بیان کیا تو وہ نہایت احترام سے پیش آئے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے بعض اجزا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے، یہ ہے ”سراج البیان“ جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ اب ختم ہو گئی ہے، اسے ہم پھر چھاپ رہے ہیں، انشاء اللہ جلد ہی چھپ جائے گی — میں نے عرض کیا مجھے اس پر مضمون لکھنا ہے، پرانے ایڈیشن کا کوئی نسخہ فراہم ہو سکے تو نوازش ہوگی۔ جواب نفی میں تھا۔ المیتہ پارہ ۱۳ سے ۱۸ تک کے اجزا ایک سے زائد تھے۔ وہ ایک جز مجھے بھی منگوادیا کہ آپ استفادہ کر لیں، باقی اجزا بالکل نہیں ہیں۔ مکمل صرف ایک نسخہ ہے، جس کے ہم فوٹو لے رہے ہیں، یہ صاحب ملک عبدالرؤف تھے، ملک سراج الدین کے بڑے فرزند۔

ملک سراج الدین ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں ملک سراج الدین اینڈ سنز کے نام سے کشمیری بازار میں دکان کھولی۔ تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں شائع کیں۔ ۸ مارچ ۱۹۸۴ء کو اس دنیا نے فانی سے رخصت ہوئے۔

تفسیر کے سلسلے میں مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ شیخ محمد اشرف مرحوم (تاجر کتب) نے یہ تفسیر لکھوانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ انہی کے تقاضے سے مولانا نے کام شروع کیا، ابتدائی پندرہ پارے ڈیڑھ سال کے عرصے میں مکمل ہوئے — شیخ صاحب نے مبلغ تین سو روپے مولانا کی نذر کیے — مجھے یہ سن کر خیال آیا کہ پچھلے دور میں ایک لفظ ”استحصال“ کا بہت پرچا ہوا — میرے خیال میں اصل استحصال صرف ”اہل علم“ کا ہوا ہے — اس کی بے شمار مثالیں میرے سامنے ہیں، ذکر کا فائدہ نہیں — یہ بات اپنی جگہ مُسَلَّم ہے کہ ”علم فروش“ اور ”اہل علم“ میں بڑا فرق ہے۔ علم فروش تو ہر سطر اور لفظ کے دام کھڑے کرتے ہیں، لیکن اہل علم کا معاملہ الگ ہوتا ہے — بہر حال پندرہ پاروں کی تکمیل کے بعد ملک سراج الدین صاحب نے شیخ صاحب سے تقاضا کر کے یہ تفسیر خود لے لی اور باقی پندرہ پاروں

کی تکمیل کے لیے مولانا کو سری نگر کے قریب ایک صحت افزا مقام پر بھیج دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مبلغ ایک سو روپے مولانا کے سفر خرچ کے لیے ملک صاحب نے مرحمت فرمائے، صرف پچیس دن وہاں قیام رہا۔ لاہور سے مولانا کے بچے کی وفات کی اطلاع پہنچی تو مولانا دلپس آ گئے۔ لیکن پچیس دن میں پندرہ پارے مکمل ہو چکے تھے۔ سبحان اللہ و محمد۔

مولانا ندوی اور ملک عبدالرؤف تفسیر کے سالی تکمیل کا صحیح طور سے تعین نہ کر سکے بلکہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ ۱۹۳۴ اور ۱۹۴۰ کے درمیان کا واقعہ ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ ۱۹۳۳ یا ۱۹۳۴ کی بات ہے۔ ابتدا میں اس کے کم سے کم ۴۵ ایڈیشن ۱۲ x ۱۱ کے سائز پر مرد و جہ طریق سے چھپے۔ تین قرآنی کے نیچے دو ترجمے تھے۔ ایک حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا اور دوسرا حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کا۔ دہلی کے مشہور عالم مولانا اخلاق حسین قاسمی نے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ایک عظیم الشان کتاب ”محاسن موضع قرآن“ لکھی ہے، جس میں شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے کمالات پر گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب ”ذو النورین رضی اللہ تعالیٰ، اکادمی، بھیرہ ضلع سرگودھا“ سے شائع ہو چکی ہے۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ لفظی ہے اور اب تک لوگ اس سے خوب استفادہ کر رہے ہیں۔

تفسیر ”سراج البیان“ کے ان ۴۵ ایڈیشنوں میں مولانا ندوی کے تفسیری نوٹس حاشیے پر تھے۔ اس کے بعد اسے تفسیری انداز میں شائع کیا گیا۔ ۱۰ x ۷ کا سائز ہے، کل صفحات ۶۰۰ ہیں، ۶، ۶ پارے کی ایک جلد ہے۔ گویا کل پانچ جلدیں ہیں، صفحات کے نمبر مسلسل ہیں اور پہلی جلد کے بعد کسی جلد کی ابتدا میں ٹائٹل نہیں ہے۔ اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ میں نے ملک عبدالرؤف کے پاس ۱۹۶۶ اپریل کا ایڈیشن دیکھا، منشی سید احمد نوشنویس لاہور کی کتابت ہے، بہت خوب صورت اور صاف۔ ہر صفحے کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ اوپر کے حصے میں آٹھ سائے متن اور ترجمہ ہے۔ لیکن اب کے ترجمے کا اور انداز ہے، یعنی ترجمے دو کے بجائے ایک ہے، لیکن وہ ترجمہ شاہ عبدالقادر یا شاہ رفیع الدین کا نہیں، بلکہ ان دونوں بزرگوں کے ترجمے سے مستفاد سلیس ترجمہ ہے۔ یہ خدمت انجام دینے والے بزرگ ہیں، کانگڑہ کے جناب حکیم محمد یاسین مرحوم و مغفور نیچے کے کالم میں مولانا ندوی

کے تفسیری نوٹس ہیں اور آخر میں حل لغات — ٹائٹل پر ”از علامہ محمد حنیف ندوی“ لکھا ہے۔ آج کے دور میں جب کہ لفظ ”علامہ“ ”و بال جمل و نادانی“ بن چکا ہے، مجھے یہ لفظ نہ بچا۔ لفظ ”علامہ“ کا ایک پس منظر اور پیش منظر ہے، لیکن اس دور کے خصوصی حالات میں بعض الفاظ کی طرح لفظ ”علامہ“ بھی رسوا ہوا اور بہت بُری طرح — شاید ہمارے محترم شاعر اکبر الہ آبادی نے اسی لیے کہا تھا،

مشرقی و مغربی علم حاصل کر مگر بن کے علامہ و بال جمل و نادانی بن  
ان تفسیری نوٹس کے سلسلے میں مولانا ندوی نے جن مجموعہ ہائے تفسیر و حدیث سے مدد لی ہے ان کے نام ٹائٹل پر مرقوم ہیں۔ ان میں قدیم و جدید تفاسیر بھی ہیں اور حدیث کے مستند مجموعے بھی — مولانا نے آیات قرآنی سے جو مجموعی مطلب اخذ کیا ہے اسے نہایت خوب صورتی سے جامع الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ کتب حوالہ یہ ہیں: تفسیر خازن، روح المعانی، کبیر رازی، ابن جریر، درمنثور، ابن کثیر، مدارک، مسند حاکم، بزار، اسباب الغرول سیوطی، حقانی، خلاصۃ التفاسیر، موضع قرآن، حسینی، بیان القرآن اور صحاح ستہ سمیت متعدد کتب حدیث۔

تفسیر کے ساتھ منشی عبدالرحمن صاحب طاروق کا قیمتی مقدمہ قرآن پاک کی افادیت اور اس کے علمی مباحث پر ہے اور اردو تراجم پر ایک مضمون مولوی شرف علی صاحب کا مقدمے کے ساتھ ملحق ہے — جو خصوصیات ان نوٹس کی درج ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں — اور یہ نوٹ فرمائیں کہ یہ خصوصیات واقعہ موجود ہیں، محض یہ نہیں کہ انھیں زیب قرطاس بنا دیا گیا ہو اور ایسا عام ہوتا ہے، لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ ہر صفحے پر یہ خصوصیات جلوہ گر ہیں۔ ۱۔ ہر صفحے کے اہم مضامین کی تبویب اس طرح ہے کہ متعلقہ آیت کا مرکزی موضوع سرخی سے متعین کر دیا گیا ہے۔

۲۔ انداز غایت درجہ محققانہ ہے — اور یہ بات ہر اس شخص پر واضح ہے جو ہمارے مولانا کے انداز نگارش سے واقف ہے، کمزور اور بوری بات ان کے قریب پھکتی ہی نہیں۔

۳۔ عصری علوم و معارف سے جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس کا احساس ہر قاری کو ہو گا۔

۴۔ تصوف و کلام کے معارفِ تفسیری کا مولانا نے خوب استیعاب کیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ تصوف کے لطائف اور اس کے حکم و اسرار کے بغیر فقہی پابندیاں ایک بوجھ بن جاتی ہیں جس طرح کہ تصوف فقہ و تشریع کے بغیر الحاد بن جاتا ہے۔ تو گویا تصوف فرائض و ارکانِ اسلام کی باطنی روح ہے۔ ہمارے مولانا اسلام کی اس لازوال خوبی سے خوب واقف ہیں اور انھوں نے اپنی معرکہ الہامی کتاب ”تعلیماتِ غزالی“ اسی انداز سے لکھی ہے کہ اپنے مدوح امام غزالی کی وہ خصوصیت سامنے آ سکے کہ انھوں نے فقہ کی تفصیلات کو تصوف کے رنگ میں کس طرح بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے شائع کی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے جو ۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اسلامی احکام کے اسرار و حکم کی عجیب داستان ہے جس کے مقدمے میں مولانا نے تصوف اور اس کی تفصیلات پر مفصل گفتگو کی ہے۔

آج کے بوڑھے مولانا ندوی عنقوانِ شباب میں بھی قلبی واردات سے شناسا تھے اور انھوں نے کلامِ الہی (جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے) کی آیات میں یہ کھوج لگایا ہے۔ گویا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی جیسے صوفی فنش بزرگ کی تفسیر بیان القرآن میں مسائل سلوک کی بحث کی طرح مولانا ندوی کی تفسیر میں بھی یہ حصہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ حدیث جبریل علیہ السلام کی احسانی کیفیات بھی مولانا نے خوب واضح کی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بار لوگ انھیں ”صوفی“ نہ مانیں۔ رہا کلام کا مسئلہ تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اسلامی نظامِ حیات کا یہ اہم شعبہ ہے۔ اس شعبے میں مولانا کی کمال درجہ و سترس کا اندازہ ”مقالات الاسلامیین“ کی ترجمانی و تفہیم سے ہوتا ہے جو متکلم اسلام علامہ ابو الحسن اشعری کی کتاب ہے اور جسے مولانا نے اس طرح اردو کے قالب میں ڈھالا ہے کہ وہ ان کی مستقل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے نوٹ کے مطابق ”ابو الحسن اشعری وہ بزرگ تھے جو چالیس برس مسلسل اعتزال و جہمیت کی سازشوں اور فتنہ سامانیوں کا شکار رہے لیکن بعد میں اپنے لیے فکرِ تقویٰ

اور اجتہاد و کلام کا ایک علیحدہ دبستان سمجایا — اس دبستانِ علمی کی داستان یہ کتاب ہے۔ مولانا نے اسے ”مسلمانوں کے عقائد و افکار“ کے عنوان سے نیا رنگ دیا، لیکن اس معاملے میں بھی ان کی نگاہ بنیادی طور پر وہی ہے جس کا قرآن حکم دیتا ہے اور اس کی جھلک ان کی تفسیر میں نظر آتی ہے۔

۵۔ ادبی و لغوی نکات و کلمات کا تذکرہ آپ کو مولانا کی اس تفسیر میں جا بجا ملے گا۔ حل لغات اس کا مستقل حصہ ہے اور گویا قرآن کے اعجاز کا منہ بولتا ثبوت —! کسے معلوم نہیں کہ اہل عرب زبان و بیان کے زعم میں باقی ساری دنیا کو غبی کہتے تھے — قرآن نے جہاں ان کے عقائدِ باطلہ، اعمالِ فاسدہ اور اخلاقِ رذیلہ پر زہر چلایا اور گمراہی و ضلالت کی اتھار وادی میں گھرے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑا اور اس ماحول سے انھیں نکالا، وہاں زبان و ادب کے اعتبار سے جو نقش اس نے قائم کیا اس کا اندازہ ان تفسیری روایات سے ہو سکتا ہے جن کے مطابق صنایع و کفار قریش رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے کلامِ الہی سنتے اور ”ما هذا الا کلام البشر“ کی حقیقت ان کی زبان پر طاری ہوئی۔ مولانا کا اعلان ہے کہ

”اس کا مطالعہ کرنے والا محسوس کرے گا کہ قرآن دنیائے ادب میں سب سے عمدہ اضافہ ہے۔“

۶۔ زندگی کی گاڑی رواں دواں ہے — نت نئے مسائل ابھرتے ہیں اور نئی تعبیرات — ہمارا دعویٰ ہے کہ ان سب کا حل قرآن میں ہے، لیکن اس دعوے کو دلائل سے مبرہن کرنا ہر کسی کا کام نہیں، یہ سعادت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو قسم ازل کی فیاضیوں سے ایک خاص انداز سے بہرہ ور ہوتے ہیں — مولانا پر ان کے رب کا خاص کرم ہے کہ انھوں نے تفسیر کے اوراق میں جدید مسائل کی وضاحت کی، لیکن اس طرح کہ مذہب و مسلکِ اسلاف کا تفوق و برتری برابر قائم ہے — اسلاف کی فہرست میں سب سے پہلا نام حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم کا ہے جو چشمہٴ نبوت سے براہِ راست فیض یافتہ تھے، جنھوں نے اپنے قلبی شکوک و شبہات کے کانٹے سرکارِ دو عالم کی مجلسِ پاک میں بیٹھ کر نکالے، جنھوں نے جبریل و محمد علیہما السلام کی زبان سے کلامِ الہی سنا ہی نہیں، اس کی تعبیرات، تشریحات اور

توضیحات کا درس اس محمد عربیؐ سے لیا جسے اللہ تعالیٰ نے ”بیان“ کی ذمہ داری سونپی تھی، لیکن اس طرح کہ پہلے جبریلؑ خود بیان کرتے، پھر اسے آپؐ دہراتے۔

ان حضرات کی صداقت شعاری اور علومِ تربیت کی خود اللہ تعالیٰ نے شہادت دی، اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے شہادت دی — ان کے قلوب کو تقویٰ و ایمان کے لیے منتخب کر کے ہر قسم کے عصیان سے محفوظ کر دیا گیا۔ انھوں نے قرآن پڑھا، سیکھا اور پھیلایا، پھر نسلاً بعد نسل یہ امانت منتقل ہوئی — اس امانت پر اعتماد مسلمان کا سرمایہ ہے اور اس سے انحراف ضلالت و غواہیت — اس شاہراہ سے انحراف کر کے جو کاوش ہوگی اسے تفسیر نہیں تحریف کہا جائے گا۔ مولانا ندوی نے ان تمام امور کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور تفسیر کے ہر مقام پر یہ حقیقت نمایاں ہے کہ مفسر کے نہاں خانہٴ دماغ میں یہ جذبہ شدت سے کافر فراہم ہے کہ ہر بات منشاء ربانی سے ہم آہنگ ہو — بعض لوگوں نے اپنے سیاسی افکار اور مزعومات کے لیے اس کتاب مقدس کو نشانہ بنایا۔ گروہی عصبیتوں نے ایسے لوگوں کو بھی ”مفسرین“ کی صف میں لا بٹھایا، جنھوں نے قرآن کی من مانی تفسیر کی — مولانا ندوی کا کوئی گروہ ہے نہ لجنہ، پارٹی ہے نہ حزب۔ وہ اوّل آخر فقط مسلمان ہیں، حزب اللہ کے فرد، جماعت حقہ اور طائفہ مقدسہ کی ایک کڑی۔ ان کی تفسیر کے تیرہ چودہ ایڈیشن چھپے اور نکل گئے تو یہ اسی کا کرم ہے جس کی کتاب مقدس کی انھوں نے خدمت کی۔

بر عظیم پاکستان و ہندوستان میں دوسری زبانوں میں تراجم قرآن کی باقاعدہ تحریک حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی سے شروع ہوتی ہے اور اردو ترجمے کے معاملے میں ان کے فرزندان گرامی شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ سرفہرست ہیں۔ شاہ عبدالقادر کا تفسیری کارنامہ بھی ہے — مولانا محمد قاسم نانوتوی کا مقولہ بڑا مشہور ہے کہ قرآن کا نزول اردو میں مقدر ہوتا تو شاہ عبدالقادر کا اسلوب ہوتا —

حواشی کے معاملے میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام بڑا روشن ہے — ان کے استاذ، استاذ الہند، شیخ العالم مولانا محمود حسن دیوبندی کے حواشی ابتدائی سورتوں کے بعد لکھے گئے تو سہ روزہ مدینہ بخجور کے مالک و ایڈیٹر مولانا محمد مجید حسن نے ان کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا، اس کے

لیے قرعہ فال مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام پڑا۔ مولانا نے نمونے کے طور پر لکھا تو محمد مجید حسن نے اسے تفسیر کہہ کر اختصار کی درخواست کی۔ علامہ عثمانی نے مصدقہ روایت کے مطابق ۲،۲ صفحے کا مضمون چند چند سطروں میں سمیٹا۔ یہ تفسیری حواشی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کی قبولیت کا اندازہ کرنا مشکل ہے، بارہا یہ چھپے اور مسلسل چھپ رہے ہیں، ہر ذی شعور اور سنجیدہ شخص ان سے استفادہ کرتا ہے۔ ان کا ترجمہ حکومتِ افغانستان نے فارسی میں کرا کے چھاپا، اس کے متعدد ایڈیشن مختلف سازوں میں طبع ہوئے۔ اپنے مزاج و افتاد کے باعث مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی خدمت ایک شاندار کارنامہ ہے، ادھر ادھر سے ہٹ کر نفسِ قرآن کی تفہیم مولانا آزاد کا طرہ امتیاز ہے۔ مولانا عبد السلام نیازی کہتے ہیں کہ:

”ابوالکلام جبریل امین کی زبان بولتے ہیں“

المیہ یہ ہے کہ ابوالکلام کی بار بار حیل اور نظر بندیوں نے اس کا مسودہ تین بار ضائع کرایا اور اشاعت کی نوبت آئی تو ابتدا میں معاملہ سورہ مومنوں کے آخر تک تھا۔ سورہ نور کا مسودہ بعد میں ملا جو آزاد ساہتیہ اکادمی دہلی کے ایڈیشن میں مالک رام صاحب نے شامل کر دیا اور اب پاکستان میں بھی چھپ گیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب نے بتایا کہ ایبٹ آباد کے مشہور بزرگ ڈاکٹر شبیر بہادر خاں پنی کے نام ہندوستان سے مولانا محمد شعیب عمری کا گرامی نامہ آیا ہے جس میں یہ مژدہ جانفراس ہے کہ مولانا کے مسودات مع مکمل مسودہ و تفسیر کا سراغ مل گیا ہے، اللہ کرے کہ ایسا ہو اور جلد سے جلد یہ شاہکار چھپ کر سامنے آجائے۔ پاکستان میں باقیات ترجمان القرآن اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں کئی کوششیں ہوئیں لیکن وہ بات کہاں؟ محمد اسحاق بھٹی صاحب راوی ہیں کہ مشہور بزرگ ملک حسن علی صاحب جامعی (شرق پور) نے میرے ذریعے مولانا ندوی کو پیغام بھجوایا کہ ابوالکلام خلد اشبانی کے ادھر سے کام کی تکمیل کا استحقاق صرف مولانا محمد حنیف ندوی کو ہے اور یہ کہ میری طرف سے انھیں عرض کریں کہ وہ یہ اہم کام کر دیں۔ نامناسب نہ ہو گا کہ خدامِ قرآن اور بلا نشانِ محبت کے ایک بڑے قافلے کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا ندوی سے اس کام کی تکمیل کی درخواست کی جائے۔

ایمان داری کی بات یہ ہے کہ آپ مولانا ندوی کی تفسیر دیکھیں تو آپ کو مولانا آزاد کا عکسِ جمیل

نظر آئے گا، ملک عبدالرؤف صاحب کی عنایت سے جو جز مجھے ملا اس کے چند مقامات سے نمونے کے طور پر بعض سطور شامل مقالہ کر رہا ہوں تاکہ مولانا کی قرآنی خدمت کا کچھ عکس قارئین کرام کے سامنے آسکے۔ اللہ کرے کہ ملک عبدالرؤف صاحب پروگرام کے مطابق یہ تفسیر جلد چھاپ دیں۔ سب سے پہلے سورہ نور کی آیت ۳۵ اللہ نور السموات والارض ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا نے اس پر عنوان قائم کیا — ”اللہ نور ہے“ — اور پھر لکھا ہے۔

اللہ نور السموات والارض مثل نور کمشکوۃ فیہا مصباح

”ان آیات میں اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمینوں کے نور کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور

بتایا گیا ہے کہ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں یہ چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے، اور قندیل ایسی صاف اور چمک دار ہے، گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔ اس میں برابر یکساں روشنی ہے، نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ نیل اس طرح کا مصفا کہ بغیر آگ جلنے کے تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تیز روشنی ہوگی، واضح ہوگی، دُور تک پہنچنے والی اور پاکیزہ ہوگی۔ پس اپنے نور سے جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھلاتا ہے، کیونکہ اللہ کی ذات ہر قسم کی تشبیہ سے پاک ہے، لَیْسَ کَمِثْلِ شَیْءٍ۔ چنانچہ آیت کے اختتام پر ارشاد ہے:

يَهْدِي اللَّهُ لِنُورٍ مِّنْ نَّشَاطٍ۔ یعنی اس کا پیغام بہت روشن ہے، منور ہے، تابناک ہے اور گمراہیوں اور ظلمتوں کی تاریکیوں کو دور کرنے والا ہے۔ جس کو چاہتا ہے اس نور سے کسبِ صوف کا موقع دیتا ہے۔ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ اور اللہ تعالیٰ ان تشبیہات کو مثالوں کے طور پر بیان کرتا ہے تاکہ اہل علم اکتسابِ معرفت کر سکیں، اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ہو سکتا ہے نور سے مراد یہ ہو کہ اللہ اپنی کائنات کے لیے مبر ہے، باعثِ رونق ہے، روشنی ہے۔

جیر کرتا ہے۔ وَأَنْتَ لَهَا نُورٌ وَغَيْثٌ وَعِصْمَةٌ۔

تیسرا امکان یہ ہے کہ جس طرح نور اور روشنی سے تمام اشیا متجلی ہو جاتی ہیں اور سب کچھ نظر آنے لگتا ہے، اسی طرح اللہ زمین و آسمان کے لیے بمنزلہ نور کے ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو نہ



تسلیم کیا جائے تو پھر کائنات کا نظام درہم و برہم ہو جاتا ہے اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے اور انسان علل و معلولات کے غیر متناہی سلسلے میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ۷

بحث میں علت و معلول کی ہر عقل علیٰ

اور اگر اس پر ایمان رکھا جائے اور اس کی ذات کو خالق اور رب مان لیا جائے تو کائنات کی تمام گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور کسی گوشے میں تاریکی نہیں رہتی۔

وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ مَنَاوَرٌ مِّنْ قُرْآنٍ حَكِيمٍ نَّے ایک ایسی حقیقت کو بیان کیا ہے جس

کا اظہار آج چودہ سو سال بعد ہوا ہے۔

غور فرمائیے، عربی لٹریچر میں چراغ کے لیے کوئی لفظ موجود نہیں، چنانچہ ”مصباح“ خاص عربی لاشقاق کی رو سے صیغ نہیں، یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ سراج فارسی سے عرب کیا گیا ہے، یہ اس لیے کہ عربوں کا تمدن بہت سادہ تھا اور وہ کھلے میدانوں اور خیموں میں رہتے تھے اور روشنی کے لیے وہ آگ کو کافی سمجھتے تھے، مگر قرآن ایک ایسی تیز اور صاف روشنی کا تحویل پیش کر رہا ہے جو شیشے میں ہے اور سب طرف برابر نور پھینک رہی ہے۔ نہ شرقی ہے، نہ غربی۔ جس میں ایسا ل ہے جو بغیر آگ دکھائے کے جلتا ہے۔ غور کیجیے کیا یہ بجلی اور قمقے کا اولین تصور نہیں؟ اور اگر یہ صیغ ہے تو پھر یہ علم اور بالغ نظری کیا کسی انسانی کلام میں ہو سکتی ہے؟

یہ آیت کریمہ قرآن عزیز کی مشکل ترین آیات میں شمار ہوتی ہے، لیکن مولانا نے اسے جس طرح خوب صورت انداز میں حل کیا ہے وہ انہی کا کام ہے۔ ص ۶۳۵ پر ایک عنوان ہے ”حضور کی سیرت کے دو پہلو“

سورۃ الحج کی آیت ۸۸ ہے، جس کا ترجمہ ہے۔

”ان کافروں کو جن کو کوئی طرح کی نعمتوں کے ساتھ ہم نے بہرہ مند کیا ہے، (تو اے محمد) اپنی آنکھیں ان نعمتوں کی طرف نہ پساؤ اور ان پر غم نہ کرو اور اپنے بازو مومنین کے لیے جھکا۔“

اب اس آیت پر مولانا ندوی کا نوٹ دیکھیے اور خاص طور پر ابتدائی خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیے — مولانا لکھتے ہیں :

”قرآن حکیم کے جس قدر احکام میں حضور کو مخاطب کیا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ حضور

کے عمل کی یہ تصویر ہے اور اُمت کو ان کے اسوہ کی تلقین کی گئی ہے۔

اس آیت میں حضورؐ کی سیرت کے دو پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپؐ دنیا کے تکلفات پر یہ سمجھ ہوئے نہیں، طبیعت میں انتہا درجے کا استغنا ہے، اور یہ کہ آپؐ مسلمانوں کے لیے آیہ رحمت ہیں، آپؐ کے دل میں اُمت کے لیے شفقت کا بے پناہ جذبہ موجزن ہے۔

غور فرمائیے۔ حضورؐ دعوتِ عام دے چکے ہیں، مخالفت کی آگ بھڑک چکی ہے۔ لوگوں نے ابوطالب سے کہا، اپنے بھتیجے کو سمجھاؤ، ورنہ ہم تم سے بھی تعرض کریں گے۔ ابوطالب نے آکر حضورؐ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ چچا! اگر وہ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر مہتاب رکھ دیں، جب بھی میں دعوتِ توحید سے نہیں ٹک سکتا۔ کس قدر استغنا ہے۔ قوم سونے چاندی کے ڈھیزل نکرتی ہے، حسین و جمیل رشتے پیش کیے جاتے ہیں، مگر حضورؐ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ رحمت و رافت کا یہ عالم ہے کہ وہ لوگ جو منافق ہیں، آپؐ کو تکلیفیں پہنچاتے ہیں، اُن سے ہر طرح اغراض و چشم پوشی کرتے ہیں۔ عبداللہ ابن ابی مرثا ہے تو آپؐ پر اہلِ مبارک تبرک کے لیے بھیج دیتے ہیں۔“

غور فرمائیے قرآن کی روشنی میں سیرتِ طیبہ کی اتنی دل نشیں اور جامع تشریح کہاں نظر آئے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ علیہ السلام کی سیرت کا اصل ماخذ قرآن ہی ہے۔ اسی لیے مولانا ابوالکلام نے مولانا شبلی مرحوم کو اس طرف توجہ دلائی اور حبِ شبلی کی حیاتِ مستعار نے ایسا موقع فراہم نہ کیا تو مولانا خود متوجہ ہوئے، وہ مربوط انداز سے یہ کام نہ کر سکے۔ لیکن ان کے مقالات اور نوٹس مولانا غلام رسولؒ قہر نے مرتب کر کے قرآن کے نقطہ نظر سے نبی کریمؐ علیہ السلام کی مبسوط سیرت پیش کر دی۔ یا پھر مولانا عبدالمجید کے وہ لکچر ہیں جو مدراس میں دیے گئے۔ ”سیرتِ نبوی قرآنی“ ان کا عنوان ہے۔ مولانا آزاد کے سیکرٹری اجمل خان کی مبسوط کتاب اس عنوان پر ”سیرت از روئے قرآن“ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے پاس میں نے دیکھی۔ محمد اسحاق بھٹی صاحب کا بیان ہے کہ ساٹھ سے زائد اقساط میں مولانا ندوی کا مفصل مقالہ ”چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں“ الاعتصام“ میں چھپا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب بھٹی صاحب ”الاعتصام“ کے ایڈیٹر تھے۔ اللہ کرے کہ وہ کتابی شکل میں سامنے آجائے۔

اس موقع پر سورۃ الکہف کا وہ نوٹ بھی دیکھ لیں جو آیت ۲۸ کے ضمن میں لکھا گیا ہے —  
 اس آیت میں الشر رب العزت نے اپنے رسول کو ان مظلوم صحابہ کے ساتھ وابستہ رہنے کی  
 تلقین و تاکید کی ہے جو صبح و مساحد باری بیان کرتے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے  
 ہیں — کفار کا مطالبہ کہ ہماری بات سننے اور اپنی بات نہیں سننے کی غرض سے ان صحابہ سے  
 کچھ وقت علیحدگی ضروری ہے — قرآن کی بات اپنی ہے، وہ جہاں فدا بیان رسالت کی فداکاری و  
 جاں سپاری کو آیت کے بین السطور میں پیش کرتا ہے، وہاں بقول مولانا ندوی اس ”پیغمبر مساکین“  
 کا کردار بھی سامنے آتا ہے کہ اس کی صبحیں اور شامیں گزرتی ہیں تو انہی کے ساتھ جو دینی اعتبار  
 سے مفلوک الحال سہی لیکن ہیں تو ”لواقسم علی اللہ لا بؤہ“ کے مصداق — ”پیغمبر  
 مساکین“ مولانا کا قائم کردہ عنوان ہے۔ ملاحظہ فرمائیے (ص ۷۹)۔

”قرآن حکیم میں بعض باتیں بصیغہ امر ادا کی گئی ہیں، مگر اس سے مراد خبر ہے اور ایک  
 واقعہ کا اظہار ہے، اور اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہاں بھی بالکل یہی انداز بنیان ہے۔ بظاہر  
 معلوم ہوتا ہے کہ حضور شاید ان عام لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا پسند نہ فرماتے تھے جو غریب اور  
 مفلس تھے۔ اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، آپ ان لوگوں کے ساتھ رہنے  
 میں کوئی عار محسوس نہ کریں، حالانکہ واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ حضورؐ  
 ہمیشہ ابوزر، سلمان فارسی اور اس قسم کے غریب اور مخلص عقیدت مندوں میں بے تکلفی سے  
 بیٹھتے اور ان میں صبح و شام گزارتے۔ امر اکو ناگوار تھا کہ وہ اس حالت میں آپ سے ملیں چٹانچم  
 وہ کہتے کہ جناب ہم اس حلقے میں بیٹھ کر آپ سے گفتگو نہیں کر سکتے، ان کے کپڑوں سے بو آ رہی  
 ہے اور ہماری طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے، آپ بھی ان سے الگ ہو جائیے۔ مگر وہ پیغمبر  
 جو افلاس و فقر کو اعزاز بخشنے کے لیے آیا تھا کیونکر ان کی باتوں کو مان لیتا۔ قرآن کی زبان میں ان  
 کو بتایا گیا کہ گویہ مفلس ہیں، مگر دولتِ ایمان سے ان کے دل مالا مال ہیں۔ ان کے کپڑوں سے  
 گو تھیں بو آتی ہے، مگر دل ذکرِ خدا سے ہمک رہے ہیں۔ یہ مخلص ہیں، خدا پرست ہیں، تم  
 انھیں حقیر سمجھو، تمھیں اختیار ہے۔ مگر قدرت کی جانب سے یہ طے شدہ امر ہے کہ یہی لوگ دنیا  
 میں انقلاب پیدا کریں گے۔ تم حرص و ہوا کے بندے ہو، تمھارے دلوں پر غفلت کے حجاب

پڑے ہوئے ہیں۔ تم اسلام کی برکات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ تم جب تک دنیا کی ان کٹافٹوں میں پڑے ہوئے ہو، محبت نبوی سے فیض یاب نہیں ہو سکتے، اور تم ہرگز اس قابل نہیں ہو کہ پیغمبر مخلص مساکین کو چھوڑ کر تم مغرور اور متکبر انسانوں کے ساتھ اٹھے بیٹھے۔“

اور ان اصحابِ تقویٰ و ایمان صحابہ کرام کا تذکرہ اور ان کے حق میں غیرتِ الہی کا ظہور اسی پر لبس نہیں، سورۃ نور کی مشہور آیت استخلاف کا مطالعہ بھی مفید ہوگا جس میں ایسے وقت میں ان حضرات کو حکومت و اقتدار بخشنے کا وعدہ ہوا جب ان کے متعلق عام سے سکون کا تصور تک نہ تھا۔ کفر زیر لب خنداں تھا لیکن غیرتِ الہی کا اعلان اپنی جگہ اٹل تھا۔ اس تاریخی صداقت میں چھپی ہوئی روح اب بھی قائم اور زندہ ہے اور ہر وہ شخص اور طبقہ جو اپنی زبوں حالی پر پریشان ہے اسے ”استغفرت قلبہ“ کہہ کر ہنچھوڑ رہا ہے کہ یہ تو بتاؤ، تمہیں اپنی پریشانیوں، اقتدار و استحکام سے محرومی اور باطل قوتوں کے عروج کا بڑا صدمہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ متاعِ ایمان اور دولتِ ایقان جس پر اس الہی انعام کا وعدہ ہے، اس کی صورت کیا ہے؟

آیت استخلاف کا نمبر ۵۶ ہے اور جیسا کہ عرض کیا یہ سورۃ نور میں ہے۔ اس سے قبل کی آیت ۵۵ میں اطاعتِ رسول کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دارین کی سعادتوں جن میں استخلاف فی الارض بھی شامل ہے کا انحصار اطاعتِ رسول پر ہے۔ اس پر مولانا کا نوٹ پہلے ملاحظہ فرما کر پھر اس سے متصل اگلا نوٹ بعنوان ”استخلاف فی الارض کا وعدہ“ ملاحظہ فرمائیں۔

## اطاعتِ رسول

”قرآن حکیم نے بار بار اطاعتِ رسول کو بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس اسوۂ کامل کی تقلید کرے اور اپنی زندگی کے لیے مشکوٰۃ نبوت سے کسبِ انوار کرے، کیونکہ پیغمبر ہی دنیا میں محاسن اور کمالات کا پسیدہ ہوتا ہے اور اس سے بے نیازی اللہ کے دین سے کفر کے مترادف ہے۔ چنانچہ اِنْ تَطِيعُوْا تَهْتَدُوْا کہہ کر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا میں اللہ کی فرماں برداری اور اس کی اطاعتِ شعاری کے معنی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عظمتِ رسول کو سمجھو اور اس کے مقامِ رفیع سے واقف ہوتا کہ تم ہدایت

حاصل کر سکو۔

## استخلاف فی الارض کا وعدہ

”دین کے معنی اسلامی نقطہ نگاہ سے کامیابی کے کامل پروگرام کے ہیں، اس لیے جو لوگ صحیح معنوں میں مومن ہوں گے اور ان کے اعمال اللہ کے تجویز کردہ پروگرام کے ماتحت ہوں گے، ان کا دنیا و آخرت میں کامیاب ہونا یقینی اور حتمی ہے۔ اس آیت میں قرآن نے اسی مہول کی جانب رہنمائی فرمائی ہے۔ ارشاد ہے کہ مومنین سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں خلیفہ فی الارض یعنی ملک کا حاکم بنایا جائے گا، انھیں دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازا جائے گا اور ان کے سر پر تاج خسروی رکھا جائے گا، اور ان کے لیے یہ مقدرات میں سے ہے کہ جب تک اسلام کی پوری پابندی کرتے رہیں، اس وقت تک دنیا کی قیادت کریں، سب سے بلند رہیں اور اللہ کے فضل سے ساری کائنات پر حکومت کریں۔

کیونکہ اسلام کے لائحہ عمل میں ایسے رفعت آگین اور تفوق آفرین اصول داخل ہیں کہ ان پر عمل پیرا ہونے کا یہی قطعی اور منطقی نتیجہ ہے جو مذکور ہوا، اور یہ صرف نظریہ ہی نہیں، بلکہ اسلام کی ساری تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔ دیکھ لیجیے جب تک مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان رہے، ان کے دلوں میں احساس عزت کا جذبہ موج زن رہا، اسلام کے حاکمانہ اصول ان کی زندگی میں کارفرما رہے، اور جب تک انھوں نے قیادت و رہنمائی کے منصب جلیل پر اپنے کو فائز رہنے کا حق دار سمجھا، تب تک حاکم رہے، عزت و اقتدار کے مالک رہے اور رونق اور نگ و تاج رہے، اور جب سے مذہب کے معنی ان کے ہاں خشک قیود اور بے روح رکھوں کے اور محض انتساب کو باعث فخر و مباہات سمجھا گیا تو اُس وقت سے ذلت و ادبار کا دور مشہوم شروع ہوا۔ ورنہ مسلمان اور غلامی، مسلمان اور افلاس، مسلمان اور ذلت و تحقیر۔ شیعیان، یسٹفرقان اسی تفریق۔ یہی نسخہ کیمیا تو تھا جس نے مریض عربوں کو صحت و توانائی بخشی، جس نے زیر دستوں کو زبردست بنا دیا، جس کی وجہ سے جہالت تعلیم سے بدل گئی اور بد اطلاق قوم سرخیل روحانیت ٹھہری۔ یہی تو وہ اسلام ہے جس کی وجہ سے مٹھی بھر مسلمان کائنات پر چھا گئے اور لوگوں کی راہ نمائی کرنے لگے۔ پھر آج اگر ہم میں ذہنی افلاس موجود ہے تو اسلام

اور قرآن اس کا ذمے دار نہیں۔ بلکہ اس کی ساری ذمے داری ہمارے اپنے اعمال اور کردار پر عائد ہوتی ہے۔

وعدۃ استخلاف کے بعد اس آیت میں نہایت جامعیت کے ساتھ وہ پروگرام بتلایا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے خلافت و نیابتِ الہیہ کا منصب حاصل ہو سکتا ہے، اور وہ پروگرام نماز اور زکوٰۃ کی تنظیم ہے۔ رسول کی اطاعت اور فرائض برداری ہے۔ مسلمان اگر نماز کی روحانی و اجتماعی برکات سے آگاہ ہو جائیں اور زکوٰۃ کی تنظیم کر لیں، اور یہ طے کر لیں کہ ان کی زندگی اسوۃ رسول کے مطابق ہوگی تو یقیناً جانیں، آج ہی ان کی ہر قسم کی ذلتیں اور نحوستیں، عزتوں اور سعادتوں سے بدل سکتی ہیں۔“

استخلاف فی الارض والی آیت کے ساتھ ہی اگلی آیت میں وہ پروگرام ہے جس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ خلافت و نیابتِ الہیہ کا حصول ہے۔ اسے ہی بعنوان دیگر ”اسلامی حکومت“ کہا جاتا ہے۔

آج جو صورتِ حال رونما ہے وہ بڑی المناک ہے، خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کا کوئی اجتماعی پلیٹ فارم نہیں۔ پوری قوم ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ انتشار و افتراق اس کا مقدر ہے اور اسلامی روایات سے انحراف کا تماشا عام ہے۔ جہاں کہیں اسلامی حکومت و نظام کی بات ہے وہ اور زیادہ المناک ہے، مزید ستم یہ ہے کہ بیگانوں اور ان کے ساتھ احساسِ کمتری کا شکار اور مرعوبیت کے دلدل میں پھنسے ہوئے اپنے ”اسلامی حکومت“ کے عنوان سے اس درجہ خائف ہیں کہ توبہ بھلی — ان کا اس ضمن میں عجیب پروپیگنڈا ہے۔ وہ کہتے ہیں اس سے آزادی رائے و ضمیر ختم ہوگی، ہاتھ کٹ جائیں گے، گشتوں کے پشتے لگ جائیں گے، گلی گلی درے لوگوں کو پڑتے ہوں گے۔ حالانکہ اسلامی حکومت ”ام ہے عدل و انصاف کے قیام، نیکی کے عروج اور بدی کے زوال کا، اور یہ مسلمان ہی نہیں ہر انسان کی ضرورت ہے۔“

الحج کی آیت ۴۱ اس ضمن میں قابلِ توجہ ہے۔

الَّذِينَ اِنْ مَّكَّنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ اَنَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ

وَأَمْرُوهُ بِالْمَعْمُورِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۖ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ

وہ لوگ کہ اگر ہم زمین میں انھیں مقدور (یعنی طاقت) دیں تو نماز پڑھیں، اور زکوٰۃ دیں اور بھلائی کا حکم کریں، اور بری بات سے منع کریں، اور سب معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس پر مولانا کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں — کتنی خوب صورتی سے بات سمجھائی کہ بھائی اس نظام سے ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ تو عدل و دین داری کی معراج ہے اور اس میں سب کا بھلا ہے۔ ”جو لوگ اسلامی حکومت کے تخیل سے خائف ہیں، ان کو اس آیت پر غور کرنا چاہیے۔ ارشاد ہے کہ ہم مسلمانوں کو جب تمکّن فی الارض کی نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ دنیا میں عیاشیاں نہیں پھیلاتے اور حرص و آرزویں گرفتار ہو کر لوگوں کے مال و دولت پر ڈاکہ نہیں ڈالتے۔ وہ نہایت پاک باز اور خدا پرست ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عبادتِ الہی کے جذبے کو عام کریں، اللہ کے سامنے جھکیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تاکہ تمام غریب اور مساکین کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔ وہ ہر نیکی کو پھیلاتے ہیں اور ہر برائی کے خلاف جہاد کرتے ہیں، ان کا طرز حکومت نہایت عادلانہ اور دین دارانہ ہوتا ہے۔“

اسلام اور اسلامی روایات میں ”جہاد“ کا اطلاق ہر اس محنت و کوشش پر ہوتا ہے جو غیر کے غلبے اور بلندی کے لیے کی جائے۔ بُرا ہو حسد و عناد کا کہ اس کے بل بوتے پر یاروں نے خون ریزی کا نام ”جہاد“ رکھ کر اسلام کو بدنام کرنا چاہا۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر مسلمانوں میں بدقسمتی سے ایک طبقہ سرے سے اس کا انکار کر کے حدود اسلام سے خارج ہو گیا۔ ایک نے من مانی قبیرات کر کے اس کی روح مسخ کر دی اور ایک نے ہر اس شخص کو بدنام کر کے غیروں کی ہوشنودی کا سامان فراہم کیا جو جہاد کے میدان میں تھا۔

قرآن عزیز نے سورہ الحج میں جہاد و قتال کی ابتدائی آیت میں اس کی اصل غرض نام خدا کی بلندی اور مظلوم کی داد رسی بتلائی ہے، نام خدا مسجد میں ہو یا کہیں اور — ہر جگہ اس کا احترام ہے — یہ آیت ۳۹، ۴۰ میں ہے۔ اس سے قبل اس قربانی کا ذکر ہے جو حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ”سنة ابيكم ابراهيم“ ہے — اس میں بظاہر جانور ذبح ہوتا ہے لیکن اس کی اصل روح دلوں کی حرارت و وحدت اور اپنے آپ کو من کل الوجوه

اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔

مولانا ندوی قربانی و جہاد کا جوڑ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ گویا دونوں لازماً ملزوم ہیں اور پھر اسلامی جہاد کی حقیقی غرض بیان کر کے مخالفین اور مستشرقین کا منہ بند کرتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

(ص ۵۶-۸۵۵)

## قربانی اور جہاد

”یعنی قربانی کے عملی معنی یہ ہیں کہ دلوں میں جذبہ جہاد موجزن ہو۔ اگر ہم ہر سال لاکھوں اور کروڑوں حیوانات کا خون بہائیں اور قلوب میں کوئی حرارت اور کوئی جذبہ جہاد پیدا نہ ہو تو پھر یہ عبادت سراسر بے روح اور بے کیف ہوگی۔

آیت میں اذن جہاد ہے، کیونکہ مسلمانوں کی مظلومیت حد سے بڑھ گئی، اب یہ ناممکن ہے کہ ان مظالم کو زیادہ دیر تک برداشت کیا جائے۔

ارشاد ہے کہ اللہ نے طے کر لیا ہے کہ مسلمانوں کی اعانت کی جائے اور مشرکین کے غلبہ و استیلا کو دور کیا جائے۔ کیونکہ مسلمان مظلوم ہیں اور اسلام کو مظلومیت پسند نہیں جس طرح ظلم بڑی چیز ہے اور اسلام اس کو جائز قرار نہیں دیتا ہے، اسی طرح مظلومیت بھی ناقابلِ برداشت ہے اور مجرم ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جہاد کی نوعیت کیا تھی۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، ان کو ان آیات پر غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کب اور کس وقت مسلمانوں کو جہاد کا اذن عام دیا۔ بے شک اس وقت اجازت دی، جب مظالم حد سے بڑھ گئے اور مکہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی۔“

## اسلامی جہاد کی غرض قیامِ عبادت ہے

”اس آیت میں بڑے واضح الفاظ میں قرآن حکیم نے بتا دیا ہے کہ اسلامی جہاد سے غرض معاہدہ الہیہ کی حفاظت ہے۔ مسلمان اس لیے میدانِ جہاد میں قوت آزا ہوتا ہے کہ خدا پرستی کے تمام مرکزوں کو مشرکین کے قبضہ و استیلا سے پاک کر دے۔ وہ جہاد و قتال سے مادی نفع کا طالب نہیں ہوتا بلکہ اس کے سامنے اعلیٰ کلمۃ اللہ کا بلند مقصد ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے لیے لڑتا ہے اور



اللہ کے لیے صلح کرتا ہے۔ اگر مسلمان حق و صداقت کی تائید میں تلوار نہ اٹھائے تو پھر ساری دنیا میں باطل کی حکومت ہو جائے اور تمام مرکزوں میں جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہے، دیوتاؤں اور معبودانِ باطل کی عبادت ہونے لگے۔ مسلمان امنِ عالم کا کفیل ہے۔ اس کا جہاد دوسرے مذاہب کی آزادی کے لیے بھی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سب عبادت گاہوں کی حفاظت ہو اور سب لوگوں کو آزادی حاصل ہو کہ وہ آزادانہ طور پر اللہ تعالیٰ کو یاد کر سکیں اور اس کے نام کو بلند کر سکیں۔ البتہ اسے یہ ناپسند ہے کہ لوگ غیر اللہ کی پرستش کریں اور بتوں اور دیوتاؤں کے نام پر معابد تعمیر کریں۔ کیونکہ ایسے مراکز عبادت درحقیقت جہالت و تاریک خیالی کے مدرسے ہوتے ہیں۔ جہاں انسانوں کو ذلت و نکبت کا درس دیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا کے سوا اور ہستیاں بھی احترام و عبادت کے لائق ہیں، حالانکہ یہ بہت بڑی گمراہی اور بہت بڑا جرم ہے۔ اس سے نفسِ انسانیت تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور پھر کبھی اُبھرنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔“

آج ہمارے یہاں ”رجم“ کا مسئلہ بلاوجہ باعثِ نزاع بنا دیا گیا ہے۔ اچھے بھلے لوگ ساری عمر قرآن کی خدمت میں کھپانے کے بعد یہاں آکر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ یہاں اُن کے بقول سورۃ نور میں زانی کے لیے کوڑوں کی سزا تو ہے رجم کی نہیں۔

مولانا ندوی کا گمراہ، محتاط اور ذمہ دار قلم یہاں ہوئے رواں کی طرح بہتا ہے اور سورۃ نور جس اسلوب کے ساتھ نازل ہوئی، مولانا پہلے اس پر ایک بھر پور تبصرہ کر کے پھر مزائے رجم پر گفتگو فرماتے ہیں۔ یقین جانے انداز اتنا دل نشین ہے کہ دل و دماغ میں اُبھرنے والے خیالات اور وساوس ایک دم ختم ہو جاتے ہیں۔

ص ۸۳۶ پر اس سورت کے معاملے میں اہتمام ربانی کی بات پہلے ملاحظہ فرمائیں۔

”قرآن حکیم کی یہ پہلی سورت ہے، جسے اس اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، گو پورا قرآن اللہ کی جانب سے ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کا ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے، نیز قرآن کی ہر سورت میں آیاتِ بتینات کا ذخیرہ ہے، مگر اس سورت کو ان خصوصیات کے ساتھ قصص کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمدن اور کلچر کے مسائلِ مہمہ کو بیان کیا گیا ہے اور ان

معاشرتی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے جن کی وجہ سے قومیں ترقی اور برتری کی منزلیں طے کرتی ہیں، اور انھیں فراموش کر دینے کا نتیجہ لازماً ذلت اور ہلاکت ہوتا ہے۔  
اس کے بعد سزائے رجم پر گفتگو ملاحظہ فرمائیں اور پھر دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کوئی اشکال باقی رہتا ہے؟ (ص ۸۳۷)

”تمام مذاہب نے زنا کو انسانیت کے لیے بہت بڑی لعنت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا وجود قوموں کے لیے اخلاقی تباہی کے مترادف ہے۔ قرآن حکیم نے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلے کی متعلقہ تفصیلات بیان کی ہیں اور اس کے ذرائع و وسائل تک کا استقصا و احتوا کیا ہے۔ قرآن کی نگاہ میں دوسری مذہبی کتابوں سے کمیں زیادہ عمیق ہیں، اس نے تمام انسانی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر ایسے قوانین اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں کہ ان کو ملحوظ رکھنے کے بعد زنا کا احتمال قطعاً پیدا نہیں ہوتا۔“

اس آیت میں زنا کی حد شرعی سے بحث فرمائی ہے۔ ارشاد ہے کہ زانی کے شوہر کے لگائے جائیں، اور اس معاملے میں سوسائٹی جذباتِ رحم و رافت سے بالکل متاثر نہ ہو۔ یہ سو ڈرے مجمع عام میں لگائے جائیں تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت و تذکیر حاصل ہو۔  
زانی سے مراد یہاں وہ شخص ہے جو کنوارا زانی ہو، بیباہ ہوئے کے لیے اسلامی سزا رجم ہے۔

خوارج نے رجم کا انکار کیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ یہ سزا ہر دو قسم کے زانیوں کے لیے ہے۔ ان کے دلائل یہ ہیں:

- ۱۔ الزانیۃ والزانی میں کوئی تخصیص نہیں بلکہ عموم و استقرار مراد ہے۔
- ۲۔ اگر رجم کی سزا مقرر و متعین ہوتی تو اس کو قرآن حکیم میں موجود ہونا چاہیے تھا۔
- ۳۔ رجم کو ماننے کی شکل میں یہ لازم آئے گا کہ نص میں خبر واحد کی تخصیص کی جائے جو درست نہیں۔

بعض موجودہ زمانے کے روشن خیال مفسرین کے دلائل بھی تقریباً یہی ہیں۔ جوابات یہ ہیں:

۱۔ قرآن حکیم نے یہاں بے شک صرف الزانیۃ اور الزانی کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر سنت،

تواتر اور اسلامی فیصلوں سے جو کتب فقہ اور تاریخ میں مذکور ہیں، یہ ثابت ہے کہ رجم اسلامی سزا ہے۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ محض اس بنا پر کہ قرآن میں واضح الفاظ میں رجم کا ذکر نہیں، ہم پوری اسلامی تاریخ کو جھٹلا دیں، صحابہ کے فیصلوں کو غلط قرار دیا کریں، رسول کے احکام کو ٹھکرائیں اور علمی و عملی تواتر کا انکار کر دیں۔

۲۔ رجم کی سزا یقیناً قرآن میں موجود ہے، مگر اس نہج پر نہیں، جس طرح غواج یا اس زمانے کے متنفذین دیکھنا چاہتے ہیں، بلکہ اشارۃً اور برسبیل استطراد قرآن میں رجم کی سزا موجود ہے۔ کیا ان کو معلوم ہے کہ عبد رسالت میں اہل کتاب سے اس معاملے میں بحث ہوئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ توراۃ لاؤ اور پڑھو، اگر تم میں صداقت ہے تو تسلیم کر لو گے کہ اس میں رجم کی سزا کا حکم موجود ہے۔ مگر انھوں نے آیات رجم کو چھپایا، اور جب حضرت عبداللہ بن سلام نے بڑھ کر ان کی چالاکی کا بھانڈا پھوڑ دیا تو وہ نادام ہوئے، اس پر ان کے جذبہ کتمانِ حق کے متعلق آیات کا نزول ہوا۔ کیا یہ آیتیں رجم کی تائید میں نہیں؟ مگر سوال اپنی جگہ پر ہنوز باقی ہے کہ اس قدر ضروری حکم کو قرآن نے بالتصریح کیوں ذکر نہیں کیا؟ اور صرف کنواروں کے متعلق حد شرعی کے اعلان کرنے میں کیا مصلحت ہے؟

بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کا انداز بیان کچھ دوسری کتابوں سے مختلف ہے اور وہ لوگ جو اس کی خصوصیات سے آگاہ نہیں ہوتے، اس قبیل کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قرآن میں اکثر ان باتوں کا ذکر ہے جو گو اپنی جگہ پر اہم نہ ہوں مگر اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں کہ وہ نئی اور جدید ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ نماز بہت اہم مسئلہ ہے اور اس کے قیام پر قرآن نے بہت زور دیا ہے۔ مگر سارے قرآن میں اس کی ترتیب اور تفصیل موجود نہیں۔ وضو اس سے کہیں کم مرتبہ کی چیز ہے، مگر اس کی ترتیب بیان کر دی ہے۔ کیونکہ نماز کے متعلق اسلام نے بہت زیادہ جہتوں سے کام نہیں لیا۔ اس کا تحلیل اسلام سے قبل صابیوں میں اور خدا پرستوں میں موجود تھا، مجوسی بھی تقریباً اسی قسم کی نماز کے قائل تھے۔ اس لیے اللہ نے اس کی تفصیلات کو اسوۂ رسول پر چھوڑ دیا، اور وضو جو کسی شریعت میں موجود نہ تھا، اس کی تفصیلات بیان

فرمادیں۔ اسی طرح رحم کی سزا میں چند شرائع کا قریباً اتفاق تھا، اس لیے قرآن نے بالتخصیص اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ البتہ کنوارے کی سزا کی تخصیص چونکہ قرآن کو مقصود تھی۔ اس لیے اس کا اظہار کر دیا۔

۳۔ جواب کی اس نوعیت کے بعد تیسرا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

### عفیفہ عورت کو مستم کرنے کی سزا

”ایک طرف قرآن نے زانی کی سزا اس قدر کڑی رکھی ہے کہ موجودہ مذاق کے لوگ اس کو تکلیف مالا یطاق قرار دیتے ہیں، اور دوسری طرف چار گواہوں کی شہادت ضروری بتاتی ہے، جن کا مٹیانا ہونا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ یہ ایک سوال ہے جو طبعاً پیدا ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ سزا اس لیے کڑی رکھی ہے تاکہ اس خبیث مرض کا کلیتہً انسداد ہو جائے۔ چنانچہ آپ عہد نبوی میں دیکھیے گا کہ زنا کے واقعات دو تین سے زیادہ نہیں ملیں گے اور اس دورِ جدید میں شاید ہی چند آدمی ایسے مل سکیں جنہیں صحیح معنوں میں عفیف کہا جاسکتا ہے۔ یہ بین تفاوت راہ از کجاست تا کجا

چار شاہدوں کا ہونا اثباتِ واقعہ کے لیے اس لیے لازم ہے کہ معاملہ ایک جان کا ہے، ایک کی زندگی ختم ہونے کا ہے۔ چنانچہ اس اہم واقعہ کے لیے معمولی شہادت ناکافی اور ناقصانہ ہے۔ اس آیت میں معاملے کی اہمیت کے پیش نظر گواہوں کو تنبیہ کرنی ہے کہ اگر تم نے عفیف اور پاک باز عورتوں کو یوں ہی مستم کیا اور ثبوت میں عینی گواہ پیش نہ کر سکے تو حد قذف کے لیے تیار رہو۔ تمہاری پشت پر اسٹی ڈوے لگائے جائیں گے۔ اس حد شرعی کے تقرر سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک عورت کی عزت اور اس کا وقار کس درجہ قیمتی ہے۔ ارشاد ہے کہ ہر گار عورتوں کو مستم کرنے والے لوگ فاسق و بدکردار ہیں۔ انھیں سزا دو اور آئندہ کے لیے ان کی شہادت بھی قبول نہ کرو۔“

سزائے رحم بلاشبہ سخت ہے، لیکن یہ جرم بھی تو کم سخت نہیں۔ معاشرتی اعتبار سے سب سے ظالمانہ اقدام یہی ہے کہ انسان دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالے۔ لیکن اس جرم

کی سنگینی کے اعتبار سے اس کی صحت کا معاملہ بھی اتنا ہی سخت کیا گیا تاکہ کوئی اٹھ کر آسانی سے کسی پرہمت طرازی نہ کر سکے — کرے تو اس کی سزا غایت درجہ سخت ہے تاکہ باقیوں کو عبرت ہو۔ ”عقیفہ عورت کو متمم کرنے کی سزا“ کے عنوان میں اسی کا ذکر ہے — اور رابطہ آیات کا مسئلہ اگر بہت اہم ہے تو اس ترتیب سے اس فن میں بھی مولانا کے کمال کا پتا چلتا ہے۔ حوالوں کا معاملہ دراز ہوتا جا رہا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ حکایت اتنی لذیذ و شیریں ہے کہ اختتام کو جی نہیں چاہتا، تاہم اب زیادہ طوالت اختیار کیے بغیر محض چند باتوں پر اکتفا کر دوں گا۔

تین باتیں سورۃ الفرقان کے حوالے سے ہیں اور بالکل ابتدائی آیات کے ضمن میں —

تفسیر کا ص ۸۸۱ قابلِ غور ہے :

”بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا کہ اہل جہان کے لیے ڈرانے والا ہو۔“ (آیت : ۱)

اس پر مولانا کا نوٹ جہاں قرآن کی عظمت کا آئینہ دار ہے وہاں ختم نبوت و رسالت کی ایک اچھوتی تعبیر اس سے پیدا کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں، پھر مولانا نے آیت ۲ کے ضمن میں ایک عنوان قائم کیا :

### اشتر اکیٹ اور اسلامی تخیلِ ملک

یعنی اندھ بھری سرمایہ داری کے ردِ عمل میں ابھرنے والی تحریکِ اشتر اکیٹ کا رد —

کیونکہ جس طرح سرمایہ داری اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور مغضوب ہے، اسی طرح کا حال اس کا ہے — نہ وہ پسند نہ یہ — لیکن اصل سوچنے کا مقام یہ ہے کہ نکتہ رس اور دقیقہ سنج طبیعت نے بات کہاں سے پیدا کی — سبحان اللہ و بحمدہ

اور پھر آیت ۶ کے حوالے سے ”قرآن خدا کا کلام ہے“ کا عنوان قائم کر کے اس تخیل کو پارہ پارہ کیا جس کی رو سے قرآن نبی اُمّی کا کلام قرار پاتا ہے یا اس میں آمیزش کا ذہن ابھر رہا ہے۔ دونوں صفحات تسلسل سے پڑھیں، ایک عجیب کیف محسوس ہوگا۔

مسلمان قرآن کے بعد کسی دوسرے صحیفے کا منتظر نہیں

اللہ کی ذات ہمہ گیر اور ہمہ برکت ہے، اور یہ اُس کے فیوضِ عالیہ میں سے ہے کہ اس

نے گمراہ انسانوں کے لیے ایک راہ نمائےجا، اور ایک نہایت ہی شان دار کتاب عنایت فرمائی جو حق و باطل کے درمیان فارق ہے اور وہ راہ نمائےجا ہے کہ اس کی نبوت تمام کائنات انسانی کے لیے ہے۔ اس کا پیغام زمان و مکان کی قیود سے بالائے۔ وہ ہر قوم اور ہر قرن کے لیے پیغمبر ہے۔ اس کی تعلیمات کا فیض عام ہے۔ وہ ایک ایسا آفتابِ رشد و ہدایت ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا، یعنی قیامت تک مسلمانوں کو کسی نبوت اور کسی رسالت کی ضرورت نہیں، کسی کتاب اور کسی صحیفے کی حاجت نہیں۔ جہاں تک رشد و ہدایت کے پروگرام کا تعلق ہے، مسلمان قرآن کے بعد ہر چیز سے بے نیاز ہے۔

علیٰ عُبْدُہ سے مراد ہے کہ بڑے سے بڑا رتبہ اور مقام عبودیت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم باوجود ان مراتب اور درجات کے، باوجود اس قرب و اختصاص کے، کہ دنیا کا کوئی شخص فضائل میں ان کا ہم سر نہیں ہے اور وہ اقلیمِ مکارم کے تنہا تاجدار ہیں، اللہ کے بندے ہیں اور ان کے تعلقات اپنے خالق سے نیاز مند نہ ہیں۔

نَزَّيْرًا۔ سے مراد آگاہ کرنے والا ہے، ڈرانے والا نہیں؟  
اشترکیت اور اسلامی تخیلِ ملک

”شُرک اور بت پرستی کی تردید ہے۔ ارشاد ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر اس کو بیٹوں کی کیا ضرورت ہے؟ اور کون ہے جو اس کے اختیارات میں دخل اندازی کر سکے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اشترکیت کا موجدہ تخیل اگر غور کیا جائے تو اس آیت کی رُو سے درست نہیں۔ کیونکہ اشترکیت کے معنی یہ ہیں کہ تمام املاک کو حکومت کا ملک قرار دیا جائے۔ حالانکہ ہر چیز کا مالک خدا ہے۔ اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اسی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ان کو مناسب اور موزوں طریقہ سے اپنے بندوں میں تقسیم کر دے۔ یہ خدا کی ملک اور اس کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ مخالفت کرنے والے کون ہیں؟ اصل میں یہی وہ مقام ہے جہاں سے اشترکیت اور اسلام کی دو جدوجہد راہیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس باب میں دونوں متفق ہیں کہ کوئی شخص تنہا کسی چیز کا مالک نہیں۔ اشترکیت کے نزدیک کوئی فرد اس کا مالک نہیں ہو سکتا، جمہوریت یا حکومت اس

کی مالک ہے۔ اور اسلام کتنا ہے کہ صرف اللہ مالک ہے۔ لہٰذا مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ہماری حیثیت محض امین کی سی ہے۔ ہم براہ راست مجاز نہیں کہ اپنے اختیارات کو بروئے کار لا سکیں۔ ہم اللہ کی ہدایات کے منتظر ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے، اپنی دولت کو تقسیم کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے دولت اور املاک کی اتنی بہتر تقسیم فرمائی ہے کہ اس کے بعد اشتراکیت کے لیے مسلمان کے قلب میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔“

### قرآن خدا کا کلام ہے

”نصر بن حرث اور اس قماش کے دوسرے لوگ جب یہ دیکھتے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا جواب بن نہیں آتا تو وہ کہتے کہ یہ خدا کا کلام تھوڑا ہی ہے، یہ تو افترا ہے۔ وہ لوگ جو اہل کتاب تھے اور اب مسلمان ہو گئے ہیں، اس کی ترتیب و تدوین میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ نیز کہتے کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں اور قصے ہیں، جس کو اس نے لکھوا لیا ہے اور اب قرآن کے نام سے ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور خدا کی جانب سے فرستادہ ہیں۔ ان کا پیش کردہ کلام، خدا کا کلام ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس میں الیسا علم اور ایسی وسعتِ معارف ہے جو اللہ کے ساتھ مختص ہے۔

جس طرح آسمانوں اور زمین کے بھیدوں اور اسرارِ کائنات کو مجز خالق کون و مکان کوئی نہیں جانتا، اسی طرح ان علوم و معارف سے کوئی شخص آگاہ نہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے پر سب سے بڑی دلیل اس کی وسعتِ معانی اور ذخارتِ معلومات ہے۔

کیا کوئی انسان اتنا بلیغ، اتنا جامع اور جملہ ضروریاتِ انسانی کو پورا کرنے والا کلام پیش کر سکتا ہے؟ ایک ایسا کلام جس میں عقائد بھی ہوں، اخلاق کی تفصیل بھی ہو اور معاشرت کی گتھیاں بھی سلجھائی گئی ہوں، جس میں اقوام و ملل کے حالات اور نفسیاتِ عروج و زوال کی داستان بھی ہو، جس میں حیرت انگیز پیش گوئیاں ہوں، اور غیوب کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہو، جس کا اندازِ بیان بالکل فطری، جاذب اور حیران کن طور پر معجزانہ ہو، جس کے متعلق ساری دنیا کو مقابلے

کی دعوت دی جائے، جس کو سن کر بڑے بڑے فصیح لکھنا چھوڑ دیں، قوم میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دے جو مردوں میں جان ڈال دے اور زندوں کو عروج و ارتقا کے بام بلند تک پہنچا دے۔ ایسا عظیم المرتبت کلام یقیناً انسان کی وسعت سے باہر ہے۔“

اسلام دینِ تبلیغ ہے، تبلیغ اور مبلغ کے ضمن میں قرآن کی جو ہدایات ہیں ان سے قطع نظر کر کے محض ایک مقام قابلِ غور ہے۔ سورہ طہ کی آیت ۴۴ — موسیٰ علیہ السلام جیسے اووالعزم نبی فرعون کے پاس جا رہے ہیں تو انھیں شیریں بیانی کی ہدایت ہے۔ متعلقہ آیت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ کرنے کے بعد مولانا کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں۔

اِذْ هَبْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰى ۚ فَفُؤْ لَا لَهُ قَوْلًا لِّيَنَّا لَعَلَّهٗ  
يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے سر اٹھا رکھا ہے۔ سو اُس سے نرمی سے بات کرو، شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔

شیریں گفتار ہونا مبلغ کے لیے ضروری ہے۔

”فرعون کے پاس بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو جو نصیحتیں ارشاد فرمائی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ آج کل کے علما کو آبِ زر سے لکھ لینا چاہیے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ دیکھنا میری یاد سے غافل نہ ہو جانا اور ہر وقت عبودیت اور نیاز مندی کے تعلقات کو قائم رکھنا۔ کیونکہ یہی چیز ہے جس سے دلوں میں پاکیزگی موجود رہتی ہے اور انسان دنیا کی تمام لذتوں کو آخرت کے مقابلے میں حقیر سمجھتا ہے۔ ذکر و شغل کی برکات سے روح میں نزہت و توانائی پیدا ہوتی ہے اور دل و دماغ جھلٹے اور روشن ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ اکسیر ہے جس کے باعث چہروں پر نور اور قلب میں سرور و نور نکلتا ہو تا ہے اور یہی وہ کبریتِ احمر ہے جس سے بہرہ ور ہونے والا انسان حقیقتاً نہایت خوش قسمت انسان ہے۔“

موسیٰ اور ہارون چوں کہ ایک بہت بڑی مادی قوت سے نیر دآزا ہونے کے لیے جا رہے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان میں اسی تناسب سے روحانیت ہو اور فرعون کے عساکر کے مقابلے میں ان کے پاس بھی اللہ کی زبردست اعانت موجود ہو۔



علماء اور راہنمایانِ دین کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ بھی اللہ کے اس ارشاد کو نہ بھولیں اور مقامِ اصلاح پر جلوہ فرما ہونے سے پہلے صلح، نیک اور خدا پرست انسان بننے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جب کبر و غور کے اس مجسمے کے پاس جادو جس کا نام فرعون ہے تو نہایت رفق و ملاحظت سے پیش آنا۔ حلاوت و شیرینی سے باتیں کرنا تاکہ اُس کے دل میں اثر پیدا ہو سکے اور اس کی قساوتِ قلبی پر خشیتِ الہی غالب ہو جائے۔ یہاں ذرا ملاحظہ کیجیے۔ فرعون کے مقابلے میں جو جابر ہے، ظالم ہے اور بدرجہ اتم سرکش ہے، اپنے پیغمبر کو اخوت اور ملاحظت کی تلقین کی جا رہی ہے۔ سوچیے اور بتائیے، ہمارے علماء اور قادیانِ طریقت کا رویہ عام مسلمانوں کے مقابلے میں کیا ایسا ہی ہے؟ وہ مسلمان جو کلمہ گو ہیں، خدا کو ایک ملتے ہیں اور فروتنی و انکسار سے رہنا اپنے لیے فخر جانتے ہیں، ان کی ادنیٰ کوتاہیوں اور لغزشوں پر ہمارے علماء اور مشدین کس خشونت اور درشتی سے پیش آتے ہیں؟

مولانا ندوی کی تفسیر کا یہ حصہ نہایت شان دار ہے۔ غور فرمائیے۔ آج کا اندازِ تبلیغ اس حکم و ہدایتِ ربانی سے کوئی مناسبت رکھتا ہے؟ حضرت مولانا محمد الیاس قدس سرہ کا ندھلوی ثم دہلوی کی تبلیغی تحریک کے علاوہ باقی دعاۃ و مبلغین کا بالعموم حال ”معیطر“ ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ قرآن نے تذکرہ، تبلیغ، دعوت اور ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جو بذاتِ خود نرم روی، اسلوب و بیان کی شیرینی اور الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں۔

آخر میں ”یا جوج ماجوج“ کے عنوان سے ایک مختصر نوٹ — یا جوج ماجوج اس دنیا کے دوس کے دورِ آخر کا ایک ہنگامہ ہے — طولِ طویل بحثیں اس ضمن میں ہوتی ہیں، جن سے عام قاری پریشان ہو جاتے ہیں — اس باب میں مولانا ندوی کا نوٹ مختصر ہے اور واضح۔ کہ دین داری کے خلاف جنگ کی صورت و کیفیت پیدا ہو جائے گی تو خدائی انتقام کا ایک مظہر یہ بھی ہوگا۔ اتنی ہی حقیقت سمجھنا ہماری ضرورت ہے — اس قوم کا تعین اور اس کے خروج کا وقت اور تفصیلات ہماری ضرورت نہیں۔ ہماری ضرورت اپنے اجتماعی کردار کا جائزہ لینا ہے، اس میں نقص اور بھول نہیں تو یا جوج ماجوج سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر اس کی چولیں ہل چکی ہیں تو پھر یہ خطرہ ٹل نہیں سکتا۔ (ص ۷۸۸ سورۃ انبیاء آیت ۵۶)

”یا جوج و ماجوج کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں، مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ قوموں کی بدعتیہ دنگی اور نظام کا ایک طوفان اٹھے گا جو نظامِ عالم کو تہ و بالا کر دے گا، اور یہ اُس وقت ہوگا جب کہ مذہب کی وقعت دلوں سے اٹھ جائے گی۔ دین داری کے خلاف جنگ کی جائے گی اور نظامِ کائنات کی بنیادیں محض ہوس و جوج پر رکھی جائیں گی۔ جب انسانوں میں شریر اور بد باطن لوگ رہ جائیں گے اور صرف مادیت کی حکومت ہوگی۔

ان حالات میں بطور انتقام اللہ تعالیٰ ایک قوم کو تباہی و غارت گری کے لیے انسانوں پر مسلط کر دیں گے تاکہ یہ بات ثابت ہو کہ انتہائے مادیت کے معنی آخری تباہی کے ہیں۔“

یہ ہے مولانا محمد حنیف ندوی کی تفسیر ”سراج البیان“ کا تعارف۔ اسے مختصر سمجھیے یا مفصل، یہ آپ کی مرضی۔! میں اپنے طور پر یہی سمجھتا ہوں کہ میں اس کے تعارف کا پورا حق ادا نہیں کر سکا۔ اس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مزید لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ مکمل کتاب انتہائی بھاگ دوڑ اور کوشش کے باوجود مجھے میسر نہ ہو سکی۔ جو حصہ ملا، اس پر اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کر دیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ مولانا کو قرآن مجید سے بے پناہ محبت ہے، تفسیر سراج البیان کے علاوہ ان کی کتابوں — مطالعہ قرآن اور لسان القرآن کی جلد اول اور جلد دوم — سے بھی اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ لسان القرآن کی ابھی دو جلدیں چھپی ہیں اور تیسری جلد کا مسودہ تقریباً سو صفحات تک پہنچا تھا کہ مولانا بیمار ہو گئے۔ خدا انھیں صحت کا ملہ دعا جلد عطا فرمائے اور کتاب پایہ تکمیل کو پہنچے۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

# مولانا محمد حنیف ندوی

اوران کی خدمات گونا گوں

محمد اسحاق بیٹی

قدرے چھوٹا قد، گورا اور سُرخ رنگ، سفید معتدل داڑھی، کشادہ پیشانی،  
 چمک دار آنکھیں جن پر نظر کی عینک پڑھی رہتی ہے، مُسکراتا ہوا باوقار چہرہ، گرمیوں  
 میں سفید لٹھے کا پاجامہ اور سفید رنگ کا کُرتہ، سردیوں میں گرم کپڑے کا پاجامہ،  
 شیروائی یا واسکٹ زیب تن، سر پر قراقلی ٹوپی، ہاتھ میں پھڑی جو مدتِ مدید سے  
 اُن کا امتیازی نشان ہے۔ گھٹنوں میں درد کی وجہ سے چلنے میں کچھ دشواری کا احساس،  
 چائے کے رسیا، خوش مزاج، خوش کلام، لطیفہ سننے کے عادی اور سنانے کے لیے  
 بے تاب، حاضر جواب، نازک اندام، دوستوں کے دوست، ہر ایک کے ہی خواہ،  
 متعدد کتابوں کے مصنف، مفسرِ قرآن، کتاب و سنت کے شیدائی، بے نظیر مترجم،  
 بہت بُرے نقاد، بہترین تجزیہ نگار، عربی کے ادیب، اُردو کے خطیب، فلسفے  
 کے دل دادہ، بلند پایہ عالمِ دین، منقول و معقول میں یکساں ماہر، ہر حلقے میں  
 مقبول، علما کے قدر دان، اصحابِ فکر کے مداح، ذاتی تعریف و تنقیص سے  
 بے نیاز، متوکل علی اللہ، صوفیانہ اطوار کے حامل، درویش منش، خود دار مگر انابت  
 سے نفور، بقول خود لکھنے میں سُست، بقول میرے باتوں میں چُست — یہ  
 ہیں مولانا محمد حنیف ندوی۔

## مولد و منشا

مولانا محمد حنیف ندوی ۱۰- جون ۱۹۰۸ء کو پنجاب کے مردم خیز شہر گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ والد کا اسم گرامی نور الدین تھا جو زیادہ پڑھے لکھنے تو نہ تھے، لیکن نہایت متدین اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ بیٹے نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو باپ نے سرکاری سکول میں داخل کرا دیا، جہاں چار جماعتوں تک تعلیم پائی، جسے اس زمانے میں پرائمری کہا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ناظرہ قرآن مجید پڑھ لیا۔

## دینی تعلیم کا حصول

گوجرانوالہ کے ”نسیانیں محلہ“ میں جماعت اہل حدیث کی ایک جامع مسجد ہے جو اس دور میں زیادہ وسیع نہ تھی۔ اس مسجد میں مولوی علاء الدین مرحوم امامت خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، جو مشہور عالم و صوفی مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ والا، ضلع گوجرانوالہ۔ وفات ۱۲۹۱ھ) کے شاگرد اور مرید تھے۔ اس مسجد کو ”مولوی علاء الدین کی مسجد“ کہا جاتا تھا۔

۱۹۲۱ء میں گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث نے مولانا محمد اسماعیل صاحب کی خدمات حاصل کر لیں جو اسی ضلع کے رہنے والے تھے اور وزیر آباد کے قریب ایک گاؤں ”دھونیکے“ سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں کے ایک علمی خاندان کے فرد

فرید تھے۔ جلیل القدر عالم، معقولات و منقولات کے ماہرِ کامل اور بہت بڑے مقرر اور خطیب تھے۔ انھوں نے اس مسجد میں خطابت و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا اور اس کو بہت وسعت دی۔ اب اسے ”مولانا اسماعیل کی مسجد“ کہا جانے لگا۔ مولانا نے اس میں جو مدرسہ قائم کیا، اس کا نام ”مدرسہ محمدیہ“ رکھا۔ ان کے علم و ادراک، فضل و کمال اور تقریر و خطابت کا شہرہ تھوڑے ہی عرصے میں دور دور تک پہنچ گیا اور مختلف علاقوں سے طالبانِ علم ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔

نوعمر محمد حنیف کے والدِ محترم کے دل میں بھی بیٹے کو دینی تعلیم دلانے کا شوق پیدا ہوا اور اُسے مولانا محمد اسماعیل صاحب کے حلقہٴ درس میں شامل کر دیا گیا۔ یہ نہایت ذہین اور ہونہار طالب علم تھے، خوب محنت اور لگن سے پڑھتے تھے، اس لیے مولانا اسماعیل صاحب بھی ان سے بہت خوش رہتے اور ان پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۵ء میں جب کہ ان کی عمر صرف سترہ اٹھارہ سال کی تھی، مروجہ علوم کے حصول سے فارغ ہو گئے۔ گوجرانوالہ میں محمد حنیف پہلے طالب علم تھے، جنھوں نے مولانا محمد اسماعیل صاحب سے علومِ متداولہ کی تحصیل کی اور ان کی شاگردی سے مفتخر ہوئے۔ انھوں نے اپنے اس لائق شاگرد کی بہترین طریقے سے علمی تربیت کی۔ اس پائے کا ذہین شاگرد انھیں بعد میں نہیں ملا۔ لائق شاگرد اب بھی عالی قدر استاد کی گوناگوں کرم فرمایوں اور ان کے اندازِ تعلیم اور اسلوبِ تربیت کی خصوصیات کا ذکر انتہائی فخر سے کرتے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل نے ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کو وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔

### ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا اسماعیل صاحب نے ہونہار شاگرد کو لکھنؤ جانے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ان کے داخلے کے لیے سفارشی خط لکھا۔

حیف ۱۹۲۵ء کے آخر میں لکھنؤ پہنچے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔ اس وقت برصغیر میں ندوہ کو مہدِ علم اور مرکزِ علم کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے فارغ التحصیل حضرات کو ہر حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس دور کے ندوہ کے نامور بابتدہ کی فہرست میں مولانا عبدالرحمن نگرامی، مولانا حیدر حسن محدث ٹونکی اور شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالرحمن ندوی نگرامی انتہائی صاف ستھرے ذہن کے عالم دین تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اصحاب عقیدت میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولانا آزاد نے ترکِ موالات کے عہدِ شباب میں کلکتہ کی جامع مسجد میں جب مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو اس کی صدر مدرس کی عہدے پر انہی کو فائز کیا گیا تھا۔ اس کے بعد انہیں ندوہ میں استادِ ادب مقرر کیا گیا۔ اس سرِ اِعمال عالم نے ۶ مارچ ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔ مولانا حیف ان سے زیادہ استفادہ تو نہیں کر سکے، البتہ ان کے عمل و کردار کی رفعتوں سے متاثر بہت ہوئے۔

مولانا حیدر حسن ٹونکی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر متمکن تھے، علومِ نقلیہ و عقلیہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ رجالِ حدیث پر گہری نظر تھی اور علمِ حدیث بطورِ حنفیہ پڑھانے میں یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ جہاں اولیٰ ۱۳۶۱ھ (جون ۱۹۴۲ء) کو اپنے آبائی وطن ٹونک میں فوت ہوئے۔ مولانا حیف ندوی نے ان سے بہت استفادہ کیا۔

شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب ۱۸۵۶ء کے آخر میں ضلعِ اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک گاؤں ”بندی“ میں پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی (متوفی ۲۹ - ربیع الاول ۱۳۱۴ھ) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ معقولات و منقولات دونوں سے برابر کا تعلق تھا اور تمام اصنافِ علم میں درجہِ امامت پر فائز تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کے معاصر تھے۔ جب دونوں کسی مجلس میں یک جا

ہو جاتے تو خوب علمی بحثیں چلتیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وقت افتتاح میں اس کے مہتمم اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء تک اس مسند پر متمکن رہے، اسی زمانے میں سید سلیمان ندوی ان کے دائرۂ شاگردی میں شامل ہوئے اور ان سے منقولات و معقولات کی کتابیں پڑھیں۔

۱۹۰۸ء میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تو حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ حج سے واپس آئے تو ندوہ کے ارباب انتظام کے اصرار پر دوبارہ ندوہ کی صدر مدرس کی قبول فرمائی اور کئی سال یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں ندوہ سے الگ ہو کر واپس اپنے گاؤں بندی (ضلع اعظم گڑھ) چلے گئے۔ یہیں ۷ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ (فروری ۱۹۴۲ء) کو راہی ملک بقا ہوئے۔ مسدکاً اہل حدیث تھے۔ مولانا حنیف ندوی ان کے علم و عرفان کی فراوانیوں سے بہت مستفید ہوئے۔

ندوہ کے زمانہ طالب علمی میں مولانا نے ایک افسانہ لکھا، جس کا عنوان تھا، ”ماں“۔ یہ ایک اصلاحی اور معاشرتی افسانہ تھا جو لکھنؤ کے ایک ماہانہ رسالے میں ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا اور پھر اس رسالے سے وہاں کے بعض اور رسالوں نے نقل کیا۔ مولانا کی یہ پہلی تحریر تھی جو کسی ماہانہ رسالے میں شائع ہوئی۔ مولانا کو عربی ادب سے ہمیشہ شغف رہا اور اس میں مہارت پیدا کی۔ یہ بات ایک مرتبہ ہندوستان کے مشہور مورخ و محقق سید صباح الدین عبدالرحمن (ناظم دارالمصنفین و ایڈیٹر ماہنامہ ”معارف“ اعظم گڑھ) نے بھی لکھی تھی۔ آٹھ نو سال پہلے جب وہ پاکستان آئے تو ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں بھی تشریف لائے اور ارکان ادارہ سے ملاقات کی۔ ہندوستان واپس جا کر انھوں نے سفر پاکستان سے متعلق ”معارف“ میں اپنے تاثرات لکھے تو مولانا حنیف ندوی کے بارے میں لکھا تھا کہ ندوہ کے قدیم طلبہ کی رودادوں میں مولانا حنیف ندوی کا ذکر بہترین الفاظ میں کیا گیا ہے اور یہ بات خاص طور سے بیان کی گئی ہے کہ عربی ادبیات پر اس طالب علم کی



نہایت گہری نظر ہے اور ذہانت و فطانت میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔

یہ توسید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی ایک تحریر کا حوالہ ہے۔ اب مولانا کی سنیے۔ ایک دفعہ ان کو عربی میں شاعری فرمانے کا شوق چرایا۔ دو تین دن کی محنت شاقہ سے ایک طویل نظم لکھی اور اپنے جی میں بہت خوش ہوئے۔ نظم لے کر عربی ادب کے استاد کی خدمت میں گئے اور انھیں نظم دکھائی۔ استاد نے غور سے نظم پڑھی۔ مسکرا کر فرمایا ”عزیزم! نہایت عمدہ نثر ہے۔“ استاد کے یہ الفاظ سن کر ہمیشہ کے لیے اس سے توبہ کر لی اور یہ وہم دل سے نکال دیا کہ وہ عربی میں شاعری بھی کر سکتے ہیں۔

ندوة العلماء کا سالانہ جلسہ مولانا کے زمانہ طالب علمی میں ایک مرتبہ لکھنؤ میں ہوا، جس میں پنجاب سے قاضی سلیمان منصور پوری (مصنف رحمۃ للعالمین) اور مولانا ظفر علی خاں تشریف لے گئے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے ان دونوں سے حنیف ندوی کا تعارف کرایا اور فرمایا یہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں اور ذہین طالب علم ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کو بتایا کہ یہ آپ کے وطن گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں اور قاضی صاحب سے فرمایا، آپ کے ہم مسلک ہیں۔ حنیف ندوی نے سید صاحب کے حکم کے مطابق طالب علم کی حیثیت سے جلسہ عام میں عربی میں تقریر کی۔ علم اور اساتذہ نے بہت داد دی۔ مولانا ظفر علی خاں اور قاضی صاحب نے بالخصوص مسرت کا اظہار کیا اور ساتھ ہی قاضی صاحب نے آہستہ سے فرمایا: ”میاں عامہ باندھا کر دو؟“ قاضی صاحب نے ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء کو اور مولانا ظفر علی خاں نے ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔

تقریباً پانچ سال مولانا حنیف دارالعلوم ندوة العلماء لکھنؤ میں اقامت گزیر رہے۔ ابتدائی تین سال میں وہاں کی نصابی کتابیں مکمل کیں اور آخری دو سال میں تفسیر قرآن میں درجہ تخصص کیا۔

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) میں رہے۔

وہاں ان کا ارادہ تصنیفی و تالیفی کام کرنے کا تھا۔ لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمایا کہ ندوہ کے فارغ علما و طلبا تقریر کے میدان میں پیچھے ہیں، حالانکہ یہ نہایت ضروری اور بنیادی کام ہے۔ آپ تقریر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ یہ میدان آپ کو سنبھال لینا چاہیے۔ چنانچہ مولانا ۱۹۳۰ء کے آغاز میں واپس اپنے وطن گوجرانوالہ آگئے۔

دارالمصنفین کا ماحول مولانا کے لیے بڑا پرکشش تھا اور وہاں کے اہل علم اور اُن کے طریق عمل سے وہ بے حد متاثر تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ دوپہر کا کھانا تمام مصنفین کے گھروں سے آجاتا اور سب حضرات اکٹھے کھانا کھاتے۔ مولانا عبد السلام ندوی کے علم تحقیق کے مولانا حنیف ندوی بہت مداح ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا عبد السلام لمبا سا کوٹ پہنتے تھے۔ گرمیوں میں بھی اور سردیوں میں بھی لمبا کوٹ ان کے زیب تن رہتا اور وہ شدید گرمی کے موسم میں کمرے میں بیٹھے تصنیفی کام کرتے رہتے۔ عام طور پر دوپہر کے کھانے میں ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ (مولانا حنیف ندوی کو وہ ”خال صاحب“ کہتے تھے) ہر روز پوچھتے۔ ”خال صاحب آپ کب تشریف لائے؟“ انھیں بتایا جاتا اور باتیں کی جاتیں، لیکن دوسرے دن پھر وہی سوال۔ ”خال صاحب آپ کب تشریف لائے؟“

بہر حال شوق اور کوشش کے باوجود مولانا حنیف ندوی کو دارالمصنفین میں زیادہ قیام کا موقع نہ ملا۔ البتہ تقسیم ملک تک وہاں آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔

**ملکی سیاست میں حصہ اور گرفتاری**

وہ ہندوستان میں سیاست کا ہنگامہ خیز دور تھا، انگریزی حکومت کی مخالفت میں اور آزادی وطن کے لیے ملک میں کئی قسم کی تحریکیں جاری تھیں۔ پنجاب کے جن علاقوں اور شہروں کے لوگ ان تحریکوں میں زیادہ سرگرم عمل تھے، ان میں گوجرانوالہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ وہاں نوجوانوں کی ایک سیاسی جماعت ”نوجوان بھارت سبھا“ کا بہت زور تھا۔ مولانا حنیف ندوی اس میں شامل ہو گئے اور

انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گرفتار کر لیے گئے۔ گوجرانوالہ کی ایک عدالت میں مقدمہ چلا اور چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ سزا کے بعد قصور جیل میں بھیج دیے گئے۔ قید کی یہ مدت وہیں گزری۔ گوجرانوالہ کے مشہور دیوبندی عالم مولانا محمد چراغ کو بھی اسی جرم اور اسی دور میں گرفتار کیا گیا تھا، انھیں نو مہینے کی سزا ہوئی تھی، وہ بھی قصور جیل میں تھے۔ دونوں نے ایک ہی جیل میں مدتِ قید پوری کی۔

### مسجد مبارک کی خطابت

پہلی جنگِ عظیم کے بعد اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کے متصل لاہور کی جماعت اہل حدیث نے ایک مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام ”مسجد مبارک“ رکھا گیا۔ اس میں متعدد حضرات خطباتِ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ ۱۹۳۰ء کے آخر میں حضرت مولانا ثناء اللہ ام تسری مرحوم (وفات ۱۵- مارچ ۱۹۳۷ء) کے مشورے سے مولانا حنیف ندوی کو (قید سے رہائی کے بعد) اس مسجد کا خطیب مقرر کیا گیا۔ خطابت کے علاوہ روزانہ نمازِ مغرب کے بعد درسِ قرآن مجید بھی ان کے فرائض میں شامل تھا۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف بائیس برس کی تھی اور درس و خطابت کی یہ پہلی اہم ذمہ داری تھی جولاہور میں ان کے سپرد ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس ذمہ داری کو انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے نبھایا۔

اس زمانے میں اسلامیہ کالج کے اکثر اساتذہ و طلباء اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ یہ حضرات مولانا کے خطبہِ جمعہ میں بھی شریک ہوتے تھے اور مغرب کے بعد درسِ قرآن میں بھی باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔ تفسیر مولانا کا خاص اور دلچسپ موضوع تھا اور اب بھی ان کی دلچسپیوں کا اصل محور یہی ہے۔ عربی کی قدیم و جدید تفاسیر کھنگال ڈالی تھیں اور قرآن کے مطالب و معانی اور رموز و نکات ان کے خزانہ ذہن میں محفوظ تھے۔ پھر نئے نئے لکھنؤ سے آئے تھے، زبان و ادب کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ تھے، کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان بولتے، جس میں گنگ و جمن

کی سی روانی تھی۔ ان اوصاف کی وجہ سے لاہور کے تمام پڑھے لکھے مسلمان حلقوں میں ان کی دھوم مچ گئی اور کثیر تعداد میں لوگ خطبے اور درس میں آنے لگے۔ مولانا ظفر علی خاں جیسے بلند پایہ خطیب و ادیب بھی ان کے سامعین میں شامل تھے اور انہماک و توجہ سے ان کی تقریر سنتے اور جھوم جھوم کر داد دیتے تھے۔

مولانا ندوی نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۹ء تک اٹھارہ سال یہ خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں انھوں نے تین مرتبہ روزانہ کے درس میں قرآن ختم کیا، اور شروع سے آخر تک دو مرتبہ خطباتِ جمعہ میں قرآن ختم کر کے تیسری مرتبہ تیسویں پارے کی سورہ والتین تک پہنچے تھے کہ یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے اختتام کو پہنچ گیا اور مسجدِ مبارک میں آنے والے لوگ ان کے افکارِ عالیہ کی سماعت سے محروم ہو گئے۔

اٹھارہ سال کی اس مدت میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ، لاہور) کے بہت سے اساتذہ اور طلبا نے ان سے استفادہ کیا، قرآن مجید کے مطالب کو سمجھا، اسلامی احکام کے نازک ترین پہلوؤں کو فہم کی گرفت میں لائے اور عربی ادبیات کی تعلیم حاصل کی۔ اُس عہد کے طلباء جن میں کئی حضرات، بعد میں اونچے مناصب پر فائز ہوئے، اب بھی مولانا کی خدمت میں آتے ہیں اور ان سے اپنی نسبتِ تلمذ اور کثرتِ استفادہ کا پُر افتخار الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

اس زمانے کے بعض اساتذہ کو میں نے دیکھا کہ وہ متعدد ایسے مشکل مسائل کا ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے مولانا سے سمجھے اور راہِ راست پر آئے۔ اس کالج کے اساتذہ و طلباء میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہا کرتے ہیں کہ اگر مولانا حنیف ندوی وجودِ باری، وجودِ ملائکہ، حیات بعد الممات، جنت و دوزخ اور تقدیر وغیرہ کے مسائل میں ان کی رہنمائی نہ کرتے تو وہ الحاد و انکار کی راہوں پر گامزن ہو چکے ہوتے۔ مولانا نے ان کو ان مسائل کی حقیقت اور اسلام کی حقانیت سے آگاہ کیا اور وہ ان کی ہدایت کا باعث بنے۔

مولانا ندوی کی خوبی یہ ہے کہ پورے غور سے دوسرے کی بات سنتے ہیں،

زیرِ بحث مسئلے سے متعلق اس کے شکوک و شبہات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کی نفسیات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اس کے فہم و فکر کے مطابق اس کے ذہن میں اُنکر ایسے پیرایہ بیان میں اس کو سمجھاتے ہیں کہ ہر بات آسانی سے اس کے فہم میں آتی اور ذہن میں پیوست ہوتی جاتی ہے، اور پھر وہ مطمئن ہو کر واپس جاتا ہے۔

مخاطب سے کوئی زائد بات کرنا، اس کے دائرہ سوال سے جواب کے حدود کو آگے بڑھانا، یا کثرتِ تاویل سے اس کو ذہنی اور فکری پریشانی میں ڈالنا، ہرگز ان کی فطرت میں داخل نہیں۔ قلم اور زبان دونوں ان کے قابو میں ہیں اور دونوں کو ان کی اطاعت گزاری پر فخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطباتِ جمعہ اور دروسِ قرآن سے بھی بے شمار لوگ مستفید ہوئے اور تحریر سے بھی تعلیم یافتہ طبقے نے خوب استفادہ کیا۔

### ایک دلچسپ انٹرویو

مسجد مبارک کے دورِ درس و خطابت (غالباً ۱۹۳۳ء) میں اسلامیہ کالج کے بعض متعلقین نے مولانا پر زور دیا کہ وہ کالج کی مجلس انتظامیہ سے درخواست کریں کہ انھیں کالج میں عربی پڑھانے کے لیے استاد مقرر کیا جائے۔ مولانا نے انکار کیا اور کہا کہ مسجد کے درس و خطابت کی ذمہ داری ہی میرے لیے کافی ہے، اس سے زیادہ میں کوئی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔ دوستوں نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا، میں درخواست نہیں دوں گا، البتہ اگر انتظامیہ اپنے طور پر میری خدمات حاصل کرنا چاہے تو غور کروں گا۔ بالآخر مولانا کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ انٹرویو بورڈ کے تین ممبر تھے، جن میں دو مولانا کے علم و ادراک اور ان کی قابلیت و صلاحیت سے بانہر تھے۔ ایک ممبر مولانا سے واقف نہ تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں ایک بڑے تعلیمی منصب پر فائز تھے اور کسی کو خاطر میں لانا انھیں گوارا نہ تھا۔ ان کے اور مولانا کے درمیان جو سوال و جواب ہوئے وہ ملاحظہ فرمائیے:

سوال : ”آپ مولوی فاضل ہیں؟“

جواب : ” نہیں “ !

سوال : ” کہاں کے فارغ التحصیل ہیں ؟ “

جواب : ” ندوة العلماء لکھنؤ کے “

سوال : ” عربی جانتے ہیں ؟ “

جواب : ” جی ہاں ! جانتا ہوں ! “

سوال : ” آپ میں اور پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل میں کیا فرق ہے ؟ “

جواب : ” فرق یہ ہے کہ آپ کی پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل مجھ سے عربی

پڑھتے ہیں ! “

سوال : ” آپ تقریر کر سکتے ہیں ؟ “

جواب : ” تقریر کرنا تو میرا معمول ہے ! “

سوال : ” کسی موضوع پر یا سچ منٹ تقریر کیجیے ۔ “

جواب : ” میں مقرر ہوں ، ایکٹر نہیں ہوں ۔ “

سوال : ” کیا مطلب ؟ “

جواب : ” مطلب واضح ہے ۔ میں اس انٹرویو بورڈ کے سامنے بیٹھا ہوں ، جسے

اسلامیہ کالج میں عربی کا استاد مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ، فلم سٹوڈیو میں

کسی ہدایت کار کے سامنے نہیں کھڑا ہوں جو اپنی فلم کے کسی حصے کے لیے

مجھ سے تقریر کرانا چاہتا ہو ۔ اگر آپ میری تقریر سننا چاہتے ہیں تو نماز

مغرب کے بعد مسجد مبارک میں میرے درس قرآن میں تشریف لائیے یا

جمعے کے روز میرے خطبہ جمعہ میں آئیے “

یہ الفاظ کہے اور السلام علیکم کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے ۔ ایک ممبر دوڑتے

ہوئے آئے اور کمرے میں واپس جانے کی درخواست کی ۔ فرمایا ” میں نے دوستوں

کے اصرار سے مجبور ہو کر اور آپ کی دعوت پر یہاں آکر سخت غلطی کی ہے اور اپنی

خود داری کو مجروح کیا ہے ۔ اب پھر واپس جا کر اپنی دینی اور علمی غیرت کی نفی نہیں کرنا چاہتا ۔

میرے لیے مسجدِ مبارک کا درس اور خطابت ہی بہت ہے، اور یہی کام میرے ذوق اور مزاج کے مطابق ہے۔  
**ملازمت کی پیش کشیں**

مسجدِ مبارک کے زمانہٴ خطابت میں مولانا ندوی کو ملازمت کی متعدد پیش کشیں ہوئیں۔ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار ”زمیندار“ اس زمانے میں بہت بڑا اخبار تھا، انھوں نے مولانا ندوی کو اس کے عملہٴ ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے بطریقِ احسن معذرت کر دی۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبد المجید سالک ان کے مخلص اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے، انھوں نے بھی اخبار ”انقلاب“ کے لیے کہا، مگر مولانا انہیں مانے۔ مولانا چرخِ حسن حسرت سے ان کے گہے مراسم تھے اور وہ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ انھوں نے کئی دفعہ ان سے کہا کہ وہ کسی اخبار میں ان کے اسلاف کا انتظام کرنے کو تیار ہیں، لیکن مولانا رضامند نہ ہوئے۔ مولانا ندوی کسی اخبار سے تعلق نہ قائم کرنے کی تین وجوہ بیان کرتے ہیں:

۱۔ روزانہ اخبار میں لکھنے سے مزاج علمی اور تحقیقی نہیں رہتا، خالص صحافیانہ سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور ہر وقت یہی سوچ ذہن پر مسلط رہتی ہے کہ آج یہ لکھنا ہے اور کل یہ لکھنا ہے۔

۲۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو بات کہنا مقصود ہو، وہ کہی نہیں جاسکتی اور جو کہنے کو جی نہ چاہے، وہ کہنا پڑتی ہے۔ قلب و ضمیر حالات کی مجبوریوں کی زنجیر میں جکڑے رہتے ہیں۔

۳۔ روزانہ لکھنے سے زبان و ادا کا معیار برقرار نہیں رہتا۔  
 مولانا کی یہ باتیں صحیح ہیں، لیکن میں چونکہ ان کے مزاج و طبیعت سے واقف ہوں، اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ دو وجہیں اور بھی ہیں جو ان کی کسی اخبار سے وابستگی اختیار کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی رہیں — ایک ان کی قناعت کہ جو کچھ تھوڑا بہت کہہ رہے ہیں، وہی کافی ہے اور اسی پر قانع ہیں — دوسرے ان کا روایتی

تکاسل اور طبعی تساہل، جس کی وجہ سے باقاعدہ روزانہ کسی خاص موضوع اور بر وقت لکھنے کی ذمہ داری کو نبامنا ان کے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ کوئی مضمون لکھوانے کے لیے انہیں بار بار کہنا پڑتا ہے اور وہ ہر وقت طرح دینے اور جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر لکھنے کے لیے مجبور ہو جائیں تو پہلے چائے پیتیں گے، پھر ذہن کو تیار کریں گے اور بڑی مشکل سے لکھنا شروع کریں گے۔ لیکن جب لکھنے بیٹھ جائیں تو پھر ذہن میں الفاظ و افکار کا سیلاب اُمنڈا آتا ہے اور وہ الفاظ و افکار نہایت دلکش اور دلاویز جملوں کی شکل میں سطحِ قرطاس پر بکھرنے اور نمودار ہونے لگتے ہیں۔

مولانا سے عام طور پر ایک نشست میں مضمون مکمل نہیں ہو سکتا۔ اکثر دو یا تین نشستوں بلکہ بعض اوقات دو تین دن میں مضمون تکمیل کی منزل کو پہنچتا ہے۔ لکھنے کے بعد بسا اوقات اس کے بعض حصے سناتے ہیں اور داد و طلب انداز سے پوچھتے ہیں، کیسا ہے؟ ٹھیک ہے نا، کوئی کمی تو نہیں رہی؟ پھر کہتے ہیں کاتب کو دے دو اور تاکید کر دو کہ صحیح صحیح لکھے، پروف ریڈنگ اچھی طرح کر لینا، کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ صحت کی ذمہ داری آپ پر ہے۔

اب مولانا ندوی کی ان تصنیفی و تحریری کاوشوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے آزادی ملک سے قبل یا اس کے بعد (ادارہ ثقافت اسلامیہ کے علاوہ) دیگر اداروں کے لیے کیں۔

### تفسیر سراج البیان

۱۹۳۴ء میں یا اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا نے ”تفسیر سراج البیان“ لکھی جو کشمیری بازار لاہور کے مشہور تاجر کتب ملک سراج الدین نے شائع کی۔ یہ تفسیر پانچ ضخیم جلدوں پر محیط ہے اور اپنے مضمولات و محمولات کے اعتبار سے نہایت عمدہ تفسیر ہے۔ کتابی شکل میں مولانا کا یہ پہلا علمی اور تحقیقی شاہ کار ہے۔ اس کی قبولیت عامہ کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یہ چودہ پندرہ دفعہ چھپ چکی ہے۔ آخری



بار ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ناشر کے پاس اس کا ایک نسخہ بھی نہیں ہے۔ بیس سال کے بعد اب یہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

تیس تیس سال میں کسی کتاب کا چودہ پندرہ مرتبہ چھپ جانا بہت بڑی بات ہے۔ میرا خیال ہے، اس قدر تھوڑی مدت میں اتنی مرتبہ قرآن مجید کی کوئی اردو تفسیر شائع نہیں ہوئی۔ یہ ریکارڈ اشاعت ہے۔

میر، اس سے زیادہ اس تفسیر کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس پر مولانا محمد سعید الرحمن علوی کا تفصیلی مضمون اس کتاب (ارمغانِ خفیف) میں چھپ چکا ہے۔ علوی صاحب نے یہ مضمون نہایت محنت اور عقیدت سے لکھا ہے اور تفسیر سراج البیان کا (دست یاب حصے کی روشنی میں) پورا تعارف کرادیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اور کوئی شخص اس تفسیر سے متعلق اس درجے مفصل اور جامع مضمون نہیں لکھ سکتا تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نہ تو مولانا کے پاس اس تفسیر کا کوئی نسخہ موجود ہے اور نہ اس کا اصل نام ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ یہ اس کا نام ”سراج التفسیر“ بتاتے تھے۔ یہ تو اللہ بھلا کرے علوی صاحب کا کہ انھوں نے اس کا سراغ لگایا، اس کے صحیح نام اور بعض مندرجات کا پتا چلایا اور اس پر جامع مقالہ سپرد قلم کیا۔

### مولانا فتح محمد جان دھری کے ترجمہ قرآن پر نظر ثانی

مولانا فتح محمد جان دھری کا ترجمہ قرآن، تراجم قرآن میں مستند اور مشہور و متداول ترجمہ ہے۔ اس کی طباعت کا مرحلہ پیش آیا تو مولانا فتح محمد وفات پا چکے تھے۔ شاید یہ بات انکشاف کی حیثیت رکھتی ہو کہ اس کے ناشر نے ترجمے پر نظر ثانی کے لیے مولانا محمد حنیف ندوی سے رجوع کیا۔ مولانا نے نظر ثانی کا کام شروع کیا تو مولانا جان دھری کے ورثا کو اس کا پتا چل گیا۔ انھوں نے اسے برا مانا اور کہا کہ یہ ترجمہ اتنا عمدہ ہے کہ اس پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں۔ ان میں سے بعض حضرات نے خود مولانا ندوی سے بھی اس قسم کے الفاظ کہے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ اگر اس کی اصلاح ہوگی تو اس کا کریڈٹ مترجم کو ملے گا، مجھے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہر حال مولانا نے نظر ثانی کا سلسلہ

جاری رکھا اور اس کے اکثر مقامات میں رد و بدل کیا۔ اس کے بعد جب مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کے وارثوں نے اسے دیکھا اور تبدیل شدہ مقامات پر نگاہ ڈالی تو انتہائی خوش ہوئے، مولانا ندوی کا شکریہ ادا کیا اور اعتراف کیا کہ یہ مقامات واقعی اصلاح طلب تھے۔

### مطالب القرآن فی ترجمۃ القرآن

قرآن مجید ہمیشہ مولانا ندوی کی دلچسپیوں کا محور رہا اور اس افشردہ نور اور کتاب ہدی کو سرلحمہ انھوں نے اپنا مرکز توجہ قرار دیے رکھا۔ کچھ عرصہ پیشتر ہم پر ان کی ایک اور قرآنی خدمت کا انکشاف ہوا۔

ہمارے کرم فرماؤں میں ایک بزرگ جناب شیر محمد سید ہیں، جنھیں قرآن مجید اور اس کے مضامین و مشمولات سے گہرا لگاؤ ہے۔ ایک دن راقم کے پاس تشریف لائے تو مولانا ندوی کی صحت کے بارے میں پوچھا اور پھر اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ میں تمھیں آج سے باون تریپن برس پیشتر کی قرآن سے متعلق مولانا کی ایک ایسی چیز دوں گا جو شاید اب تک تمھارے علم میں نہ آئی ہوگی۔ چنانچہ وہ دوسرے دن تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں ”مطالب القرآن فی ترجمۃ القرآن“ تھی جو لاہور کے ایک قدیم اشاعتی ادارے پیکو میٹڈ نے نہایت اہتمام سے خوب صورت انداز میں شائع کی تھی۔ یہ پیکو میٹڈ کے شائع کردہ عکسی قرآن مجید کی پہلی جلد ہے جو سورہ فاتحہ سے پانچویں پارے کے اختتام تک ہے۔ اس میں دائیں جانب کے صفحے پر قرآن مجید کا متن ہے اور بائیں طرف اس کا ترجمہ اور حاشیے میں تفسیر ہے۔ ترجمہ سید محمد شاہ ایم اے (عربی) کا ہے اور اس پر نظر ثانی مجلس فکر و نظر نے کی ہے جو تین بزرگوں پر مشتمل ہے اور ان کے اسمائے گرامی علی الترتیب یہ ہیں! مولانا محمد حنیف صاحب ندوی خطیب جامع مبارک لاہور، مولانا شہاب الدین صاحب فاضل دیوبند، خطیب جامع مسجد چوہدری لاہور اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی بریلوی بی، اے پرنسپل اشاعت اسلام کالج لاہور۔ نظر ثانی شدہ مسودے کی تصدیق کر کے واپس تیرہ علمائے کرام کے نام بھیجی اس میں

درج ہیں، اور وہ ہیں: علامہ سید سلیمان صاحب ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ مولانا محمد قطب الدین عبدالوالی صاحب فرنگی محل، لکھنؤ۔ مولانا حیدر حسن صاحب پرنسپل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی استاد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ مولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی لکھنؤ، سابق نائب ناظم جمعیتہ علمائے ہند۔ مولانا عبدالرحمن صاحب کاشغری۔ مولانا علی محمد جان صاحب لاہوری فاضل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ مولانا محمد غور شید علی صاحب سابق پروفیسر السنہ شرقیہ دارالعلوم لاہور۔ مولانا محمد عبدالعزیز صاحب جامع مسجد گوجرانوالہ۔ سید پیر ظہور شاہ صاحب قادری، سجادہ نشین جلال پوری۔ مولانا نجم الدین صاحب سابق ہیڈ مولوی اورینٹل کالج لاہور۔ مولانا محمد شبلی صاحب مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ خان بہادر شمس العلماء ڈاکٹر محمد ہدایت حسین صاحب ایم پی ایچ ڈی، پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ۔

”مطالب القرآن فی ترجمۃ القرآن“ کے نام سے پانچ پانچ پاروں میں یہ پوسے قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ اس وقت اس کی پہلی جلد ہمارے پیشِ نگاہ ہے، اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ البتہ جناب شیر محمد سید صاحب کے بقول یہ آج سے باون تریپن برس پہلے کا چھپا ہوا ہے۔ اس حساب سے اس کا سن اشاعت ۳۶-۱۹۳۵ء بنتا ہے اور مولانا محمد حنیف ندوی کا یہ جوانی کا زمانہ ہے۔ ان کی عمر اس وقت ستائیس اٹھائیس برس کی تھی۔

### صحیح بخاری کا اردو ترجمہ

۱۹۳۹ء میں مولانا ندوی کے مرحوم دوست ملک محرفیق نے مختلف علمی کتابوں کی نشر و اشاعت اور تراجم کے لیے لاہور میں ”شرکت علمی لمیٹڈ“ کے نام سے ایک کمپنی قائم کی۔ مولانا کا بھی اس کمپنی سے تعلق تھا۔ اس کمپنی کی طرف سے صحیح بخاری کے اردو ترجمہ کا منصوبہ تیار کیا گیا اور یہ اہم کام مولانا ہی کے سپرد ہوا۔ مولانا نے ”الاسوہ“ کے نام سے صحیح بخاری کے ترجمے اور جامع اردو شرح کا کام شروع کیا، لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ مولانا سے تو پتا نہیں چل سکا کہ صحیح بخاری کا ترجمہ کہاں تک ہو پایا تھا، لیکن ملک رفیق

مرحوم کے بڑے لڑکے خالد ملک نے بتایا کہ فل سکیپ کے کم و بیش ایک سو صفحات پر مشتمل ترجمے کا مسودہ ان کے والد مرحوم کے پاس موجود تھا۔ صحیح بخاری کے ترجمے اور شرح کا یہ کام غالباً پانچ پاروں تک ہوا تھا۔ یہ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔

صحیح بخاری کا ترجمہ اور جامع اردو شرح

صحیح بخاری کے اردو ترجمے اور اس کی جامع شرح کا یہ اہم سلسلہ مولانا محمد حنیف ندوی نے شرکت علمی لمیٹڈ (لاہور) کی طرف سے ۱۹۳۹ء میں شروع کیا تھا۔ یہ کمپنی غالباً ۱۹۵۰ء میں ختم ہو گئی تھی۔ کام کی ابتدا صحیح بخاری کے پہلے باب سے کی گئی تھی۔ یعنی ”باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ ترجمے اور شرح کا نام ”الاسوہ“ رکھا گیا تھا اور طے پایا تھا کہ ترجمہ اور شرح کا ہر پارہ الگ الگ شائع ہوگا اور ہر تین ماہ بعد ایک پارہ ضرور خریداروں تک پہنچ جائے گا۔

اس ترجمہ و شرح کی پہلی حدیث جو بطور نمونہ شائع کی گئی تھی، اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے سرورق پر یہ الفاظ مرقوم ہیں :

شرکت علمی لمیٹڈ کا پہلا عظیم الشان کارنامہ

یعنی

صحیح بخاری کی جامع اردو شرح

الْأُسُوَّةُ

از

مولانا محمد حنیف ندوی، خطیب جامع مبارک، لاہور

ناشر

شرکت علمی لمیٹڈ - ۹۹ سرکلر روڈ - لاہور

دوسرے صفحے پر ”الاسوہ“ کی خصوصیات شائع کی گئی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

- ۱۔ عربی اور اردو کی کتابت خوش نما، شگفتہ اور فنی حُسن کا بہترین نمونہ۔
  - ۲۔ ترجمہ رواں دواں، نہ اتنا لفظی کہ اس میں ادبی محاسن کا اظہار نہ ہو سکے، نہ اتنا بامحاورہ کہ نفس مطلب ہی مفقود ہو۔
  - ۳۔ اگر ایک لفظ مختلف معانی کا متحمل ہے تو کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ بھی اس اختلاف کا متحمل ہو۔
  - ۴۔ امام بخاری کا خاص فن ترجمۃ الباب کی مناسبتیں ہیں۔ اس کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔
  - ۵۔ رجال پر اس حیثیت سے بحث ہے کہ ان کے زہد و ورع یا عملی زندگی میں ہمارے لیے کیا درس پنہاں ہے۔
  - ۶۔ مطالب میں تنوع کا خیال رکھا گیا ہے، یعنی صرف مسائل ہی نہیں بیان کیے گئے ہیں بلکہ حدیث جن جن ادبی، اخلاقی، نفسیاتی اور اصلاحی نکات پر مشتمل ہے، ان کی بھی تشریح کی گئی ہے۔
  - ۷۔ شروح حدیث میں ابن حجر کی دستوں اور عینی کی نکتہ سنجیوں سے برابر استفادہ کیا گیا ہے۔
  - ۸۔ فقہی مدارس فکر میں تطبیق و رفع نزاع کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے اور بغیر کسی تنقید کے نفس حدیث کی اہمیت کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔
  - ۹۔ مخالفین حدیث جہاں جہاں ہو سکتے ہیں، ان مقامات کی خصوصیت سے وضاحت کی گئی ہے۔
  - ۱۰۔ امام بخاری کی اپنی تبویب کے علاوہ مطالب کی ایک الگ تبویب بھی قائم کی گئی ہے تاکہ خورشید نبوت کی ضوفشائیاں پوری طرح جلوہ گر ہو سکیں۔
- اس سے آگے حدیث اور ترجمہ و تشریح ملاحظہ ہو:

”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“

وحی کی ابتدا

بَدْءُ الْوَحْيِ

باب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز

باب کَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ

اِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ  
 وَقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ  
 اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا  
 اِلَى نُوحٍ وَالتَّيْمَنِ مِنْ بَعْدِهِ (الایہ)  
 حَدَّثَنَا الْحُمَیْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا  
 سُفْيَانُ  
 قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰی بْنُ سَعِيدٍ الْاَنْصَارِيُّ  
 قَالَ اَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيُّ  
 اَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاسٍ اللَّيْثِيَّ  
 يَقُولُ  
 سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ  
 اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُولُ  
 سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ  
 وَسَلَّمَ يَقُولُ  
 اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ  
 وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوَى  
 فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى دُنْيَا  
 يُصِيبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاةٍ يَتَّكِحُهَا  
 فَهِجْرَتُهُ اِلَى مَا هَاجَرَ الْبَدَ

کیونکر ہوا؟  
 نیز اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر کہ  
 اے پیغمبر! ہم نے تمہاری طرف وحی اسی طرح بھیجی  
 جیسے طرح نوح اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی طرف بھیجی۔ (نبیاء: ۱۷۳)  
 ہم سے حمیدی نے بیان کیا، ان سے سفیان  
 نے بیان کیا،  
 ان کو یحییٰ بن سعید انصاری نے کہا۔  
 ان کو محمد بن ابراہیم التیمی نے خبر دی۔  
 اور انھوں نے علقمہ بن وقاص لیثی سے سنا۔  
 وہ کہتے تھے۔  
 میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو  
 منبر پر یہ کہتے سنا کہ  
 میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا  
 آپ نے فرمایا  
 اعمال کا تعلق تو نیتوں سے ہے۔  
 ہر شخص وہی کچھ پائے گا جو اس کے دل میں ہے۔  
 سو جس نے ہجرت ذیوی مقصد کے پیش نظر کی  
 یا اس لیے مہاجر بنا کہ کسی عورت سے شادی کر لے۔  
 تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ہجرت اسی کام  
 کے لیے ہوگی۔

رجال

حمیدی المتوفی ۲۱۹ھ ابو بکر بن عبد اللہ بن زبیر بن علی۔ بنی اسد کی ایک شاخ  
 حمید بن اسامہ کی طرف منسوب۔

سفیان، ابن عیینہ ابن عمرو الہمالی۔ المتوفی ۲۱۹ھ، کوئی المولود، مکی الاصل، زہری، عمرو بن دینار اور شعبی ایسے ستر جلیل القدر تابعین سے شرفِ سماعت حاصل ہوا۔ ان سے سفیان ثوری، احمد بن حنبل، شافعی اور ابن المدینی جیسے ائمہ حدیث نے روایت کی۔

امام شافعی کا قول ہے کہ علما میں جو شان ہوئی چاہے وہ صرف ابن عیینہ کا حصہ ہے، یعنی فتوے میں بے حد احتیاط اور تفسیر و حدیث پر بے مثل عبور۔

احمد بن عبد اللہ کہا کرتے تھے، ابن عیینہ علمائے اہل حدیث میں سے ہیں۔

یحییٰ القطان کا اعتراف یوں منقول ہے کہ برابر چالیس برس سے اقلیم علم میں انہی کا سکہ رواں ہے۔ سفیان ثوری ان کی مجلس میں جب تک بیٹھتے فرطِ ادب سے حدیث بیان نہ کرتے۔

ابو یوسف غسولی ان کے زہد و ورع سے متعلق اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب ان کے ہاں گیا، کھانے کے وقت جو کی دوہلی چھلکی روٹیاں ان کے سامنے رکھی ہوئی پائیں۔ فرماتے تھے برسوں سے یہی غذا ہے۔

یحییٰ بن سعید الانصاری المتوفی ۱۴۳ھ۔ بہت بڑے امام، مدینہ کے قاضی۔ منصور نے انھیں عراق بھیجا تو وہاں بھی زمامِ قضا انہی کے ہاتھ میں رہی۔ انس بن مالک، سائب بن یزید، عبد اللہ بن عامر، محمد بن ابی بکر وغیرہ سے روایت کی۔ اوراعی، ابن جریر، حمید الطویل، مالک، سفیان، حماد، لیث، ابن المبارک اور یحییٰ بن سعید القطان نے ان کے حلقہٴ درس سے استفادہ کیا۔

### حدیث اعمال اور ترجمۃ الباب

امام بخاری مختلف ابواب و فصول کے ماتحت احادیث کے اندراج میں عجیب جودت و جدت کا اظہار فرماتے ہیں۔ بسا اوقات ایسی احادیث لے آتے ہیں، بظاہر جن کا ترجمۃ الباب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یا ذہن آسانی سے ادھر منتقل نہیں ہو پاتا۔ غور و فکر سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کوئی باریک اور جامع بات کہنا چاہتے ہیں۔

ان کے پیش نظر کچھ معارف و نکات ہیں، جن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مگر وقت کا فقہی ذوق انھیں مجبور کرتا ہے کہ تبویب کا جو انداز متعارف ہے وہ قائم رہے۔ اس لیے ایسے نوادر و مصارح حکمیہ کے لیے بجائے الگ باب و عنوان قائم کرنے کے، سیاق حدیث ہی میں جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔ حدیثِ اعمال اسی قبیل سے ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد کی تمام احادیث کا تعلق وحی کی مختلف کیفیتوں سے ہے اور اس کے بعد پوری کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی بوقلموں جلوہ فرمائوں کا تذکرہ ہے۔ دو باتیں یہاں ذہن میں آتی ہیں۔

ایک یہ کہ امام بخاری کا مطلب اس حدیث کے اندراج سے یہ ہے کہ طالبِ حدیث یہ جان لے کہ احادیثِ رسول کی یہ چمن آرائی و دل آویزی صرف انہی لوگوں کے مذاقِ حسن کی تسکین کا سامان پیدا کر سکے گی، جو اس کا مطالعہ خلوص و عقیدت سے کریں گے اور ان احادیث کو اس لیے پڑھیں گے تاکہ اپنی زندگی کو ان سانچوں میں ڈھال سکیں۔ لہذا حدیث کے مطالعہ و درس سے پہلے طالبِ سنت کو اپنے مقصد و ارادہ کی تصحیح کر لینی چاہیے

دوسری بات یہ کہ حدیث کی یہ پوری کتاب دراصل ترجمانی ہے آنحضرت کے اسوۂ پاک کی، اور اسوۂ پاک کی ساری عظمت صرف اس حقیقت میں منحصر ہے کہ آپ کی زندگی کے کسی گوشے میں ریاکاری و تصنع کا وجود نہیں۔ زہد و عبادت کے نازک مسائل سے لے کر عادات و اخلاق تک کی تمام باریکیوں تک، آپ کو کسی مقام پر یہ محسوس نہیں ہوگا کہ کوئی ادا یا کوئی بات ایسی ہے جس کو موقع و مقام کی مناسبتوں کے پیش نظر محض دکھاوے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ جو کچھ ہے واقعی حقیقی ہے۔ آپ کی زندگی میں کئی مواقع ایسے آئے ہیں جہاں اگر آپ چاہتے تو ایک خاص طرزِ عمل اختیار کر سکتے تھے اور شاید وقتی مصلحتوں کے اعتبار سے وہ موزوں بھی ہوتا۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی مثالیں اور تفصیلات آگے آئیں گی، جن سے آپ کو آنحضرت کی بلندیوں کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ امام بخاری کی غرض بھی یہی ہے۔ وہ اسی لیے اس حدیث کو اس سیاق میں لائے ہیں تاکہ آنحضرت کی زندگی کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے



آپ کے ہاتھ میں ایک معیار اور کسوٹی ہو۔ آپ اس کسوٹی سے اسوۂ پاک کی تمام ان جزئیات کی بحث کا جائزہ لے سکیں گے جن کا تذکرہ آیتہ سینکڑوں ابواب میں آئے گا

### حدیث اعمال کی اخلاقی حیثیت

ان فقہی تفریعات و مسائل سے قطع نظر جو صرف اس ایک حدیث سے ترتیب پلتے ہیں، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس میں ایک اخلاقی اصول مضمون ہے، اس میں انسان کی عملی زندگی کے لیے ایک بلند تر معیار پیش کیا گیا ہے۔ عام طور پر مذاہب و اخلاق کے مختلف مدرسوں نے خیر و شر کی بحث کرتے ہوئے صرف اعمال کے ظواہر پر نظر رکھی ہے اور صرف قشر و جلد کو دیکھا ہے۔ اس لیے قدرتنا نیکی و برائی کے لیے انھوں نے اعمال کی فحاشی و تحمیل ان کے نتائج و عواقب کو کسوٹی قرار دیا ہے، اس سے قطعی بحث نہیں کی کہ اعمال کے اس باطنی شعور کو ٹٹولا جائے اور انسان کے دیرپے دل میں جھانک کر دیکھا جائے کہ خود اس کے نزدیک اعمال کن محرکات کا نتیجہ ہیں۔ اس نقطہ نظر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاقیات کو عملی زندگی میں کوئی مضبوط اساس نہ مل سکی اور وہ محض ایک فن ہو کر رہ گئے۔ اس حدیث میں جس باطنی شعور اور بلند تر اخلاقی اساس و معیار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اخلاص ہے۔ یعنی یہ جذبہ پنہاں کہ آپ کے اعمال کا سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے قصد و ارادہ سے قائم ہے اور اس میں ریاکاری اور دکھاوے کو کوئی دخل نہیں۔ یہ حدیث ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اعمال کا ظاہری رنگ و روغن حسن نہیں، اصل حسن اخلاص میں ہے۔ یہاں دل کی دنیا میں اگر اس کا دور دورہ ہے تو پوری عملی زندگی مرتفع ہے، ورنہ بڑے سے بڑا عمل محض بے کار ہے۔

”الاعمال“ کے مقابلے میں ”نیات“ کو بصورت جمع کیوں لایا گیا ہے؟

اس میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ ہر ہر عمل کے لیے اس کے شایان شان نیت کی ضرورت ہے، یعنی عمل جس قدر بڑا اور قریب العین جس نسبت سے عظیم ہوگا، اسی انداز سے نیت و قصد میں عظمت و استواری پیدا کی جائے گی۔ اتنا ہی اسے ریا کے شائبوں

سے جدا رکھا جائے گا اور اسی نسبت سے اُسے عزم و اذنان کی ضرورتوں سے بہرہ مند کیا جائے گا۔  
ایک نفسیاتی شبہ اور اُس کا جواب

یہ مان لینے کے بعد بھی کہ عمل سے پہلے نیت کا تذکرہ اور ارادے کی تطہیر ضروری ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قلب و دماغ کے وساوس و خطرات کب ہمارے اختیار میں ہیں؟ کیونکہ ممکن ہے کہ ہم قلب و دماغ کو پوری یکسوئی کے ساتھ ایک راستے پر ڈال دیں اور اسے زیادہ سمعہ کی پکڑ ٹیڈیوں پر ادھر ادھر نہ بھٹکنے دیں۔ یہ تو البتہ ہمارے قابو کی بات ہے کہ ہم اخلاص و حسن نیت پیدا کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کریں اور ہر کام کے لیے صرف اللہ کی خوشنودی کو اپنے سامنے رکھیں مگر یہ بات قطعی ہمارے بس میں نہیں کہ دل و دماغ کی فطرت کو بدل دیں اور اسے مجبور کریں کہ ایک وقت میں وہ صرف ایک ہی خیال و داعیہ سے متاثر ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام انسان کی اس بے چارگی و بے بسی کو سچا جانتا ہے۔ حدیث کا یہ منشا نہیں کہ کوئی کام کرتے وقت آپ کا دل تجرید کی اُس کیفیت سے بہرہ مند ہو کہ ریا کاری دُنیا طلبی کا کوئی جذبہ کسی مقدار میں دل میں موجود نہ ہو بلکہ صرف یہ ہے کہ عمل کا اہلی محرک، داعیہ غالب، قصدِ راجح جس سے متاثر ہو کر اور مجبور ہو کر آپ کوئی قدم اٹھاتے ہیں، اس کی بنیاد اخلاص پر ہو۔ باقی رہی نفس کی کشاکش تو یہ قدرتی ہے، اس کے لیے آپ سے باز پرس نہیں۔ یہ صحیح بخاری کی ایک حدیث کی شرح ہے جو مولانا نے کی اور ہمیں مل سکی۔ اس کے علاوہ افسوس ہے ہمیں کچھ نہیں ملا۔

گاندھی جی کی سیوا میں شردھا کے پھول

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ تھا جو مولانا نے مسجدِ مبارک کے زمانہ درس و خطابت میں لکھا تھا اور مسجد کی انجمن نے شائع کیا تھا۔ یہ ہندی نما اردو میں تھا۔ اس میں ان کے مخاطب گاندھی جی تھے، جنہیں بتایا گیا تھا کہ اسلام عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور اس کے احکام بدرجہ غایت صاف ستھرے اور مزاجِ انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔ اس میں دلکش اسلوب میں گاندھی جی کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور ثابت کیا گیا تھا کہ انسانی آتما کو شانتی سے ہم کنار کرنے کا اصل ذریعہ اسلام ہے۔ اس سے دل لگانا اور اُسے من لسانا دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا باعث ہے۔

یہ رسالہ میں نے آزادی سے تھوڑا عرصہ پہلے دیکھا اور پڑھا تھا۔ بڑے ہی من موہنے انداز میں لکھا تھا۔ مولانا کے پاس حسبِ عادت و معمول اس کی کوئی کاپی نہیں ہے، کسی دوسری جگہ سے بھی یہ مل نہیں سکا۔

### مجبوریاں

پول ہرفیو فرانس کا کامیاب تمثیل نگار ہے۔ ”مجبوریاں“ اس کی مشہور کہانی ہے۔ اس میں بنیادی خیال یہ پیش کیا گیا ہے کہ زندگی کی کچھ ناگزیر تلخیاں ایسی ہیں، جنہیں کوئی خیال آرائی دور نہیں کر سکتی۔ اس کی رائے میں زندگی بسر کرنے کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ اسے بہر حال قبول کر لیا جائے۔ یعنی اپنی انفرادی عقل اور اجتماعی ضابطہ و قانون پر بھروسہ کیے بغیر زندگی کے فطری ہموار کا ساتھ دیا جائے اور اس طرح کا متوازن اور معتدل طریقہ اختیار کیا جائے جو اذیت رسا نہ ہو۔ زندگی سے متعلق اس کا نظریہ یہ ہے کہ کوئی انسانی یا غیر انسانی ضابطہ اس لائق نہیں ہے، جو اس کے پورے چوکھٹے کو خوش نہ بنا دے۔ سوائے اس کے چارہ نہیں کہ انسان، حیاتِ انسانی کی تلخیوں کو ناگزیر سمجھ کر ان سے تعاون کا راستہ تلاش کرے اور تحمل و بردباری سے کام لے۔

”مجبوریاں“ میں خصوصیت سے مسئلہ طلاق پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عیسائی معاشرے میں طلاق جن شرائط کے ساتھ مشروط ہے، وہ انتہائی تکلیف دہ اور ضرر رساں ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ کسی سماجی مشکل کے حل پر قادر نہیں، بلکہ بجائے خود ایک مشکل ہے اور سخت قسم کے الجھاؤ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

کہانی دراصل ایک پیرایہ بیان سے تعبیر ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے میں جو پیچیدگی پائی جاتی ہے، اسے منظرِ عام پر لایا جائے اور بتایا جائے کہ اس کا حل کیا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ ایک افسانہ نگار جس آسانی سے مشکل سے مشکل حقائق کو دل میں اتار دیتا ہے، بسا اوقات ایک بڑے سے بڑا حکیم اور مصلح

بھی اس سے عاجز رہتا ہے۔ پڑھنے والے کے احساسات یہ ہوتے ہیں کہ زندگی کے کئی باریک اور نازک گوشے ایک خاص ترتیب کے ساتھ خود بخود اس کے سامنے آ رہے ہیں۔

پول ہرفیو کی کہانی — مجبوریاں — فرانسیسی زبان میں ہے۔ عربی کے ممتاز ادیب اور مصنف ڈاکٹر طلحہ حسین نے اسے فرانسیسی سے ”لمحظات“ کے نام سے عربی میں منتقل کیا اور مولانا محمد حنیف ندوی نے اسے عربی سے اردو کا جامہ پہنایا۔ مولانا نے قیام پاکستان سے قبل اس کا آزاد ترجمہ کیا تھا، یہ ترجمہ انھوں نے سب سے پہلے جولائی ۱۹۵۰ء میں (جب کہ میں ان کے ساتھ ہفت روزہ

”الاعتصام“ میں بطور معاون مدیر کام کرتا تھا) مجھے دکھایا تھا۔ یہ صاف شدہ مسودہ فل سکیپ کے کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ مولانا نے بتایا تھا کہ بعض ناشرین نے اشاعت کے لیے ان سے یہ مسودہ بار بار مانگا، لیکن وہ نہیں چاہتے کہ ایک کہانی کے اردو مترجم کی حیثیت سے ان کا نام آئے۔ لاہور میں بھی ان کے گھر میں دو تین مرتبہ یہ مسودہ میں نے دیکھا۔ اب اس مضمون کے سلسلے میں اس کی ضرورت پڑی تو میری انتہائی ذاتی کوشش اور تلاش کے باوجود مل نہیں سکا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہوا — مطبوعہ شکل میں وہ کم سے کم تین سو صفحات کی کتاب ہو سکتی ہے۔

یہ ہیں مولانا ندوی کی وہ تصنیفی خدمات جو انھوں نے قیام پاکستان سے قبل انجام دیں۔ اب مندرجہ ذیل سطور میں یہ بتایا جائے گا کہ آزادی ملک سے پہلے انھوں نے کن کن ماہانہ اور ہفت روزہ رسائل و جرائد میں فرائضِ ادارت سرانجام دیے۔

”حقیقتِ اسلام“ لاہور

لاہور میں ”پیکو لیڈ، موجی دروازہ“ کی طرف سے ”حقیقتِ اسلام“ کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ ۲۰×۳۰ کے چالیس صفحات پر مشتمل تھا۔ سرورق اور کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ اس میں قرآن اور اسلام سے متعلق تحقیقی اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ”مدیر مسئول ماسٹر محمد احسان“ تھے۔ مولانا ندوی کافی عرصہ اسے ایڈٹ کرتے رہے۔ تلاشِ بسیار کے بعد

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے عتیقی کلکشن سے اس کا سرف ایک شمار دل سکا ہے جو جنوری - ۱۹۳۷ء کا ہے اور اس پر ”جلد ۱۱۔ شمارہ ۱“ لکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۷ء سے اس کی گیارہویں جلد شروع ہوئی اور اس جلد کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ اس میں مولانا ندوی کا ایک مضمون چھپا ہے، جس کا عنوان ہے ”اسلام، میزان عقل و فلسفہ میں“ مضمون نگار کی حیثیت سے مولانا کا نام لکھا ہے ”از جناب علامہ محمد حنیف ندوی“۔ عنوان کے نیچے بریکٹ میں مرقوم ہے ”گزشتہ سے پیوستہ“ مضمون کے آخر میں تحریر ہے۔ (باقی باقی) یعنی اس مضمون کی ایک یا ایک سے زائد قسطیں ۱۹۳۶ء کے ”حقیقت اسلام“ میں بھی چھپی ہیں اور جنوری ۱۹۳۷ء کے بعد بھی شائع ہوئی ہیں۔ یہ مضمون صفحہ ۱۸ سے ۲۳ تک چھ صفحات پر مشتمل ہے اور مسلسل مضمون ہے۔ زبان و انداز اور معلومات کے اعتبار سے نہایت عمدہ۔ ایک دن ایسے مولانا سے عرض کیا کہ ”حقیقت اسلام“ میں آپ کو ”علامہ“ لکھا گیا ہے فرمایا معلوم نہیں اس زمانے میں لفظ ”علامہ“ کو میں نے اپنے لیے کیونکر گوارا کر لیا۔

”حقیقت اسلام“ کا مستقل ادارتی عنوان ہے ”حال و قال“ ادارے کے آخر میں چوکھٹے میں لکھا گیا ہے کہ ”۱۳۔ دسمبر ۱۹۳۶ء کو برکت علی محمدن ہال (لاہور) میں مجلس اشاعت اسلام کا جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا نصر اللہ خاں عزیز اور مولانا یوسف سلیم چشتی نے قرآن کے مختلف عنوانات پر تقریریں کیں۔ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا اور تقریریں نہایت غور اور دلچسپی سے سنی گئیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ مجلس اشاعت قرآن کی طرف سے جلسوں کا سلسلہ آئندہ جاری رہے گا۔“

ان بزرگوں میں سے ملک نصر اللہ خاں عزیز نے ۲۔ جولائی ۱۹۷۶ء کو اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ۱۱۔ فروری ۱۹۸۳ء کو لاہور میں وفات پائی۔

### دیباچہ — مسلمان عورت

مولانا ابوالکلام آزاد نے پندرہ سال کی عمر میں، علامہ شبلی کے کہنے پر مصر کے مشہور

عالم فہرید وجدی کی عربی کتاب ”المرآة المسلمة“ کا اردو ترجمہ ”مسلمان عورت“ کے

عنوان سے کیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے، یہ ترجمہ شدہ کتاب میں نے پہلی دفعہ ۱۹۳۹ء میں دیکھی اور خرید کر پڑھی تھی۔ یہ کتاب (مسلمان عورت) لاہور کے کئی اداروں نے شائع کی۔ اس وقت میرے سامنے ”ایم ثناء اللہ خاں، ریلوے روڈ، لاہور“ کی شائع شدہ کتاب ہے۔ اس پر مولانا محمد حنیف ندوی کاتین صفحات کا دیباچہ اور مولانا ابوالکلام (مترجم) کا مقدمہ ہے۔ کتاب پر سنِ طباعت مرقوم نہیں۔

”اسلامی زندگی“ — لاہور

شرکت علمی لیبڈ، لاہور (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا گیا تھا، اس کا نام خود مولانا ندوی نے تجویز کیا تھا، ”اسلامی زندگی“ اس کے پرنٹر پبلشر ملک محمد رفیق (ادبستان لاہور) تھے۔ ادارت کے فرائض مولانا کے سپرد تھے۔ یہ ایک علمی اور تحقیقی رسالہ تھا۔ افسوس ہے یہ زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس کا کوئی شمارہ مولانا کے پاس تو نہیں ہے، البتہ ملک رفیق مرحوم کے صاحب زادوں (ملک خالد، ملک عبدالواحد اور ملک عبدالمتین) کے پاس اس کے بعض شمارے موجود ہیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا کے پاس رسالہ ”حقیقت اسلام“ اور ”اسلامی زندگی“ کا نہ صرف یہ کہ کوئی شمارہ نہیں ہے، ان رسالوں کے نام بھی ان کے ذہن میں محفوظ نہیں تھے۔ یہ نام میں نے یاد کرائے تو ان کے ذہن میں آئے۔

ہفت روزہ ”مسلمان“ — سوہدرہ

مولانا عبدالمجید خادیم سوہدروی جماعت اہل حدیث کے مشہور عالم اور مقرر تھے۔ مختلف موضوعات سے متعلق انھوں نے چھوٹی بڑی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی وفات ۶۔ نومبر ۱۹۵۹ء کو ہوئی۔

مولانا عبدالمجید ایک ہفت روزہ اخبار — ”مسلمان“ — اپنے وطن سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ) سے نکالتے تھے۔ آزادی وطن سے کچھ عرصہ پیشتر انھوں نے مولانا حنیف ندوی سے کہا کہ وہ اس اخبار کی ترتیب و ادارت میں ان سے تعاون کریں۔ مولانا نے ہامی بھری اور ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ مولانا ندوی اس اخبار کو خالص

علمی خطوط پر چلانا چاہتے تھے۔ بہر حال دونوں میں اختلافِ ذوق و مزاج کی بنا پر یہ سلسلہ اشتراک دو مہینے سے زیادہ نہیں چل سکا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ”مسلمان“ کے جن شماروں میں مولانا ندوی کے مضامین اور اداریے شائع ہوئے، وہ ان کے پاس نہیں ہیں۔

### ہفت روزہ ”الاخوان“ گوجرانوالہ

جون ۱۹۴۷ء میں گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث نے ایک ہفت روزہ اخبار — الاخوان — جاری کیا۔ مولانا حنیف ندوی کو اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ لیکن اس زمانے میں ملک کے سیاسی حالات اس درجے خراب ہو گئے تھے کہ ”الاخوان“ کا صرف ایک ہی شمارہ شائع ہو سکا۔ وہ شمارہ پہلا بھی تھا اور آخری بھی! —

### ادارہ ”اسلام کی تعمیر نو“

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جب نواب افتخار حسین (آف ممدوٹ) پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے، علامہ محمد اسد (جرمن) نے حکومت پنجاب کے کہنے سے اسلام کی تعمیر نو (ری کنسٹرکشن آف اسلام) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس کا دفتر لاہور میں اس مقام پر تھا جہاں اب پنجاب اسمبلی کے ارکان کی اقامت گاہ پیل ہاؤس ہے۔ یہ سرکاری ادارہ تھا۔ علامہ محمد اسد نے مولانا غلام رسول مہر کے مشورے سے مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات اس کے لیے حاصل کی تھیں۔ یہ ادارہ غالباً ایک سال ہی قائم رہا۔ اس زمانے میں پنجاب کا گورنر انگریز تھا، جس کا نام سرفرانسس موڈی تھا۔ اس نے یہ ادارہ توڑ دیا تھا۔ اس ادارے کو کسی قسم کا تصنیفی اور علمی کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

### ہفت روزہ ”الاعتصام“

ہفت روزہ ”الاعتصام“ کا ڈیکلریشن قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء کے آخر یا ۱۹۴۸ء کے شروع میں گوجرانوالہ سے جماعت اہل حدیث کے جید عالم مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے داخل کرایا تھا جو فیروزپور سے نقل مکانی کر کے ضلع گوجرانوالہ کے

ایک قصبہ گوندلانووالہ میں فروکش ہوئے تھے۔ ڈیکلریشن منظور ہوا تو مولانا محمد اسماعیل صاحب کے کہنے سے یہ اخبار انھوں نے گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث کو دے دیا اور اس کے اخراجات کی ذمہ دار وہی جماعت تھی۔ ارکانِ جماعت کے مشورے سے اس کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی کو بنایا گیا۔ مولانا ندوی کی ادارت میں ”الاعتصام“ کا پہلا شمارہ ۱۹- اگست ۱۹۴۹ کو معرضِ اشاعت میں آیا۔ پھر ضروری انتظامات کے لیے ایک مہینہ اس کی اشاعت ملتوی رہی۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۹ سے یہ اخبار ہر جمعے کو باقاعدہ شائع ہونے لگا۔ ۱۲- نومبر ۱۹۵۰ کو اسے مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تحویل میں دے دیا گیا اور اس سے کچھ عرصہ بعد یہ اخبار گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا۔ شیش محل روڈ پر اس کا دفتر تھا۔ اب اس کی آمدنی اور خرچ کی ذمہ دار مرکزی جمعیت اہل حدیث تھی۔ مجھے ابتدا ہی سے اس اخبار میں مولانا ندوی کا معاون مقرر کیا گیا تھا۔

اس زمانے میں ”الاعتصام“ جماعت اہل حدیث کا پہلا اور آخری اخبار تھا، جس نے پہلی ڈگر سے ہٹ کر جماعت کے عمل و حرکت کے لیے نئی راہوں کی نشان دہی کی اور ان خطوط پر قدم زن ہونے کی دعوت دی جو اس کی شان کے شایاں تھے اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں جن کو اپنانا ناگزیر تھا۔

مناظرانہ بحثوں، مجادلانہ تھمیلوں اور مخاصمانہ الجھنوں سے اس اخبار کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کا انداز منفی نہ تھا، مثبت تھا۔ اس نے جماعت اہل حدیث کو نئے ذہن سے آشنا کرایا، نیا فکر عطا کیا، نئے اسلوبِ اظہار کی طرح ڈالی اور اپنے قارئین کو نئے طرزِ کلام سے متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے علمی مضامین، تحقیقی ادارے اور سیاسی شذرات دوسری جماعتوں کے رسائل و جرائد بھی نقل کرتے تھے اور پاکستان اور ہندوستان کے روزنامے بھی ان کو اپنے صفحات میں نمایاں جگہ دیتے تھے۔

اُس عہد کے ”الاعتصام“ میں خالص عالمانہ اور محققانہ مقالات چھپتے تھے، ملک کے سیاسی حالات پر بھرپور تبصرے ہوتے تھے، ادبی مضامین معرضِ اشاعت میں آتے تھے، بزرگانِ دین اور علمائے کرام کے حالات و سوانح سے اس کے صفحات مزین



ہوتے تھے اور بہت سے مشہور شعرا اپنا تازہ کلام بھیجتے تھے جو اس اخبار میں شائع کیا جاتا تھا۔ جماعت میں اندرونی علمی اور تنظیمی جھگڑے اس وقت بھی تھے، لیکن ”الاعتصام“ میں ان کو اچھالنے اور ان پر رائے زنی سے ہمیشہ احتراز کیا گیا۔

اس زمانے کے ان مضامین و مقالات اور اداریوں اور شذرات کی اگر فہرست تیار کی جائے جو مولانا ندوی نے تحریر کیے تو بہت سے صفحات میں پھیل جائے۔ اختصار کے پیش نظر یہاں صرف چند مضامین کے عنوانات درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ۱۹۔ اگست ۱۹۴۹ء کے (پہلے شمارے) سے لے کر ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء

تک کے شماروں میں ”سیر و سوانح“ کے عنوان کے تحت فقہ کے ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کے مختصر حالات تحریر کیے۔

۲۔ ۲۔ نومبر ۱۹۴۹ء کے شمارے سے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کے شمارے تک

ائمہ حدیث میں سے علی الترتیب امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابو داؤد اور امام ابن ماجہ پر تعارفی مضامین ضبط کتابت میں آئے۔

۳۔ ۳۰۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کے شمارے سے ”ختم نبوت اور اس کے حدود

اطلاق — ایک نیا جائزہ“ کے دہرے عنوان سے ایک نیا سلسلہ مضمون شروع کیا، جس کی آخری اور انیسویں قسط ۱۲۔ مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں چھپی۔

۴۔ ۱۹۔ مئی ۱۹۵۰ء کے ”الاعتصام“ میں ”حدیث معراج“ کے عنوان

سے معراج سے متعلق ایک نہایت عمدہ مضمون سپرد قلم کیا۔

۵۔ ”رؤیت ہلال — اسلام نے قمری نظام کیوں قائم کیا؟“ ۹ جون ۱۹۵۰ء

کے شمارے میں چھپا۔

۶۔ ۲۵ اگست ۱۹۵۰ء سے ایک اور سلسلے کا آغاز کیا۔ اس کا مستقل

عنوان تھا۔ ”قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر“ اس کے شروع میں مندرجہ ذیل نوٹ لکھا:

”یہ فخر صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ قریب قریب ہر ہر زمانے میں، ہر ہر

قطرہ خیال سے اس پر غور کیا گیا ہے اور علوم و فنون کی بوقلمونی کے ساتھ اس کے عمق و گہرائی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم ان تمام خواصانِ بحرِ معانی کو اعتراف ہے کہ کہیں بھی یہ حضرات اس کو اتھلا نہیں پاسکے۔ سیکڑوں اور ہزاروں شناساؤں نے اس سمندر میں غوطہ زنی کی اور ہمیشہ معنی و مقصود کے موتیوں سے دامنِ طلب بھر بھر کر ساحل پر آئے، مگر اس پر اس کے خزانوں میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ یقین جانیے کہ اس کی ہر موج اور اچھال میں اب بھی اتنی دولت پنہاں ہے کہ پوری کائناتِ انسانی کو اس سے مالا مال کیا جاسکتا ہے، جستجو اور تحقیق شرط ہے :

قُلْ لَّوْكَانَ الْبَحْرُ مَدَدًا لِّكَلِمَتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ  
أَنْ تَنفَذَ كَلِمَتٌ وَ لَوْ جُئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝

کہہ دیجئے اگر میرے پروردگار کی باتوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ ہو، تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں، سمندر نہ برباد جائے گا، اگرچہ ویسا ہی اور سمندر اس کی مدد کو لے آئیں۔

”ہم اس پرچے سے اس نئے اور مستقل تفسیری باب کو شروع کر رہے ہیں۔ تفسیر آیات کا انتخاب ان معنوں میں ہے کہ اختصار کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہم کن آیات کو اپنے ذوق کی رعایتوں سے آپ کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ ورنہ یہاں متعارف معنوں میں انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہاں تو ایک ایک آیت جانِ معنی اور روحِ انتخاب ہے۔ اس باب میں ہم صرف ان آیات کو لائیں گے جن کی ادبی، نحوی یا کلامی و فقہی اہمیتوں کو اجاگر کر سکیں۔ مقصود یہ ہے کہ ہماری وجود پر د کے دلوں میں قرآن کی عظمتوں کا صحیح احساس کروٹ لے اور انہیں معلوم ہو کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کی ایک کتاب میں کتنا اعجاز، کتنے معانی اور فکر و مل کا کتنا نکھار ہے۔ امید ہے ہمارے قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔“

یہ تفسیر ۱۹۵۰ کے ”الاعتصام“ کے مندرجہ ذیل شماروں میں شائع ہوئی۔

۲۵ اگست - یکم ستمبر - ۸ ستمبر - ۲۰ اکتوبر - ۱۰ نومبر - ۱۴ نومبر - ۲۴ نومبر۔

یکم دسمبر، ۸ دسمبر، ۲۲ دسمبر۔

۱۹۵۱ کے درج ذیل شماروں میں چھپی۔

۵ جنوری، ۱۲ جنوری، ۲۶ جنوری، ۹ فروری، ۱۶ فروری، ۲ مارچ، ۹ مارچ،

۱۶ مارچ، ۲۳ مارچ، ۳۰ مارچ، ۶ اپریل، ۱۸ مئی، ۲۵ مئی۔

۸ جون، ۱۵ جون، ۷ ستمبر، ۲۳ نومبر، ۳۰ نومبر، ۲۱ دسمبر۔

۱۹۵۲ کے صرف ایک یعنی ۱۱ جنوری کے شمارے میں چھپی۔

قرآن کی ان منتخب آیات کی تفسیر کے بعد اب پھر پیچھے چلیے۔

۷ — ۱۹۵۰ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام سے متعلق بعض اخبارات میں ایک سلسلہ بحث شروع ہوا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ ”ابوالاعلیٰ“ نام رکھنا جائز نہیں۔ ”الاعلیٰ“ کے لفظ کا اطلاق، اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے اور ”ابو“ کے معنی باپ کے ہیں، یعنی (نعوذ باللہ) اللہ کا باپ۔ یہ نام بالکل غلط اور خلافِ شرع ہے۔

اول اول یہ بحث اس دور کے ”امروز“ کے ایڈیٹر مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم نے ”امروز“ کے (فکاہی کالم) حرف و حکایت میں شروع کی تھی۔ حسرت مرحوم طنز کے بادشاہ تھے اور الفاظ کا وسیع ذخیرہ ان کے خزانہ ذہن میں محفوظ تھا۔ ان کا مقصد محض تفنن اور دل لگی تھا۔ لیکن اس مصرعِ طرح کو بعض حضرات لے اڑے اور اس پر سنجیدگی سے امروز میں مضامین لکھنے لگے۔ یعنی اس ہلکے پھلکے صحافتی مزاح کو فتویٰ وفقہ کا بھاری بھر کم مسئلہ بنا دیا گیا۔

جماعتِ اسلامی والے اس سے بہت پریشان ہوئے۔ جو لوگ اُس زمانے میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے تھے، ان کے لیے اس محاذ پر اُترنا اور اس کا صحیح صحیح جواب دینا مشکل تھا۔ لے دے کر ایک ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم تھے جو اپنے اخبار سہ روزہ ”کوثر“ کے ”سیر و سفر“ میں جواب دینے کی کوشش کرتے تھے، لیکن الفاظ کی تراش خراش کے محدود دائرے سے آگے بڑھ کر مستتر ضنین کا علمی انداز میں مقابلہ کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ جماعتِ اسلامی کے حامی ہم بھی نہ تھے (اب بھی وہی موقف ہے) لیکن

یہ بحث قطعی غیر علمی تھی۔

ایک دن میں نے مولانا ندوی سے عرض کیا کہ مذاق مذاق میں یہ بحث بہت آگے نکل گئی ہے اور بعض حضرات نے اُسے سنجیدہ مسئلہ بنا دیا ہے، ہمیں اس بحث میں حصہ لینا چاہیے اور ثابت کرنا چاہیے کہ ”ابوالاعلیٰ“ نام میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ مولانا نے فرمایا آپ لکھیں، میں اسے دیکھ لوں گا، اگر کوئی جھول ہوا تو نکال دوں گا۔ میں نے کہا آپ ہی لکھیں، میں تہذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال میں سے کینتیں تلاش کر کے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے مضمون لکھا اور اس کا دوسرا عنوان قائم کیا۔

نام میں کیا دھرا ہے۔

کیا ”الاعلیٰ“ کا لفظ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

ملک نصر اللہ خاں عزیز کو بھی کسی نے بتا دیا کہ ”الاعتصام“ میں اس موضوع پر مضمون لکھا گیا ہے۔ اس زمانے میں الاعتصام پوسٹ تو گوجرانوالہ سے ہوتا تھا، لیکن چھپتا لاہور میں تھا۔ پریس کا نام تھا، ”ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس“۔ یہ پریس موہن لال روڈ پر تھا، جسے بعد میں اردو بازار کہا جانے لگا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے آدمی بھیج کر پریس سے پرچہ منگوایا اور کوثر میں یہ مضمون نقل کر کے چھاپ دیا۔

پروفیسر محمد سرور جامعی مرحوم ان دنوں ہفت روزہ ”آفاق“ کے ایڈیٹر تھے۔ وہ جماعت اسلامی کے انکار سے اتفاق نہ رکھتے تھے، لیکن ان کا عدم اتفاق خالص علمی بنیادوں پر تھا۔ انھوں نے بھی آفاق میں یہ مضمون نقل کیا۔

حسرت صاحب مولانا حنیف ندوی کے پرانے دوستوں میں سے تھے، انھوں نے یہ مضمون پڑھا تو بعض دوستوں سے پتا چلا کہ وہ کچھ کبیدہ خاطر ہوئے۔ بہر حال اس کے بعد ”امروز“ نے یہ بحث بند کر دی۔

یہ مضمون نہایت دلچسپ اور مدلل ہے جو ۸ ستمبر ۱۹۵۰ کو ”الاعتصام“ کے صفحہ

اقل پر شائع ہوا — اپنے قارئین کی دلچسپی کے لیے اُسے آئندہ صفحات میں نقل کیا جا رہا ہے۔

۸ — اس دور میں الاعتصام کا طرزِ اسلوب عام روش سے بالکل جداگانہ تھا۔ اس میں نہ متنازعہ فیہ امور پر بحث کی جاتی تھی اور نہ آئین اور رفع الیدین وغیرہ مسائل پر زور دیا جاتا تھا۔ اس پر جماعت کے بعض علمائے کرام نے اعتراض کیا تو مولانا ندوی نے ۲۹ دسمبر ۱۹۵۰ اور ۵ جنوری اور ۱۲ جنوری ۱۹۵۱ کے الاعتصام کی تین اشاعتوں میں چر مغز اور زوردار ادارے لکھے، عنوان تھا۔ ”الاعتصام کے معترضین سے“ — ان اداریوں میں اُن تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو جماعت کے علمائے طرف سے الاعتصام کے مضامین و مقالات کے بارے میں کیے جاتے تھے۔

۹ — ۲۵ مئی اور یکم جون ۱۹۵۱ کے الاعتصام میں مولانا عبد العزیز سعیدی مرحوم کا جو اُن دنوں رحیم یار خاں کے نواح میں ایک گاؤں میں اقامت گزیرے تھے، ایک مکتوب شائع ہوا، جس کا ملخص یہ ہے کہ وہ جماعت اسلامی میں شامل تھے اور اہل حدیث کی حیثیت سے جماعت اہل حدیث کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے، لیکن رحیم یار خاں کی مقامی جماعت کے امیر نے ان کو اس سے روک دیا اور سخت الفاظ میں کہا کہ وہ جماعت اسلامی میں رہ کر کسی دوسری جماعت سے تعلق نہیں رکھ سکتے۔ اس پر انھوں نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ خاصا طویل مکتوب تھا جو من و عن الاعتصام کی دو اشاعتوں میں چھپا۔ اس کے جواب میں جماعت اسلامی کے ترجمان سے روزہ کوثر (لاہور) نے ادارے لکھا اور مولانا عبد العزیز سعیدی پر تنقید کی۔ مولانا ندوی نے اس سلسلے میں الاعتصام کے تین شماروں (۲۲ جون، ۲۹ جون اور ۶ جولائی ۱۹۵۱ء) میں ادارے لکھے، عنوان تھا:

مسئلہ اہل حدیث اور جماعت اسلامی

ایک ناخوش گوار بحث

۱۰ — ۲۷ جولائی، ۳ اگست، ۱۰ اگست، ۱۷ اگست، ۲۴ اگست اور ۳۱ اگست

۱۹۵۱ء کے الاعتصام کی چھ قسطوں میں مولانا نے ایک مضمون لکھا۔ ”اہلِ حدیث کا دینی تصور اور اس کے لوازم۔“

اپنے موضوع سے متعلق یہ ایک اچھوتا مضمون ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔  
۱۵۔ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا ندوی ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہوئے۔ اس کے بعد چھ مہینے تک تو یہ الاعتصام میں باقاعدہ لکھتے رہے، پھر باقاعدگی قائم نہ رہ سکی۔ روزانہ صبح صبح گوجرانوالہ سے لاہور آنا اور شام کو واپس جانا، پھر اپنا تصنیفی کام بھی کرنا، ان حالات میں الاعتصام کے لیے مضامین لکھنا بہت مشکل تھا۔ ان دنوں ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے مولانا ”مسئلہ اجتہاد“ تصنیف کر رہے تھے جو ادارے کی طرف سے ان کی پہلی کتاب تھی اور یہ کام زیادہ تر گھر میں کرتے تھے۔

اس زمانے میں ادارے اور شذرات وغیرہ زیادہ تر یکس ہی لکھتا تھا لیکن اخبار کی پیشانی پر بطور ایڈیٹر مولانا ندوی کا نام چھپتا تھا۔ میں الاعتصام کے ابتدائے اجراء ہی سے مولانا کے ساتھ کام کر رہا تھا اور انھوں نے چند روز کے بعد ہی مجھ سے کتابوں پر تبصرے، سیاسی شذرات اور مضامین لکھوانا شروع کر دیے تھے۔ جو کچھ لکھتا تھا، مولانا اسے دیکھ لیتے تھے اور نوک پلک ٹھیک کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی کسی موضوع پر ادارہ بھی لکھواتے تھے۔ میرا نام مضامین اور تبصروں میں تو چھپتا تھا، بعض اوقات شذرات میں بھی چھپتا تھا، لیکن ادارے میں نہیں چھپتا تھا۔

۲۶۔ جون ۱۹۵۳ء تک الاعتصام کی پیشانی پر مولانا کا نام چھپتا رہا۔ اس کے بعد ۳ جولائی ۱۹۵۳ء سے بطور مدیر میرا نام چھپنے لگا۔ اب مولانا بھی گوجرانوالہ سے لاہور آگئے تھے، اخبار بھی لاہور منتقل ہو گیا تھا اور میں بھی یہیں تھا۔ روزانہ شام کے بعد کسی نہ کسی ہوٹل میں ہماری ملاقات ہوتی تھی اور مختلف مسائل پر سلسلہٴ کلام جاری رہتا تھا۔

**الاعتصام سے علیحدگی سے بعد کے مضامین**

الاعتصام کی ادارت سے علیحدگی کے بعد بھی ازراہِ کرم مولانا نے مجھ سے اور الاعتصام سے بدستور سابق تعلق رکھا اور حسبِ ذیل مضامین لکھے۔

۱- ۲۲- نومبر ۱۹۵۳ء (۱۳ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ) کو علامہ سید سلیمان ندوی نے کراچی میں وفات پائی۔ مولانا حنیف ندوی نے ”علامہ سید سلیمان ندوی“ کے عنوان سے ان پر تعزیتی مضمون لکھا جو الاعتصام کی ۴ دسمبر، ۱۱ دسمبر، ۲۵ دسمبر ۱۹۵۳ء، ۸ جنوری ۲۹ جنوری اور ۵ فروری ۱۹۵۴ء کی چھ اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا۔ یہ مضمون سید صاحب کے بہت سے علمی اور ذاتی پہلوؤں پر مشتمل ہے جو آئندہ صفحات میں درج کیا جا رہا ہے۔

۲- اس زمانے میں جماعت اسلامی کا ایک ماہانہ رسالہ ”چراغِ راہ“ کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارے میں مولانا مسعود عالم ندوی نے سید سلیمان ندوی پر ایک تعزیتی مضمون لکھا تھا۔ مضمون کی اشاعت سے چند روز پیشتر ۶ مارچ ۱۹۵۴ء کو مولانا مسعود عالم ندوی وفات پا گئے تھے۔ اپنے مضمون میں مولانا مسعود عالم ندوی نے مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر بھی کیا تھا اور لکھا تھا کہ ”مولانا ابوالکلام زبان و قلم کے بادشاہ ہیں، مگر ان کا علم ٹھوس نہیں“۔

اپریل ۱۹۵۴ء کے ”فاران“ (کراچی) میں ماہر القادری مرحوم نے مولانا مسعود عالم ندوی پر ”یادِ رفتگان“ کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا، جس میں لکھا کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ مولانا ابوالکلام کی ذہانت و فطانت کے وہ قائل ہیں، مگر ان کو عربی نہیں آتی۔ نیز فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کا جو ترجمہ کیا ہے، اس کو پڑھ کر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد عربی جانتے تھے، مگر ابوالکلام عربی نہیں جانتے۔ اس پر مولانا حنیف ندوی نے الاعتصام کی ۷ مئی، ۱۴ مئی، ۲۱ مئی اور ۲۸ مئی ۱۹۵۴ء کی چار اشاعتوں میں ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا:

”مولانا ابوالکلام عربی نہیں جانتے۔“

دارالعروبہ کا عجیب و غریب انکشاف  
کبریت کلمۃ تخرج من افواہم

مضمون کا آغاز درج ذیل سطور سے ہوتا ہے،

”چراغِ راہ“ اپریل ۱۹۵۴ء میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا ایک تعزیتی مضمون چھپا ہے، جسے پڑھ کر ان کے اخلاص اور سید صاحب کی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اس میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی سیرت اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسعود عالم صاحب ہمارے گھرے اور بے تکلف دوست تھے۔ ان کی موت کی خبر اچانک پہنچی تو نہ پوچھیے کہ کتنا صدمہ ہوا، اور کتنی دیر تک ہوش و حواس کے پورے کارخانے میں ایک تعطل سا برپا رہا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ الاعتصام میں ان کے حالات پر ایک مفصل مضمون لکھا جائے کہ چراغِ راہ میں ان کا تعزیت نامہ نظر سے گزرا، جس میں کہ اپنے محسن و محبوب استاذ کی خدمت میں انھوں نے درد اور خلوص میں ڈوبا ہوا اندر نہ پیش کیا تھا اور حق شاگردی ادا کیا تھا۔ آہ! کسے معلوم تھا کہ یہ شخص جو سید صاحب کے غم میں نڈھال ہے اور ان کی وفات سے حد درجہ متاثر ہے، خود قبر کی آغوش میں آسودہ ہونے کو ہے اور اپنے دوستوں کو خون کے آنسو رلانے والا ہے۔

”جب ہم مضمون کے اس حصے تک پہنچے کہ ”مولانا ابوالکلام زبان و قلم کے بادشاہ ہیں، مگر ان کا علم ٹھوس نہیں“ تو حیرت ہوئی کہ اس ”تحقیق“ اور ”صاف گوئی“ کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس سے دعوتِ اسلامی کے مقاصد کو کتنی تقویت حاصل ہوئی؟“ ابھی ہم اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ ایک عزیز نے

اے مولانا مسعود عالم ندوی نے ”دارالعروبہ“ کے نام سے عربی کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کیا تھا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کا آغاز دارالعروبہ ہی نے کیا تھا۔



اپریل (۱۹۵۶ء) کا ”فاران“ دکھایا۔ اس پر ماہر القادی صاحب نے مولانا مسعود عالم ندوی پر ”یادِ رفتگان“ کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اس میں بھی مولانا آزاد کے بارے میں مولانا مسعود عالم کے کچھ تاثرات بیان ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ... مولانا ابوالکلام عری نہیں جانتے ...“

اس سے آگے چل کر مولانا حنیف ندوی لکھتے ہیں :

”افسوس ہے کہ آج مولانا مسعود عالم ندوی زندہ نہیں، ورنہ ہم ان سے براہِ راست اور نسبتاً ذرا سختی سے پوچھتے کہ انھوں نے یہ کیا شوشہ چھوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں اور خوشنوتوں کو معاف فرمائے اور ان کی خدمات کے صلے میں انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے“

یہ مضمون الاعتصام کی چار قسطوں میں اشاعت پذیر ہوا۔

۳ — مولانا حنیف ندوی کو جن لوگوں سے ہمیشہ شدید اختلاف رہا، ان میں منکرینِ حدیث کا گروہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس نقطہ نظر کے حامل طبقے پر انھوں نے ہر موقع پر تنقید کی اور مختلف انداز میں ان کے عقائد و تصورات کو ہدفِ نقد و جرح ٹھہرایا۔ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لائقِ استناد قرار دینا، فرامینِ پیغمبر کو تسلیم کرنا اور اطاعتِ رسول کو اطاعتِ الہی کے برابر ماننا بہر حال ضروری ہے۔ جو شخص اس سے ذرہ بھرا انحراف کرتا ہے، وہ نہ قرآن کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اسلامی اوامر و نواہی سے متعلق غور و فکر کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔

اس موضوع پر مولانا نے ”مطالعہ حدیث“ کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی اور بہت سے مضامین سپردِ قلم کیے۔ اس سلسلے کے متعدد مضامین الاعتصام کے کئی شماروں میں معرضِ اشاعت میں آئے۔ ان میں سے ایک مضمون کا عنوان تھا — ”قرآن سے بھی پہلے“

اس مضمون کی اصل محرک ابنِ ماجہ کی وہ حدیث ہے، جس میں صحابہ فرماتے ہیں: کنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوتینا الايمان قبل القرآن۔

(ہمیں قرآن سے بھی پہلے ایمان کی نعت دی گئی)۔

اسی قسم کی ایک حدیث مستدرک حاکم میں بھی ہے، جسے صحیحین کی شرط پر صحیح ٹھہرایا گیا ہے۔

یہ مضمون ”قرآن سے بھی پہلے“ ۱۶ جولائی، ۳۰ جولائی، ۱۳ اگست، ۲۰

اگست، ۲۷ اگست، ۱۷ ستمبر اور ۲۴ ستمبر ۱۹۵۴ء کے الاعتصام کی سات قسطوں میں چھپا۔ ساتویں قسط کے اختتام پر ”باقی آئندہ“ لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علمی مضمون ابھی تشنہ تکمیل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جتنا چھپا ہے، وہ اپنی جگہ اہم ہے۔

۴۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی سالانہ کانفرنس ۳، ۴ اپریل ۱۹۵۵ء کو لائل پور (حال فیصل آباد) میں مولانا سید اسماعیل غزنوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس کے ایک اجلاس میں مولانا حنیف ندوی نے مولانا سید داؤد غزنوی کے فرمان کے مطابق حجیت حدیث کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ یہ نہایت عالمانہ تقریر تھی جو ہزاروں افراد کے مجمعے میں کی گئی۔ یہ تقریر ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء کے الاعتصام میں شائع ہوئی۔

۵۔ روزنامہ ”امروز“ کے پہلے ایڈیٹر مولانا چراغ حسن حسرت نے ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو اس دنیائے فانی سے عالم آخرت کی راہ لی۔ وہ مولانا حنیف ندوی کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مولانا نے ”حسرت کی یاد میں“ کے عنوان سے ان پر تعزیتی مضمون لکھا جو ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء کے ”الاعتصام“ میں چھپا۔ یہ مضمون آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

اس کے علاوہ الاعتصام میں مولانا ندوی کے مندرجہ ذیل مضامین شائع ہوئے:

۲۲ جولائی ۱۹۵۵ء

۶۔ قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔

۲۹ جولائی ۱۹۵۵ء

۷۔ تحریک اہل حدیث کا تاریخی پس منظر۔

۱۹ اگست ۱۹۵۵ء

۸۔ قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔

- ۹ — قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۵۵
- ۱۰ — قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵
- ۱۱ — قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔ ۱۱ نومبر ۱۹۵۵
- ۱۲ — ۱۷ فروری ۱۹۵۶ کو الاعتصام کا ”حجیتِ حدیث نمبر“ شائع ہوا تھا جو ۳۰ x ۲۰ سائز کے سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں استنادِ حدیث سے متعلق متعدد اہل علم کے عالمانہ اور محققانہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ مولانا حنیف ندوی نے اس کے لیے دو مضمون تحریر کیے۔ ایک کا عنوان تھا، ”حجیتِ حدیث پر ایک یقین افروز دلیل۔“
- ۱۳ — دوسرا علامہ محمد اسد (جرمن) کی مشہور کتاب ”اسلام ایٹ دی کراس روڈ“ کے ایک مضمون کا ترجمہ کیا تھا، عنوان تھا، ”روحِ سنت۔“
- ۱۴ — ”اسلام میں نبوت کا تصور“ مولانا کا یہ مضمون الاعتصام کی ۲۵ مئی، یکم جون، ۱۵ جون اور ۲۲ جون ۱۹۵۶ کی چار اشاعتوں میں چھپا۔
- ۱۵ — مولانا ظفر علی خاں کا انتقال ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ کو ہوا۔ مولانا ندوی نے ان کی وفات پر ”مولانا ظفر علی خاں مرحوم“ کے عنوان سے تعزیتی مضمون لکھا جو ۷ دسمبر ۱۹۵۶ کے الاعتصام میں شائع ہوا۔ یہ مضمون آئندہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔
- ۱۶ — ”کیا خلیفہ معزول ہو سکتا ہے؟“ ۴ جنوری، ۱۱ جنوری اور ۱۸ جنوری ۱۹۵۷ کو چھپا۔
- ۱۷ — ”ارسطو کی منطق پر ابن تیمیہ کے اعتراضات۔“ ۵ اپریل اور ۱۲ اپریل ۱۹۵۷ کو زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔
- ۱۸ — ”حدیث و سنت کے قرآنی پیمانے“ یہ مضمون ۱ جولائی، ۲ جولائی اور ۷ اگست ۱۹۵۹ کے الاعتصام کی زینت بنا۔
- ۱۹ — ”اسلام میں فرقے“ یہ مضمون مشہور منکرِ حدیث غلام احمد پرویز کے اس نقطہ نظر کی مخالفت میں لکھا گیا تھا کہ قرآن کی رو سے مسلمانوں کا فرقوں اور گردہلوں

میں منقسم ہونا شرک و کفر کے مترادف ہے۔ اب تو بعض نیم اسلامی اور نیم سیاسی جماعتوں کے رہنما بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ مذہبی فرقے نفاذِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مولانا ندوی نے اسلام کے فقہی اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں اس موقف کی مخالفت کی ہے۔ یہ مضمون ۲۲ جولائی اور ۲۹ جولائی کے الاعتصام میں چھپا۔

۲۰۔ — الاعتصام کے ۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۰ کے شمارے سے مولانا ندوی نے ایک نئے سلسلہ مضمون کا آغاز کیا، جس کا عنوان تھا، ”چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں“ اس مضمون کا پس منظر یہ ہے کہ ایک دن حسبِ معمول ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ یہ دلائل و موضوع زیرِ بحث آیا کہ قرآن مجید کی روشنی میں سیرتِ رسول پر کام ہونا چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس اہم کام کا آغاز کیا تھا، مگر ان کی بولچھوں مصروفیتوں کی وجہ سے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی نے بھی اس کو شائستہ مراعات ٹھہرایا تھا لیکن وہ بھی اپنے بہت سے مشاغل کی بنا پر اسے مکمل نہ کر پائے۔ اور بھی بعض اہل علم نے اس طرف عنانِ توجہ مبذول کی، مگر منزلِ اتمام تک رسائی کسی کی نہ ہو سکی۔ مولانا ندوی نے میری گزارش پر فرمایا کہ میں اس کی ابتدا کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا، اس کی تکمیل بھی ہونی چاہیے۔ فرمایا یہ بھی ہو جائے گی۔ ہم نے مندرجات کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا تو ”چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں“ اس کا پھٹکتا ہوا عنوان ذہن میں آیا۔ مولانا نے میری درخواست پر مضمون کا آغاز کر دیا اور ابتدا مندرجہ ذیل سطور سے کی۔

”الفاظِ بسا اوقات دھوکا دیتے ہیں۔ عنوان مذکورہ بالا سے بظاہر شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ چہرہ نبوت کے نکھار اور دلائل و دلیلی کی حیثیت بجائے خود معیارِ حق کی نہیں، بلکہ معیارِ حسن و جمالِ صرف قرآن ہے، اور دونوں میں نسبت و تعلق کی وہی نوعیت کا فرما ہے جو آئینہ دیکھنے والے اور آئینے میں ہوتی ہے، حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں۔ قرآن و سیرت میں اس سے کہیں زیادہ تعلق ہے۔ ایسا تعلق کہ جس کی وسعت پذیری دونوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یعنی جہاں آنحضرت کی اداہائے ہوش ربا پر قرآن کی ضوفاشیانیوں کے اثرات نمایاں ہیں اور بقول ام المومنین اور رمزِ آشنائے رسالت

حضرت عائشہؓ کے، آپ کی زندگی و اخلاق قرآن ہی کا دوسرا نام ہے، وہاں اس مصحفِ روشن کی تابانیوں کو بھی سیرت ہی سے فروغ حاصل ہے۔

”غور فرمائیے، فہم و ادراک میں کس قدر سچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ مطلعِ انوار کتاب کس درجہ مجمل اور گنگناہ ہو کر رہ جاتی ہے، اگر اُسے حضورؐ کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے اور مخاطبِ اول اور مبطلِ وحی کی تشریحاتِ فکر و نظر کی اولیں تجلیات سے الگ کر لیا جائے۔ نیز اس جانی بوجھی حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے کہ کتاب اپنی حتمی اور قطعی ترجمانی کے لیے ہمیشہ ایک صاحبِ کتاب چاہتی ہے، جو اس کے اجمالات کو تفصیلات کی روشنی میں لائے، اس کے عقدوں کو واکرے، اس کی مشکلات کو سلجھائے اور اس کے مطالب و معانی کو عمل اور روزمرہ کی زندگی میں برت اور سمو کر دکھائے۔“

”قرآن و سیرت میں تعلق و نسبت کی اگر یہی نوعیت ہے تو عنوان کے معنی یہ ہوتے کہ ایک آئینہ دوسرے آئینے کے مقابل میں ہے۔ ایک معیار کو دوسرے معیار کی دُور سے جانچا اور پرکھا جا رہا ہے، یا پھر دو مستقل بالذات، مگر ایک دوسرے سے وابستہ کسوٹیاں اور شمعیں ہیں، جن کے تقابیل سے نقوشِ سیرت کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔“

اس طویل مضمون کی آخری قسط ”الاعتصام“ کے ۷ ستمبر ۱۹۶۲ کے شمارے میں چھپی۔ لیکن درحقیقت یہ آخری قسط نہ تھی۔ اس کے اختتام پر ”باقی آئندہ“ مرقوم ہے، مگر اس کے بعد افسوس ہے، یہ شائع نہیں ہوا۔ یہ مضمون الاعتصام کی ۲۰×۳۰ سائز کی اکٹھ اقساط پر مشتمل ہے اور بہتر صفحات کو گھرے ہوئے ہے۔ نہایت علمی اور تحقیقی مضمون ہے۔ مولانا جس طرح اور کئی مضامین مکمل نہیں کر پائے، اسی طرح یہ بھی تکمیل کی منزل کو نہیں پہنچ سکا۔ زبان اور اندازِ بیان انتہائی شان دار ہے اور بہت سے اچھوتے مباحث کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اُن دنوں ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ میں اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ مولانا اتوار کی صبح کو مضمون لکھا کریں گے اور میں شام کو اُن کے گھر سے مضمون لے لیا کروں گا یا وہ شام کے بعد معمول کے مطابق انارکلی آئیں گے تو مضمون لیتے آئیں گے۔ اس فیصلے

پر بدستور عمل ہوتا رہا۔ تاہم مضمون مکمل نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بارہا ان سے عرض کیا گیا، وہ وعدہ بھی کرتے رہے اور ان کی خواہش اور دل کی تڑپ بھی یہی رہی کہ یہ سلسلہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے، لیکن کوئی نہ کوئی رکاوٹ اور مجبوری ایسی پیش آتی رہی کہ یہ مضمون اختتام کو نہ پہنچ سکا۔

ایک مرتبہ میں نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے مرحوم (سابق) ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام سے اس مضمون کا تذکرہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور مولانا سے اس کو مکمل کرنے کے لیے کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کیا جائے، کیونکہ اپنی بیچ کی یہ ایک نئی چیز ہے۔ مولانا نے اس کی تکمیل کا ارادہ بھی کیا، لیکن ارادہ عمل کے سانچے میں نہ ڈھل سکا۔ اور بھی بہت سے دوستوں نے مولانا کو اس طرف توجہ دلائی اور اُسے چھاپنے کی تمنا کا اظہار کیا مگر معاملہ ابھی تک آگے نہیں بڑھ پایا۔

یہ مضمون ۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۰ کے شمارے سے چھپنا شروع ہوا تھا اور ۷ ستمبر ۱۹۶۲ تک چھپتا رہا۔ الاعتصام میں ان کا یہ طویل ترین مضمون ہے۔ اگر مولانا اس کی سات آٹھ قسطیں اور لکھ دیتے یا اب صحت یاب ہونے کے بعد چند روز میں اس کے آخری بیس پچیس صفحات تحریر فرمادیں تو قرآن کی روشنی میں سیرت رسول پر اپنی نوعیت کی یہ ایک منفرد شے ہوگی اور کتابی صورت میں منظرِ اشاعت پر آسکے گی۔

یہ مولانا ندوی کا الاعتصام میں آخری مضمون تھا۔ اس کے بعد بعض جماعتی معاملات میں ان کا نام تو اس اخبار میں چھپتا رہا، لیکن اس کے لیے وہ کوئی مضمون نہیں لکھ سکے۔ نہ کبھی میں نے ہی زور دے کر کسی موضوع پر ان سے کوئی مضمون مانگا۔ الاعتصام میں سولہ سال (تین سال معاون مدیر اور تیرہ سال مدیر کی حیثیت سے) خدمات انجام دینے کے بعد ۳۰۔ مئی ۱۹۶۵ کو خود میں بھی اس سے علیحدہ ہو گیا۔ میں تو اصرار کر کے یا کسی ایسے موضوع پر گفتگو شروع کر کے، جس کے نتیجے میں کوئی مضمون تیار ہو سکتا ہو، اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور مضمون لکھوا لیتا تھا۔ لیکن میرے الاعتصام سے الگ

ہوجانے کے بعد نہ مولانا سے کسی نے زور دے کر یہ موضوع منتخب کر کے، مضمون کے لیے کہا، نہ از خود انھوں نے کوئی مضمون دیا۔ اس کے بعد ان کے جو مضمون الاعتصام میں شائع ہوئے، وہ سب پرانے مضمون ہیں، جو انھوں نے اپنے دورِ ادارت میں لکھے یا میرے زمانہ ادارت میں تحریر فرمائے تھے۔

۲۱۔ برصغیر پاک و ہند کے نامور خطیب اور مجاہدِ حریت سید عطار اللہ شاہ بخاری نے ۲۱ اگست ۱۹۶۱ کو اس عالمِ خاک کی سے منہ موڑ کر جنت الفردوس کا عزم کیا۔ مولانا ندوی نے ۸ ستمبر ۱۹۶۱ کے الاعتصام میں ان پر تعزیتی مضمون لکھا۔ عنوان تھا:

سید عطار اللہ شاہ بخاری  
عظیم خطیب اور عظیم مجاہد

سہ روزہ ”منہاج“ لاہور

جنوری ۱۹۵۸ کو چند مخلص دوستوں کے تعاون سے میں نے لاہور سے سہ روزہ ”منہاج“ جاری کیا۔ اس کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا۔ یہ اخبار بالخصوص جماعت اہل حدیث کے حلقے میں بہت مقبول ہوا۔ لیکن چودہ پندرہ مہینے سے زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے قانون کے مطابق ”منہاج“ کو تاریخ اجرا کے بعد سے لے کر کم و بیش تین سال تک اخباری کاغذ نہیں مل سکتا تھا، جس کی قیمت نو دس روپے رم تھی۔ مجبوراً مجھے کرنا فلی کاغذ خریدنا پڑتا تھا۔ اس کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور وہ پچیس روپے سے چالیس روپے رم تک ملتا تھا۔ جس قدر اخبار کی تعداد اشاعت بڑھتی جاتی تھی، اسی نسبت سے خسارے میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بالآخر کافی خسارہ اٹھانے کے بعد اپریل ۱۹۵۹ کو میں نے اسے بند کر دیا اور اخبار نکلانے کے شوق سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی اور مولانا داؤد غزنوی کے کہنے سے سوا سال کے بعد پھر الاعتصام میں واپس چلا گیا۔

بہر حال جنوری ۱۹۵۸ سے اپریل ۱۹۵۹ تک میں الاعتصام کے صفحات سے

غائب رہا اور مولانا حنیف ندوی کا بھی الاعتصام سے یہ ”زمانہ رغبوبت“ ہے۔ اب

ان کا ”ظہور“ منہاج میں ہونے لگا۔

سہ روزہ ”منہاج“ کا پہلا شمارہ ۲۱۔ جنوری ۱۹۵۸ کو شائع ہوا۔ مولانا ندوی نے اس کے لیے جو مضمون مرحمت فرمایا اس کا عنوان تھا۔

اہلِ قرآن کا نظریہ دینی  
تنقید و تحلیل کی روشنی میں

۲۵۔ جنوری ۱۹۵۸ کے ”منہاج“ میں ان کا جو مضمون اشاعت پذیر ہوا، وہ تھا۔

نماز کی معنوی اہمیت اور روحانی پہلو

غزالی کے نقطہ نظر سے

اس کے بعد ”اہلِ حدیث کے خلاف ہمہ گیر برہمی کے اسباب“ کے عنوان سے

”منہاج“ میں ان کا قسط وار مضمون چھپنا شروع ہوا۔ اس کی پہلی قسط ۵ فروری ۱۹۵۸ کے شمارے میں اور آخری اور نویں قسط ۱۳ مارچ ۱۹۵۸ کے شمارے میں طبع ہوئی۔ یہ ان کا مکمل مضمون ہے۔ منہاج ۲۰:۳۰ کے سائز پر شائع ہوتا تھا۔ یہ مضمون اس سائز کے پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث میں مقام و مرتبہ

مولانا حنیف ندوی کے حالات کے لیے اب میں آپ کو پھر بہت پیچھے کو لوٹنے

کی زحمت دوں گا۔

۲۴ جولائی ۱۹۴۸ کو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور

اس کا تاسیسی اجلاس دارالعلوم تقویۃ الاسلام (شیش محفل روڈ، لاہور) کے وسیع ہال میں بہ صدارت مولانا سید محمد داؤد غزنوی منعقد ہوا۔ مولانا ندوی اس اجلاس میں شامل تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کو مرکزی جمعیت کے صدر اور پروفیسر عبدالقیوم کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا۔ پروفیسر صاحب اس زمانے میں گورنمنٹ کالج (لاہور) میں شعبہ عربی کے چیرمین تھے۔ اب اردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) میں سینئر ایڈیٹر ہیں۔ ۸ دسمبر ۱۹۴۸ کو مجھے مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا ندوی مرکزی جمعیت کی



مجلسِ عاملہ کے رکن تھے اور مولانا داؤد غزنوی اور دیگر ارکانِ عاملہ کے نزدیک نہایت عزت و احترام کا مقام رکھتے تھے۔ مولانا غزنوی کی زندگی تک مولانا ندوی مرکزی جمعیت کی مجلسِ شوریٰ، مجلسِ عاملہ اور اس کی تمام کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں کے رکن رہے۔ مولانا غزنوی کی وفات (۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء) کے بعد مولانا ندوی نے اس سلسلے کی دلچسپیاں ختم کر دیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ آزادیِ برصغیر سے قبل ہندوستان کی جماعتِ اہلِ حدیث کی تنظیم ”آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس“ کے نام سے قائم تھی۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں تھا، ناظمِ اعلیٰ مولانا شمس الدین امرتسری مرحوم تھے۔ مولانا حنیف ندوی اس کی مجلسِ عاملہ کے بھی رکن تھے اور اس کے عام سالانہ جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ دیگر علماء میں مولانا حافظ محمد ابراہیم میہر سیالکوٹی، مولانا ابوالقاسم بنارس، مولانا عبدالوہاب آروی، مولانا شمس الدین امرتسری، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ)، مولانا عبداللہ الباقی اور مولانا عبداللہ الکافی جیسے عالی مرتبت حضرات اس میں شامل تھے۔ دہلی کے سیٹھوں میں حاجی محمد صالح (جو آزادی کے بعد جمعیتِ علمائے ہند کے ناظمِ مالیات منتخب کیے گئے تھے) اور حافظ حمید اللہ وغیرہ حضرات اس کے رکن تھے۔ مولانا ابوالقاسم بنارس جو اپنے عہد کے جید عالم تھے اور جمعیتِ علمائے ہند سے وابستہ تھے، مولانا ندوی سے عمر میں کئی سال بڑے تھے، لیکن مولانا حنیف ندوی کی بہت قدر کرتے تھے۔ تفاوتِ عمر کے اعتبار سے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ندوی پر بہت شفقت فرماتے تھے۔

جو علمائے اہلِ حدیث پہلے سے مغربی پاکستان میں رہتے تھے اور جو تقسیم کے بعد یہاں آئے، انھوں نے وہ مرکزی جمعیتِ اہلِ حدیث مغربی پاکستان کے نام سے اپنی تنظیم قائم کی اور اس کے صدر مولانا سید داؤد غزنوی کو بنایا۔ جو حضرات مشرقی پاکستان میں سکونت پذیر ہوئے، انھوں نے وہ مرکزی جمعیتِ اہلِ حدیث مشرقی پاکستان کے نام سے اپنا جماعتی نظم و نسق قائم کیا اور اس کے صدر مولانا عبداللہ الکافی ہوئے۔ آزادی کے بعد بہت سے اہلِ حدیث ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے، انھوں نے اپنی جماعت کو اسی نام یعنی ”آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس“ سے قائم رکھا۔ اس کے صدر مولانا عبدالوہاب آروی تھے جو آردھن

درجہ نگہ۔ صوبہ بہار) کے رہنے والے تھے اور جید عالم تھے۔ آزادی کے بعد ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے تھے اور کئی روز مولانا داؤد غزنوی کے مکان (شیش محل روڈ) پر قیام فرما رہے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بڑی شفقت فرماتے۔ اب کئی سال سے ہندوستان کے اہل حدیث حضرات نے اپنی جماعت کا نام بدل دیا ہے اور اسے ”مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند“ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں ہے اور جامع مسجد کے قریب ہے۔

### مرکزی جمعیت کا پہلا اجلاس عام اور مولانا ندوی

مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا پہلا اجلاس عام لاہور میں (شیش محل روڈ پر) ۲۸، ۲۹، ۳۰ مئی ۱۹۴۹ کو منعقد ہوا۔ اجلاس سے تقریباً ایک مہینہ پہلے اس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو اس میں متفقہ طور پر مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کو اجلاس کے صدر اور مولانا محمد حنیف ندوی کو صدر استقبالیہ منتخب کیا گیا۔ دونوں حضرات نے تحریری خطبے پڑھے جو بڑے جان دار اور اپنے مشتملات کے اعتبار سے اس قدر وسعت کے حامل تھے کہ نہ صرف اہل حدیث بلکہ ہر مسک کے اہل علم کے لیے لائق مطالعہ اور قابل اعتناء تھے۔ الاعتصام اس زمانے میں جاری نہیں ہوا تھا۔ مولانا سیالکوٹی کا خطبہ صدارت اخبار ”نوائے وقت“ (لاہور) میں شائع ہوا، اور مولانا ندوی کا خطبہ استقبالیہ الاعتصام کے اجراء کے بعد اس کی ۸ نومبر، ۲۵ نومبر اور ۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی تین اشاعتوں میں چھپا۔

### جامعہ سلفیہ۔ فیصل آباد

۳، ۴، ۵ اپریل ۱۹۵۵ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی تیسری سالانہ کانفرنس لائل پور (ضلع فیصل آباد) میں مولانا سید اسماعیل غزنوی کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس سے قبل اہل حدیث کا مرکزی دارالعلوم اسی شہر میں قائم کرنے اور کانفرنس کے موقع پر ماسک بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ سنگ بنیاد سے پہلے فیصل آباد میں مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں دارالعلوم کے نام کا مسئلہ زیر بحث آیا تو مختلف حضرات نے مختلف نام پیش کیے۔ مولانا حنیف ندوی نے اس کا نام ”جامعہ سلفیہ“ تجویز کیا، جو مسک

سلفیت سے ہم آہنگ تھا اور اس کے فارغ التحصیل حضرات کے لیے ”سلفی“ کی نسبت کے اعتبار سے بھی نہایت موزوں تھا۔ یہ نام سب نے پسند کیا اور یہی رکھا گیا۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ جامعہ سلفیہ کاسنگ بنیاد فیصل آباد کی جماعت اہل حدیث کے مشہور بزرگ حکیم نور الدین مرحوم نے رکھا تھا جو پاکستان کے ممتاز وکیل ایم لے رحمان کے جدا مجد تھے۔ بعد ازاں ضلع فیصل آباد کے دو معروف بزرگوں صوفی عبداللہ اور میاں محمد باقر نے ایک ایک اینٹ رکھی۔ صدر جمعیت مولانا داؤد غزنوی اور دوسرے بہت سے حضرات وہاں تشریف فرما تھے۔ اس زمانے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد اسماعیل صاحب تھے۔ انھوں نے اس موقع پر انتہائی مؤثر اور درد میں ڈوبی ہوئی تقریر کی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ابتداء میں جامعہ سلفیہ میں منتهی طلبا کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا تھا اور طے پایا تھا کہ جب تک فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ کی عمارت تعمیر نہیں ہو جاتی، اس وقت تک دارالعلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ، لاہور) کی عمارت میں جامعہ کے طلبا کو تعلیم دی جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور منتهی طلبا کی تعلیم کے لیے مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل، مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کافی عرصے تک یہ بزرگ فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ مولانا ندوی ہفتے میں دو دن پڑھاتے تھے۔ ان کے اس زمانے کے تلامذہ میں سے اس وقت بعض حضرات دینی مدارس کے مہتمم اور صدر مدرس ہیں، بعض یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور بعض سرکاری سکولوں میں معلم ہیں۔ (ان کے نام آئندہ سطور میں مولانا کے تلامذہ کی فہرست میں درج کیے جا رہے ہیں)۔ ادارہ علوم اثریہ۔ فیصل آباد

غالباً ۱۹۷۴ء میں فیصل آباد کے بعض اہل حدیث حضرات نے دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کو مزید تعلیم دلانے اور انھیں تدریس و تصنیف کی تربیت دینے کی غرض سے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتدائی میٹنگ میں مولانا حنیف ندوی کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی اور مجھے بھی بلاایا گیا تھا۔ میٹنگ میں مسئلے کی تمام تفصیلات

سامنے آئیں اور اس نوع کے ادارے کی اہمیت اور ضرورت پر بحث ہوئی۔ بالآخر اس کے نام پر غور کیا گیا تو مولانا نے فرمایا کہ اس کا نام ”ادارہ علومِ اشریہ“ رکھا جائے، تاکہ اہل حدیث کی رُو سے اس میں ”اثریت“ کا اظہار بھی ہو اور فارغ التحصیل طلباء پر ”اثری“ کی نسبت کا اطلاق بھی ہو سکے۔

ادارہ علومِ اشریہ میں بہت محدود تعداد میں طلباء داخل کیے گئے تھے اور ان کو تدریسی و تصنیفی تربیت دینے کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے اربابِ انتظام کی درخواست پر ایک عرصے تک مولانا ہر ہفتے لاہور سے فیصل آباد تشریف لے جاتے اور طلباء کو پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصہ میں بھی اس سلسلے میں ہر ہفتے میں وہاں جاتا رہا۔ مولانا کے اس دور کے شاگردوں میں بعض حضرات اب وہیں خدمتِ تدریس بھی انجام دے رہے ہیں اور خدمتِ تصنیف بھی۔ (ان کے نام مولانا کے تلامذہ کی فہرست میں دیکھیے)۔

### مامول کا نجح میں خطبہ صدارت

۱۹۸۱ء میں دارالعلوم تعلیم الاسلام مامول کا نجح (ضلع فیصل آباد) کا سالانہ جلسہ مولانا حنیف ندوی کی صدارت میں ہوا۔ اس میں مولانا نے تحریری خطبہ صدارت پڑھا۔ اس خطبے میں انھوں نے اپنے اسلوبِ خاص سے مسلکِ اہل حدیث کی وضاحت کی۔ یہ خطبہ بعد میں شائع بھی ہوا۔ اب تک اس دارالعلوم کے جتنے بھی سالانہ جلسے ہوئے ہیں اور ان جلسوں میں مختلف علمائے جتنی تقریریں کی ہیں، میرے نزدیک مولانا ندوی کا یہ خطبہ صدارت معلومات اور اہل حدیث کے بنیادی نقطہ نظر کی توضیح و تشریح کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے۔ بعض موجودہ اہل حدیث کی یہ کور ذوقی اور بد نصیبی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور علمی مسائل کو سمجھنے کے عادی نہیں رہے۔ انھوں نے پورے زور سے حلق پھاڑ پھاڑ کر بولنے والے مقررین اور واعظوں کی غیر ثلثہ اور اتھلی باتیں سننے کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت

۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۲ء تک (دس سال) مولانا ندوی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے۔

اس زمانے میں (ریٹائرڈ) جسٹس محمود الرحمن اور ان کے بعد (ریٹائرڈ) جسٹس محمد افضل جیمہ اس کے چیئرمین تھے۔ یہ دونوں چیئرمین حضرات زیر بحث مسائل میں مولانا ندوی کی رائے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔

مولانا ندوی پہلے اہل حدیث عالم ہیں، جن کو حکومت نے اہل حدیث کی حیثیت سے اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن مقرر کیا اور جنہوں نے کھل کر کونسل میں زیر بحث مسائل کی اپنے مسدک کے مطابق وضاحت کی۔

متاثر کرنے والی شخصیتیں

علمائے جن حضرات سے مولانا ندوی بہت زیادہ متاثر ہوتے اور جن کے حفظ و اتقان اور اخلاق و سیرت نے ان پر خصوصیت سے اثر ڈالا، ان میں ان کے استاد محترم مولانا محمد اسماعیل سلفی (گوجرانوالہ)، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا محمد سورتی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی، پروفیسر عبدالواجد کان پوری (جو عربی ادبیات میں اونچا مرتبہ رکھتے تھے) علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالعزیز مبین، مولانا سید داؤد غزنوی اور مولانا حافظ محمد گوندوی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کا ذکر انہوں نے زبانی بھی کئی مرتبہ کیا اور مختلف تحریروں میں بھی کیا۔ لسان القرآن جلد اول کے مقدمہ (صفحہ ۳۲) میں لکھتے ہیں۔

”ناشکری ہوگی، اس مرحلے پر اگر ہم اپنی ان محسن شخصیتوں... کا ذکر نہ کریں، جن کی وجہ سے قلب و ذہن میں قرآن کے بارے میں جلا پیدا ہوئی اور ان داعیوں کی پرورش ہوئی جو آگے چل کر ہمارے ذوق و فہم کے پاسباں ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں اپنے معلم و مربی حضرت مولانا اسماعیل صاحب سلفی کا نام ناہی اُس لائق ہے کہ ہم بہ کمال افتخار ان کی عظمت کا اعتراف کریں۔ ان کی توجہ خاص کا فیض تھا کہ ہمارے دل میں پہلے پہل قرآن سے محبت و شغف اور اس کے فہم و ادراک کی کرنیں پھوٹیں۔ ان کړنوں کو جن حضرات کی علمی مساعی نے فانوس و مشعل کی صورت میں ڈھالا، وہ ہیں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی اور پروفیسر عبدالواجد کان پوری۔“

فروری ۱۹۵۶ء کو میں نے ”الاتصام“ کے دورِ ادارت میں سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم ”حجیتِ حدیث نمبر“ شائع کیا تھا۔ اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر مضمون نگار بزرگ سے ان کے مختصر حالاتِ زندگی لیے گئے تھے جو ان کے مضمون کے صفحہ اول پر چوکھٹے میں درج کیے گئے تھے۔ مولانا ندوی نے اس نمبر کے لیے ”حجیتِ حدیث پر ایک یقین افروز دلیل“ کے عنوان سے مضمون عنایت فرمایا تھا۔ اس میں اپنے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ ”وہ حضرات جنھوں نے ذہن کے سانچے کو خصوصیت سے متاثر کیا، تین بزرگ ہیں (۱) مولانا ابوالکلام کی جامع اور پُر وقار شخصیت (۲) انہی کے رفیقِ کار مولانا عبدالرحمن بکرامی، جنھوں نے کہ مولانا کی سکیم دعوت و ارشاد کے ماتحت کلکتے میں تدریسی خدمات انجام دیں اور پھر ندوہ میں ادیب مقرر ہوئے (۳) عاشقِ رسول جناب قاضی سلیمان منصور پوری ”رحمۃ للعالمین“ کے مصنفِ شہیر۔ ان کی متانت، تقویٰ اور صاف ستھری معاشر نے ہمیشہ دیکھنے والوں سے خراجِ تحسین وصول کیا“

## درسِ قرآن

مولانا حنیف ندوی کو قرآن سے خاص شغف اور تعلق خاطر ہے۔ اس افشردہ نور، سینہ لاہوت کے اس آخری بول اور نطقِ جبریل کی اس شمعِ فروزاں سے جو قلبِ پیغمبر پر نازل ہوئی، مولانا ندوی کو بے پناہ محبت ہے۔ میں نے بار بار دیکھا کہ درسِ قرآن کے لیے مولانا کو جس نے بلایا، جہاں بلایا اور جس وقت بلایا، کوئی حرفِ اعتداز زبان پر لائے بغیر فوراً چلے گئے۔ پھر بلا کسی پیشگی تیاری اور مطالعہ کے، قرآن کو کھولا اور جو آیت سامنے آئی، پڑھی، اس کا ترجمہ کیا اور ایسے ایسے نکات بیان کرنا شروع کیے کہ سامعین ہر تن گوش ہو گئے اور ان کے ذہن و فکر پر اثر آفرینی کی نورانی چادر تن گئی۔ اسلوب اتنا پیارا اور زبان ایسی شمسۂ رواں کہ جس میں خود اسلوبِ قرآن اور معانی قرآن منعکس ہو کر نظر و لہر کے زاویوں میں سمانے لگیں۔

کسی نے لکھا ہے کہ قرآن اگر اردو میں نازل ہوتا تو ابوالکلام کی زبان میں نازل ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ ابوالکلام کی زبان کے ساتھ حنیف ندوی کی زبان بھی اس میں شامل ہوتی۔

لاہور کے لائسنس کارڈن میں جہاں آج مسجد دارالسلام تعمیر ہے اور لائبریری دارالسلام قائم ہے، وہاں ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر مکمل سلامت اللہ مرحوم کی تحریک پر سب سے پہلے مولانا محمد علی قصوری (ایم۔ اے کینڈب) مرحوم نے درس قرآن کا آغاز کیا تھا۔ اس پُر فضا جگہ میں دو تین صنفیں بچا دی جاتی تھیں، مغرب سے آدھ پون گھنٹہ پہلے مولانا قصوری کا درس قرآن ہوتا تھا۔ پھر وہیں ان کی امامت میں نمازِ مغرب ادا کی جاتی تھی۔ شروع شروع میں شام کو سیر کے لیے آنے والے کچھ لوگ اس میں شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن بعد کو کافی حاضری ہونے لگی تھی۔ مجھے یاد ہے ”نولے وقت“ میں مشہور صحافی م ش (میاں محمد شفیع) نے اس پر کالم لکھا تھا، جس میں درس قرآن کے اس سلسلے کی تحسین کی تھی اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی تلقین کی تھی۔ نیز مولانا محمد علی قصوری سے درخواست کی تھی کہ وہ اس نیک کام کو جاری رکھیں۔

مولانا محمد علی قصوری نے ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین احمد قصوری نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ وہ کبھی کبھی مولانا حنیف ندوی کو ساتھ لے جاتے اور مولانا ندوی درس قرآن دیتے۔ ندوی صاحب کی بعض درسی تقریریں قاضی محمود احمد نے لکھ کر الاعتصام کو بھیجی تھیں اور وہ اس میں شائع ہوئی تھیں۔ بہر حال قرآن سے مولانا کو خاص شغف اور محبت ہے۔ اس کے درس کے لیے جہاں جی چاہتے لے جایے، بلا تاثر چلے جائیں گے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ترجمہ قرآن میں مولانا کے احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اپنی کسی کتاب یا مضمون میں قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ لکھنا مقصود ہو تو اس کا ترجمہ خود نہیں کرتے، کسی دوسرے کا ترجمہ سامنے رکھتے ہیں اور پھر اُس کے الفاظ میں مناسب رد و بدل کر لیتے ہیں۔ دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے ہیں کہ قرآن کے ترجمے کی ذمہ داری خود نہ قبول کریں۔

صحیح بخاری کی آخری حدیث پر ایک تقریر

صحیح بخاری کی فقہی خصوصیات کا اندازہ امام بخاری کے ابواب سے ہوتا ہے۔ وہ جو ابواب باندھتے ہیں، اس میں کوئی نہ کوئی فقہی مسئلہ ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ شروع سے آخر

تک یہ سلسلہ برابر چلتا ہے۔ مولانا حنیف ندوی کو ایک مرتبہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں تقریب اختتام بخاری کے موقع پر اس کی آخری حدیث پر تقریر کے لیے دعوت دی گئی۔ علما و طلبا کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ مولانا نے حدیث، تدوین حدیث، امام بخاری کی شرائطِ صحت، صحیح بخاری کا مرتبہ، امام بخاری کا علوی مقام، ابواب میں ان کی فقہیات اور اس قسم کے دیگر مباحث پر دو گھنٹے تقریر کی اور ایسے ایسے نکات بیان کیے کہ حاضرین مجلس نے اس سے پہلے کبھی نہ سنے تھے۔

”امروز“ کے مضامین

روزنامہ ”امروز“ (لاہور) کے عملہ ادارت کے بعض معزز ارکان نے کئی سال پیشتر اخبار ”امروز“ کے لیے مختلف مواقع پر مولانا سے مضامین لکھوائے، جن میں سے تین مضمون اس وقت میرے سامنے ہیں۔

۱۔ ”ہلالِ عید یا سوالیہ نشان؟ مسرت و شادمانی کے تین دائرے“۔ مطبوعہ ۲ جنوری ۱۹۶۸ء۔ امروز کا عید نمبر۔

۲۔ ”تین اہم سوال اور پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم“۔ ۹ جون ۱۹۶۸ء

۳۔ ”ختمی مرتبت علیہ السلام“۔ ۲۹۔ مئی ۱۹۶۹ء

### تفسیر ترجمان القرآن پر مقدمہ

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ”ترجمان القرآن“ ایک علمی شاہ کار ہے۔ اس کی دوسری جلد سورۃ مومنون تک چھپی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے مولانا کے ہاتھ کا تحریر شدہ سورۃ نور کا مسودہ بھی مل گیا تھا، جو اس تفسیر میں آزاد سا ہتھیہ اکادمی دہلی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مولانا نے تفسیر کی تیسری جلد جو آخر قرآن تک تھی، مکمل کر لی تھی اور اب اس کے مسودے کا سراغ مل گیا ہے۔ خدا کرے یہ بات صحیح ہو۔

ان سطور میں مقصود صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مولانا غلامِ رسول تہر اور بعض دیگر حضرات نے مولانا آزاد کے السلال، البلاغ اور ان کی بعض دوسری تصنیفات سے سورۃ مومنون سے آخر قرآن تک کی مختلف آیات اور ان کے تراجم و تفسیر کو جمع کر کے



کتابی شکل میں چھاپ دیا ہے۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک کوشش اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور کے مالک منصور احمد صاحب نے کی ہے۔ انھوں نے مولانا محمد عبدہ صاحب (فیصل آباد) کی خدمات حاصل کیں اور مولانا کا اچھا خاصا تفسیری مواد جمع اور مرتب کیا۔ پھر اس میں اپنی طرف سے کچھ اضافے کر کے سورہ نور سے سورہ الناس تک ترجمان القرآن کی تیسری جلد کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کر دی۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا اس پر سات صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے، جس میں مولانا ندوی نے بعض عربی اور اردو تفسیروں کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کا اس باب میں جو علمی ادبی اور تحقیقی کارنامہ ہے، اس کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔

### فلسفہ کا نگریں

مولانا ندوی پاکِ ستان فلسفہ کا نگریں کے رکن ہیں۔ کانگریس کے بعض جلسوں میں انھوں نے فلسفہ سے متعلق مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے۔ ان میں سے بعض مقالے ”ہسٹری آف مسلم فلاسفی“ میں چھپ چکے ہیں۔ یہ کتاب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سابق ڈائریکٹر ایم ایم شریف مرحوم (وفات ۱۱- دسمبر ۱۹۶۵) نے مرتب کی تھی جو فلسفہ کا نگریں کے صدر تھے۔

### یومِ اقبال پر مقالہ

چند سال پیش تک ”یومِ اقبال“ ۲۱ اپریل کو منایا جاتا تھا، جو علامہ کے انتقال کی تاریخ ہے۔ (اب ۹ نومبر کو منایا جاتا ہے جو ماہرینِ اقبالیات کے نزدیک علامہ کی تاریخِ ولادت ہے)۔ مولانا ندوی نے ایک مرتبہ ۲۱ اپریل کو یومِ اقبال کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی میں ”اقبال اور ان کا فلسفہ“ کے موضوع سے متعلق مقالہ پڑھا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ میں حتیٰ طور سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ مقالہ کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوا یا نہیں ہوا۔

### ریڈیائی تقریریں

غالباً ۱۹۵۴ء میں ریڈیو پاکستان لاہور سے مولانا ندوی کی تقریروں کا سلسلہ شروع

ہوا۔ ہر مہینے مولانا کی چار پانچ یا اس سے زیادہ تقریریں نشر ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۳ء تک جاری رہا۔ مولانا کے پاس ان تقریروں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ بعض تقریریں پانچ منٹ کی، بعض دس منٹ کی، بعض بیس منٹ کی اور بعض اس سے بھی زیادہ منٹ کی ہوتی تھیں۔ یہ تقریریں مجموعی طور سے کم از کم تین ہزار صفحات پر مشتمل ہوں گی۔

مرزا نیت نئے زاویوں سے

مولانا نے الاعتصام کے دورِ ادارت میں ایک مضمون لکھا تھا، جس کا عنوان تھا۔ ”ختم نبوت اور اس کے حدودِ طلاق — ایک نیا جائزہ“ — یہ مضمون انیس قسطوں پر محیط تھا۔ پہلی قسط ۳۰۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کے اور آخری قسط ۱۲ مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں چھپی تھی۔ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں کچھ اضافوں کے ساتھ اور اس موضوع سے متعلق متعدد دیگر مضامین شامل کر کے اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ کتاب کا نام تھا۔ ”مرزا نیت نئے زاویوں سے“

اس کی اشاعت کا اہتمام مولانا ندوی کے مرحوم دوست صوفی نذیر حسین (وفات ۲۷ فروری ۱۹۵۴ء) نے کیا تھا اور انہی کے خرچ سے یہ کتاب ”مکتبہ دین و دانش گوجرانوالہ“ کی طرف سے طبع ہوئی تھی۔ کم و بیش تین سو صفحات پر مشتمل تھی۔ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی نے اس پر مقدمہ تحریر کیا تھا۔

اس کتاب کے مندرجات و مشمولات سے قارئین کا محدود حلقہ ہی مستفید ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اشاعت کے فوراً بعد ۱۹۵۳ء کے شروع میں مرزائیوں کے خلاف پورے ملک میں زبردست تحریک شروع ہو گئی تھی، جس میں تمام مکاتبِ فکر کے لوگ شامل تھے۔ اس دور کی حکومتِ پاکستان (بالخصوص حکومتِ پنجاب) نے ان تمام علماء و زعماء کو گرفتار کر لیا تھا جو مرزائیوں کے مخالف تھے اور انہیں اقلیت قرار دینے اور حکومت کی کلیدی اساسیوں سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار لوگوں کو پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا اور مرزا نیت کی مخالفت پر مبنی بہت سی کتابیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اس طرح یہ کتاب ”مرزا نیت نئے زاویوں سے“

نہریز زمین چلی گئی اور اس کی تشہیر کا دائرہ سمٹ گیا۔

یہاں یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ مولانا کے پاس اپنا کوئی اور مطبوعہ مواد نہیں ہے، صرف اس کتاب کا ایک نسخہ ان کے پاس موجود ہے۔ اسے حسنِ اتفاق ہی کہنا چاہیے۔

### قدیم یونانی فلسفہ

غزالی کی تصنیفات میں دو مقاصد الفلاسفہ، ان کی مشہور کتاب ہے جو یونانی فلسفہ کے دقیق مباحث کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مولانا حنیف ندوی نے ”قدیم یونانی فلسفہ“ کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

امام غزالی، اسلام کی فکری تاسخ کے وہ پہلے اور آخری فلسفی ہیں، جنہوں نے علم و دانش کے رائج الوقت پیمانوں کا از سر نو جائزہ لیا، یونانی فلسفہ کے صنم خانوں پر بھرپور وار کیا اور علم و آگہی کے نئے سرچشمے کی نشان دہی کی۔ ان کی المنقذ من الضلال اور تہافتہ الفلاسفہ اس سلسلے کی نہایت اہم کڑیاں ہیں۔ تہافتہ الفلاسفہ میں انہوں نے جو دتِ طبع، نکتہ سنجی اور لطائفِ فکر کے وہ جوہر دکھائے ہیں جو بجائے خود لائقِ مطالعہ ہیں۔ ان کی فکری بلندیوں سے نہ صرف مشرق کو ناز ہے بلکہ جدید ترین مغرب بھی اس سے متاثر ہے۔ مثلاً پاسکل (PASCAL) جب یہ کہتا ہے کہ دل کی اپنی منطق ہے اور استنباط استدلال کے اپنے معیار ہیں، جن سے ذہن و دماغ قطعی آشنا نہیں تو اس سے صاف طور پر غزالی کے اس نظریہ معرفت و ادراک کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جس میں انہوں نے اذعان و یقین کا صُخ ظاہر سے ہٹا کر باطن کی طرف موڑا ہے۔

غزالی کی زندگی کا اصل مقصد چونکہ فلسفہ یونان کی واما ندگیوں کو اجاگر کرنا تھا اور ابن سینا اور فارابی کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے سے پہلے فلسفیانہ حلقوں میں اپنی فلسفہ دانی کی دھاک بٹھائیں۔ ”مقاصد الفلاسفہ“ کی تصنیف میں یہی غرض پنہاں تھی۔ اس میں انہوں نے منطق، الہیات اور طبیعیات جیسے ان خشک مضامین کو ایسے واضح، شگفتہ اور سمجھ میں آنے والے انداز میں بیان کیا ہے کہ جس سے ان کی فلسفیانہ صلاحیتیں ابھر کر قاری کے

سامنے آجاتی ہیں۔

مولانا حنیف ندوی نے اس اسلوب سے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ علم و ادب کے تقاضے پہلو بہ پہلو ہیں اور کسی طرح بھی مضامین کی خشکی اور زبان کا اغلاق قاری کی دلچسپیوں کو مجروح نہ کرنے پائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مولانا نے پوری کوشش کی ہے کہ غزالی کے اپنے پیرایہ بیان کی خوبیوں کو اردو میں جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ بلاشبہ مولانا اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں اور کتاب فلسفے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا ایک دلکش حصہ بن گئی ہے۔

یہ کتاب مجلس ترقی ادب (کلب روڈ، لاہور) کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ فنِ فلسفہ کی یہ معرکہ الارا کتاب ۳۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اور خوب صورت ٹائپ میں چھپی ہے۔

تلازمہ

مولانا نے باقاعدہ اور طویل مدت کے لیے کسی دارالعلوم میں فرائض تدریس انجام نہیں دیے۔ لیکن قیام جامعہ سلفیہ کے ابتدائی دور (لاہور) میں اور ادارہ علوم اشریہ (فیصل آباد) میں جن حضرات کو ان سے بعض نصابی کتابیں پڑھنے اور ان کے علم و فضل سے مستفید ہونے کا شرف حاصل ہوا، ان میں چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ مولانا حافظ عبدالرشید۔ استاد دارالعلوم تقویۃ الاسلام۔ شیش محل روڈ، لاہور۔
- ۲۔ مولانا حافظ عزیز الرحمن لکھوی۔ مہتمم جامعہ محمدیہ۔ رینالہ خورد، ضلع اوکاڑہ۔
- ۳۔ مولانا عبدالرشید۔ مہتمم مدرسہ ضیاء القرآن والحديث۔ رام گڑھ، لاہور۔
- ۴۔ ڈاکٹر مجیب الرحمن۔ صدر شعبہ اسلامیات راج شاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش۔
- ۵۔ قاضی محمد اسلم سیف۔ ناظم دارالعلوم تعلیم الاسلام۔ مامول کائنجن، ضلع فیصل آباد۔
- ۶۔ حافظ عبد الصمد بنگالی۔

- ۷۔ مولانا شرف الحق۔ معلم گورنمنٹ ہائی سکول، احمد پور شرقیہ۔
- ۸۔ مولانا محمد حسین طور۔ مدرس جھوک دادو، ضلع فیصل آباد۔

۹۔ مولانا ارشاد الحق انصاری۔ استاد ادارہ علوم انصاریہ، فیصل آباد۔

۱۰۔ صاحب زادہ برقی التوحیدی، فیصل آباد۔

۱۱۔ مولانا عبدالحمید، بھکر۔

۱۲۔ مولانا محمد مدنی۔ مہتمم جامعہ انصاریہ، جہلم۔

۱۳۔ مولانا محمد خالد سیف۔ اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد۔

### صدارتی ایوارڈ

۳۰۔ جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اہتمام میں مولانا حنیف ندوی کے

ساتھ ایک شام منائی گئی۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر محمد افضل نے کی جو اس زمانے میں

وفاقی وزیر تعلیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر صدر پاکستان کی طرف سے مولانا ندوی

کی تصنیفی خدمات کی تحسین کرتے ہوئے ان کو دس ہزار روپے کا چیک پیش کیا۔ اس سے

ایک سال بعد ۱۹۸۵ء میں مولانا حنیف ندوی کو حکومت پاکستان کی طرف سے ان کی تصنیفی

خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ — ستارہ امتیاز — ملا۔ یہ ایک سرکاری اعزاز

ہے جو مولانا کو صدر پاکستان نے دیا۔ اس سے مولانا کے اعزاز میں تو اضافہ ہوا ہو یا نہ

ہوا ہو، لیکن ایوارڈ کے اعزاز میں ضرور اضافہ ہوا ہے۔

### بعض الفاظ کا استعمال

الاعتصام کے ابتدائی شماروں میں اور کتاب ”مسئلہ اجتہاد“ میں لفظ ”پچھواڑ“

کئی مقامات پر نظر آئے گا، جو مولانا نے ”پس منظر“ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جیسے

اس کی پچھواڑ یہ ہے۔ یعنی اس کا پس منظر یہ ہے۔ اسی طرح ”ڈھنگ“ اور ”ڈھب“

بکثرت ملیں گے۔ مثلاً اس نے اس ڈھنگ سے بات کی۔ اس نے ایسا ڈھب اختیار کیا۔ یہ

دونوں لفظ طریقہ، نہج، اسلوب اور انداز کے معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔

”بہر حال“ کے بجائے ”بہر آئینہ“ اور ”پہلی ہی مرتبہ کی جگہ“ ”اول و ہلہ“ کے

الفاظ دکھائی دیں گے۔ مثلاً بہر آئینہ یہ کام کرنا ہے۔ اول و ہلہ ہی میں یہ بات میری سمجھ

میں آگئی تھی۔

اہل مکھنؤ کے انداز میں مولانا ندوی تحریر میں اکثر الفاظ کا امالہ نہیں کرتے۔ مثلاً اس بارے میں کو، اس بارہ میں، اس سلسلے میں کو، اس سلسلہ میں، اس مسئلے میں کو، اس مسئلہ میں، اس معاملے میں کو، اس معاملہ میں، لکھتے ہیں۔ لیکن بولتے وقت ان الفاظ کا امالہ کرتے ہیں۔ یعنی بارے میں، سلسلے میں، مسئلے میں، معاملے میں کہتے ہیں۔

### خط اور اندازِ تحریر

مولانا کا خط اتنا اچھا تو نہیں ہے، لیکن پختہ ہے۔ ان کا مسودہ عام طور پر صاف نہیں ہوتا۔ اس میں کانٹ چھانٹ بھی ہوتی ہے اور جگہ جگہ خطرناک موڑ بھی آتے ہیں، جسے دیکھ کر کا تب گھبرا اٹھتا ہے۔ جو کا تب ان کے خط اور اندازِ تحریر سے آشنا نہ ہو، اس کے لیے ان کے مسودے کی کتابت میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ جتنا وقت ان کے ایک صفحے کی کتابت میں صرف ہوتا ہے، اتنے وقت میں صاف مسودے کے دو صفحات کی کتابت بآسانی ہو سکتی ہے۔ میں چونکہ ان کے خط اور اندازِ تحریر سے مانوس ہوں، اس لیے کا تب کو اسے سمجھنے کے لیے مجھ ہی سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ مولانا بھی اسے میرے ہی ”باب تفہیم“ پر دستک دینے کی ہدایت فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ بسا اوقات خود بھی اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے کو سمجھنے اور پھر کا تب کو سمجھانے سے ”عاجز“ آجاتے ہیں۔ مولانا کا ایک ”کمال“ یہ ہے کہ ڈیش کامے کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ جہاں ڈیش کا محل ہو، وہاں کامہ بنا دیتے ہیں اور جہاں کامہ ہونا چاہیے، وہاں ڈیش ڈال دیتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جہاں ڈیش یا کامہ کسی کی ضرورت نہیں ہوتی، وہاں عام طور پر ڈیش ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً ”کہ“ کے آگے ڈیش، ”بلکہ“ کے آگے ڈیش، ”اور“ کے آگے ڈیش۔ اکثر کتابوں کو بھی ان نزاکتوں کا علم نہیں ہوتا، وہ بھی مکھی پر مکھی مارتے چلے جاتے ہیں۔ جو تھوڑا بہت جانتے ہیں، وہ البتہ اس کا خیال رکھتے ہیں اور ہر نشان مناسب موقع پر لگاتے جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کا مسودہ کتابت کے لیے اسی کا تب کو دیا جاتا ہے جو ان کے اس نوع کے کمالات سے باخبر ہو۔ یا پھر کتابت سے پہلے میں خود مسودہ دیکھ کر ایسی چیزوں کی اصلاح کر دیتا ہوں۔

مولانا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھیں اکثر اوقات پیرے بنانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ بس لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مناسب مقام پر وہ بہت کم نئے پیرے بناتے ہیں۔ یہ فرض بھی بے چارہ کا تب انجام دیتا ہے یا میرے جیسا کوئی اور اللہ کا بندہ۔! ان باتوں کی طرف ان کو بارہا توجہ دلائی گئی اور کئی دفعہ عرض کیا گیا کہ ان کا خیال رکھا کریں۔ مگر ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ ”یہ مشکل کام مجھ سے نہیں ہو سکتا“ یعنی پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے، خوب صورت سے خوب صورت الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں، علم و ادب کا حسین ترین گلستان سجایا جاسکتا ہے اور تحقیق و کاوش کی دیدہ زیب دنیا بسائی جاسکتی ہے، مگر ڈیش، کامے اور پیروں کا صحیح مقام متعین نہیں کیا جاسکتا۔

**خصائص و عادات**

مولانا ندوی خود بھی خوش مزاج، خوش اطوار، خوش اخلاق اور خوش گفتار ہیں اور چاہتے ہیں کہ باقی لوگ بھی ان تمام ”خوشات“ سے بہرہ مند ہوں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ مولانا پنجابی میں گفتگو کر رہے ہیں، لیکن اس اثنا میں کوئی علمی سوال کیا گیا تو جواب کے لیے فوراً اردو بولنے لگے۔ بعض اوقات تو اس انداز سے جواب دیتے ہیں کہ بات آسانی سے مخاطب کی سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن چونکہ فلسفے کے آدمی ہیں اور فلسفی مجبور ہے کہ سائل کی ذہنی و فکری سطح کا لحاظ کیے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کرے، اس لیے ایسا فلسفیانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں کہ ہر شخص کے لیے بات کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر فلسفے کی بھاری بھرکم اصطلاحیں اور عربی کے دقیق الفاظ اُسے مزید مشکل بنا دیتے ہیں۔

مولانا کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کسی کے حریف اور مخالف نہیں ہیں۔ کبھی کسی کے درپے آزار نہیں ہوئے۔ ہر شخص سے ہمدردی کا برتاؤ کرتے ہیں، ہر ایک سے اس کے مرتبے کے مطابق انس و محبت سے پیش آتے ہیں اور اس سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ اہل علم کی انتہائی قدر کرتے ہیں اور ان سے ملاقات کے شائق رہتے ہیں۔ حسد، کینہ، بغض، سازش اور غیبت وغیرہ کے الفاظ سے ان کی ڈکشنری خالی اور ان عیوب سے ان کا دل نا آشنا ہے۔

موجودہ دور کے اہل حدیث علما میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف سے انہیں بالخصوص قلبی تعلق ہے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب بھی ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ مولانا ندوی ان کے الدعوة السلفیہ کے رکن بھی ہیں۔ اب دونوں بزرگ بیمار ہیں۔ مولانا عطاء اللہ صاحب تقریباً چار سال سے صاحبِ فراش ہیں اور مولانا حنیف ندوی کم و بیش ایک سال سے بسترِ مرض پر دراز ہیں۔ کافی عرصے سے بیماری کی وجہ سے دونوں کی ملاقات کا سلسلہ بند ہے۔ مگر دونوں کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا ہوں، اور دونوں مجھ سے ایک دوسرے کا حال پوچھتے اور سلام پہنچاتے رہتے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ دونوں بزرگوں کو صحتِ عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔ مولانا ندوی پر زندگی میں کئی دور آئے۔ انتہائی تنگ دستی کا دور بھی آیا اور ان کی توقع سے بہت زیادہ آسودہ حالی کا بھی۔ شدید بیماری کا بھی اور تندرستی کا بھی لیکن ملاں اضطراب اور سخت و رعونت کی آلودگیوں سے مطہ قلب ہر حال میں صاف رہا اور ہر دور میں صابر و شاکر رہے۔ انسان سے اور حالات سے ہمیشہ صلح رکھی اور ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ تنگ دستی اور بیماری کی تکلیفوں کا دور اللہ کی رضا قرار دے کر گزارا، اور آسودگی و صحت کو اس کی نعمتِ عظمیٰ سے تعبیر کیا۔ نہ غربت میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلا یا اور نہ آسودگی میں کبر و غرور کا مظاہرہ کیا۔ چند مخلص دوستوں کے سوا غربت کو سب سے چھپائے رکھا اور کچھ آسودہ حال ہوئے تو آسودگی کی حدود سے بڑھ کر اس کے آثار ظاہر کیے۔

۱۹۳۰ء سے لاہور میں اقامت گزیر ہیں۔ درمیان میں (۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک) تین چار سال گوجرانوالہ میں مقیم رہے۔ لیکن ذاتی مکان کہیں نہیں بنا سکے۔ ۱۹۸۶ء کے اختتام تک کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ گوجرانوالہ میں چھوٹا سا آبائی مکان تھا جو غربت کی مجبوریوں کے باعث فروخت کر دیا تھا۔ قیامِ پاکستان سے قبل معلوم نہیں کیسے اور کہاں سے اتنی رقم آئی کہ مغل پورہ (لاہور) میں پانچ مرلے کا ایک پلاٹ خرید لیا، مگر حالتِ عسرت میں اسے بھی بیچ دینا پڑا۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں بہت ہی سستے داموں ایک کنال کا پلاٹ خریدنا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے بھی سستے بھاؤ فروخت کر ڈالا۔



ہمیشہ توکل اور فناء کی زندگی بسر کی۔ زیادہ سے زیادہ حصول کی بات تو بہت بڑی ہے اور ان کی فطرت و عادت کے قطعی خلاف ہے، کسی قدر زیادہ اور مناسب حصول کے لیے بھی کبھی کوشش نہیں کی۔ جو اللہ نے جائز اور صحیح ذریعے سے دے دیا اس کو بہت سمجھا۔ اس دور میں ان اوصاف و خصائص کے لوگ طبقہ علماء میں بھی اور دیگر طبقوں میں بھی خال خال ہی نظر آئیں گے۔

ان کی ایک عادت یہ ہے کہ دفتر آتے ہیں تو پہلے (کم از کم ان سطور کے راقم سے) چند منٹ کے لیے باتیں ہوتی ہیں اور مبادلہ لطافت کا سلسلہ چلتا ہے۔ پھر ایک ساتھ چائے پی جاتی ہے اور اس کے بعد لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ گھر میں بھی یہی مشاغل جاری رہتے ہیں۔ بیوی بچوں اور پوتوں سے بے تکلفانہ گفتگو کرتے ہیں اور سب کو دوست سمجھتے ہیں اور اسی سطح پر اُن کے ان سے باتیں کی جاتی ہیں۔ گھر میں لطفیوں، باتوں اور چائے سے جو وقت بچتا ہے، اس میں لکھتے بہت کم ہیں، کسی پسندیدہ کتاب کے مطالعہ میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ روزانہ اخبار باقاعدہ پڑھتے ہیں۔ بعض خبروں اور مضمونوں پر تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اخبار میں جو بات قابل تبصرہ ہوتی ہے، اس کے بارے میں پہلے دوسرے کی رائے دریافت کرتے ہیں، پھر اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس پر اچھی خاصی تقریر بھی ہو جاتی ہے اور جو رائے ان کی ہو، اس کو صحیح سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اگر ان سے اظہار اختلاف کیا جائے تو فرماتے ہیں، آپ سمجھے ہی نہیں اور سمجھنا چاہتے بھی نہیں ہیں۔ صحیح بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔

اب آئندہ صفحات میں مولانا حنیف ندوی کے پانچ مضمون درج کیے جاتے ہیں۔ ”نام میں کیا دھرا ہے۔ کیا“ ”الاعلیٰ“ کا لفظ اللہ کے لیے مخصوص ہے؟“ یہ مضمون ۸ ستمبر ۱۹۵۵ء کے الاعتصام کے صفحہ اول پر شائع ہوا۔

”مدرسہ موبیدیہ کے ایک منارے تلے علامہ عینی درس حدیث دیتے تھے۔ سوئے اتفاق سے وہ ایک دن دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ حافظ ابن حجر جو ان کے معاصر اور عالی قدر حریف تھے۔ اس پر کب چوکنے والے تھے۔ انھوں نے اُس کی عجیب و غریب محنوی توجیہ

پیدا کئی اور لفظ ”عینی“ کی رعایت سے خود انہی کی زبان سے یہ کھلوا دیا کہ اس میں میری ہی نظرِ بد کی کرشمہ سازی کو دخل ہے، ورنہ منارہ کہاں گرتا۔ ع۔

فلیس علی جسمی اضرا من العینی

”عینی کے حلقہٴ درس میں جب یہ لطیفہ پہنچا تو انھوں نے بھی چوٹ کی، اور حق یہ ہے کہ اس میں کامیاب رہے۔ انھوں نے کہا، حضرت! اگر منارہ گرا ہے تو نظرِ بد سے نہیں، بلکہ اس لیے کہ اس کی تعمیر میں جو پتھر استعمال ہوا ہے، وہ ناقص ہے۔ ع۔

ما اوجب الهدم الا خيبة الحجر

اس میں ان کا اشارہ ”حجر“ کی طرف ہے، جس کے معنی پتھر کے ہیں۔ معاصرانہ چشمک میں ایسے ایسے لطیفوں کا ہوجانا بالکل قدرتی امر ہے۔

”اول اول میں جب حسرت صاحب نے حرف و حکایت کے کالم میں مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کے نام پر طبع آزمائی فرمائی تو ہم یہی سمجھے کہ یہ بھی تقاضائے تفتن و معاشرت ہے حسرت صاحب چونکہ آج کل موج میں ہیں اور اتفاق سے اس کیمپ سے متعلق ہیں جو بہر آئینہ اسلامی تصورِ دین کا حامی نہیں، اس لیے وہ ان کی خوش نودستی مزاج کے لیے ایسا لکھ رہے ہیں، اور حسرت صاحب میں یہ خوبی ہے کہ دوستی کے متعلقات عموماً ان کے عقیدہ و فکر کو بدلتے رہتے ہیں۔ بسا اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی مجلس میں وہ روایتی مسلمان بھی ہیں اور پکے کمیونسٹ بھی۔ اگر ان کے میمنہ میں چند خوش ذوق مسلمان تشریف فرما ہیں تو حسرت صاحب ان کی رعایت سے یہ کہتے ہوئے سنے جائیں گے کہ صاحب، ہم مسلمان ہیں، آخر ہم اسلام کیسے چھوڑ سکتے ہیں، اور جب میسرہ پر نظر پڑے گی تو کمیونسٹ دوست بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے، ان کی دلجوئی بھی ان کے نزدیک راہ و رسم دوستی کے لحاظ سے ضروری ہے، اس لیے دو چار باتیں ان کے ڈھب کی بھی ہوجائیں گی، مگر یہ دیکھ کر تعجب ہو کہ یہ بات حرف و حکایت کے ذکا ہی کالم سے نکل کر علم و افتاء کے سنجیدہ حلقوں میں پہنچ گئی ہے اور اس میں بڑی دھوم دھام سے بحث بھی ہو رہی ہے۔

”ہم نہیں چاہتے تھے کہ مسئلے کی اس فقہی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ مگر اس کا کیا کیا

جائے کہ بعض دوستوں کی مضمون نگاری اور مقالہ نویسی نے اسے فی الواقع ایک شرعی و دینی سوال بنا ہی دیا ہے اور اب لوگ ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ کیوں صاحب ”ابوالاعلیٰ“ کے نام میں درحقیقت کوئی قباحت ہے؟ اور آپ بھی اس نام کو مشرکانہ ہی سمجھتے ہیں؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ نہیں۔! ہمارے ان کے اختلافات کی نوعیت دوسری ہے۔

”اس مسئلے میں جو الجھاؤ پیدا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ”اعلیٰ“ چونکہ اللہ کے ہزاروں ناموں میں سے ایک نام ہے، اس لیے ”ابوالاعلیٰ“ کے لازماً معنی معاذ اللہ، خدا کے باپ کے ہوں گے۔ حالاں کہ اس کی ذات صمدیت البتہ و البیت کے بھیلوں سے یکسر پاک ہے۔۔۔ لم یلد و لم یولد۔

”اصولاً جو بات اس میں سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جو الفاظ بطور صفات استعمال ہوئے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں :

ایک قسم وہ ہے جو اختصاص و تعیین کے اس مرتبے پر فائز نہیں کہ ان کا اطلاق سوائے ذات باری کے اور کسی پر نہ ہو سکے۔

اور دوسری قسم الفاظ کی وہ ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ پھر اس اختصاص کے بھی مراتب ہیں۔ مثلاً ”رحمن“ اور ”صمد“ دونوں لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ لیکن دونوں کے مرتبہ اختصاص میں فرق ہے۔

وہ الفاظ جو اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی، جیسے حئی، جمیل، حکیم، عقی اور سلام وغیرہ۔ ان کے استعمال میں قطعی کوئی حرج نہیں۔ اس میں دیکھا یہ جائے گا کہ استعمال کرنے والے کی نیت کیا ہے۔ بلکہ استعمال کے قرآن یہ بتائیں گے کہ یہاں مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یا کوئی اور شخص۔ چنانچہ یہ دیکھیے کہ حئی سیکڑوں مسلمانوں کا نام ہوگا، مگر اس میں کبھی یہ غلط فہمی نہیں ہوگی کہ یہ دعویٰ الوہیت کے مترادف ہے۔ تہذیب التہذیب میں بھی اس کی ایک مثال موجود ہے۔ ”جمیل“ اللہ کا پیرا نام ہے، اور ہزاروں اور لاکھوں مسلمان بھی اس نام سے موسوم ہیں۔ تہذیب ہی میں یہ نام پانچ مرتبہ آیا ہے۔ ”الحکیم“ جو معروف باللہام بھی ہے۔ یہ بطور انسانی نام

کے کم و بیش تین تیس مرتبہ تہذیب التہذیب میں مذکور ہوا ہے۔ ”علی“ اللہ کا نام ہے، اور کون نہیں جانتا کہ یہی نام نامی حضرت علی بن ابوطالب کا بھی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ۱۶۳ مرتبہ یہ تہذیب التہذیب میں آیا ہے۔ ہزاروں مسلمان اس نام سے اب بھی موسوم ہوں گے۔ ”سلام“ اللہ تعالیٰ کا نام ہے، لیکن سلام کہلانا ناجائز نہیں۔ چنانچہ تہذیب التہذیب میں ایک راوی بعینہ سلام بن ابی سلام موجود ہے۔ یعنی یہ الفاظ ایسے ہیں جن کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اس درجے کا اختصاص لیے ہوئے نہیں ہے کہ دوسروں کے لیے ممنوع ہو، لہذا ان سے تسمیہ اور تکلفی قطعی جائز ہے۔

”الاعلیٰ“ یا ”اعلیٰ“ بھی من جملہ انہی الفاظ کے ہے۔ اس کا اطلاق قرآنِ حکیم میں مثال پر بھی ہوا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی (نحل) یا وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی (روم) فرشتوں کی ایک قسم کو بھی ”ملاء اعلیٰ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لَا یَسْمَعُونَ الْحَمْدَ الْمَلَاءُ الْاَعْلٰی (صافات) افق کے لیے بھی یہ آیا ہے۔ وَهُوَ بِالْاَفْقِ الْاَعْلٰی (نجم) اسی طرح ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے ”الاعلیٰ“ قرار دیا ہے۔ وَانْتُمُ الْاَعْلٰوْنَ (آل عمران) اور حضرت موسیٰ کو خصوصیت سے ”الاعلیٰ“ ٹھہرایا ہے، فَلَمَّا لَا تَخَفْ اَنْتَ الْاَعْلٰی۔ لَمَّا ”اعلیٰ“ یا ”ابو الاعلیٰ“ کہلانے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔

اس نام پر اعتراض کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ ”ابو“ کا لفظ کھلا ہوا قرینہ ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ انسانی نام ہے، خدا کی صفت نہیں۔ یوں اعتراض کرنے والوں نے کس کو چھوڑا ہے؟ امام ترمذی کی کنیت ”ابو عیسیٰ“ پر بھی اعتراض کیا گیا کہ جب قرآن نے مسیح کی ولادت کو بغیر باپ کے مانا ہے تو یہ مسیح کے باپ کیسے ہوئے؟ مگر دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ خود اعتراض میں وزن کتنا ہے اور اس سے اس شخص کے مقام و فکر میں کیا تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ بات محض تفتن کے طور پر حسرت صاحب نے کہی تھی، یاروں نے خواہ مخواہ اسے فقہ وافتا کے حضور میں پہنچا دیا۔

یعنی ہر ہریال کی کھال اتارنا ---۔۔۔ بدرسہ کہ ہمد کے مصداق ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مودودی صاحب کے مسلک پر کچھ لوگوں کو دیانت داری سے اطمینان نہیں ہے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ یہ لوگ براہِ راست ان کے عقیدہ و فکر کو زیرِ بحث لائیں۔ ”گوریلا وار“ تو قطعی بدذوقی ہے۔ وَاَلْوَالِیُّوْتُ مِنَ الْاَوْبَہَا۔

عبدالعزیز کنانی پر ایک مجلس میں ایک ظریف نے اسی طرح کا اعتراض کیا کہ صاحب آپ خلقِ قرآن جیسے اہم مسئلے پر کیوں کربحث کر سکیں گے، پہلے روئے زیبا تو آئینے میں دیکھا ہوتا۔ آپ نے پورے اطمینانِ قلب سے جواب دیا کہ میرا دعویٰ ذاتی خوب صورتی کا نہیں، قرآن کے غیر مخلوق ہونے کا ہے۔ اس پر کوئی گرفت ہو تو پیش فرمائیے۔

ہم بھی مودودی صاحب کی طرف سے ان حضرات سے کہیں گے کہ اصل چیز عقیدہ، فکر اور جماعتِ اسلامی کا مخصوص طریقِ عمل ہے۔ ان چیزوں پر کھل کر بحث کیجیے، یہ مفید بھی ہوگا اور ذوقِ علمی کی بھی اس سے تسکین ہوگی۔

نام صحیح ہو اور شرع شریف کے عین مطابق بھی ہو تو بھی خیالات و عمل پر گرفت کرنے کا حق قائم رہتا ہے۔ ادویوں چراغِ حسن بھی تو پڑھے لکھے لوگوں کا نام نہیں ہو سکتا۔ لگے ہاتھوں اسے بھی بدل ڈالیے۔ ذوق کی رعایت بھی تو آخر کچھ چاہتی ہے۔“

## وفیات

وفیات پر مولانا حنیف ندوی نے بہت کم لکھا۔ ان کے اپنے زمانہٴ ادارت میں تو اس موضوع سے متعلق الاعتصام میں ان کا ایک بھی مضمون نہیں ہے۔ البتہ میرے زمانہٴ ادارت میں انھوں نے چار بزرگوں پر تعزیتی مضمون تحریر فرمائے جو الاعتصام میں شائع ہوئے۔ ایک علامہ سید سلیمان ندوی پر، دوسرا مولانا چراغِ حسن حسرت پر، تیسرا مولانا ظفر علی خاں پر اور چوتھا سید عطار اللہ شاہ بخاری پر۔ یہ چاروں تعزیتی مضامین علی الترتیب آئندہ صفحات میں درج کیے جا رہے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کے منفرد مضامین ہیں۔

## علامہ سید سلیمان ندویؒ

سید صاحب نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء (۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ) کو کہ اچھی میں وفات پائی۔ مولانا ندوی نے ۲ دسمبر، ۱۱ دسمبر، ۲۵ دسمبر ۱۹۵۳ اور ۸ جنوری، ۲۹ جنوری اور ۵ فروری ۱۹۵۴ء کے الاعتصام کی چھ قسطوں میں ان پر تعزیتی مضمون سپرد قلم فرمایا جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

آہ! موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے ایک ایسی شخصیت چھین لی، جو ہمارے لیے بدرجہ غایت محترم اور موثر تھی۔ علامہ مرحوم دراصل گزشتہ کئی برس سے علیل تھے اور جہاں تک فکر و قلم کی زندگی اور تازہ کاریوں کا تعلق ہے، یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ان کا رشتہ حیات مدت ہوئی اس جانِ ناتواں اور جسمِ نحیف سے منقطع ہو چکا تھا، اور دوستوں اور عقیدت مندوں کو کوئی توقع نہیں رہی تھی کہ بحالاتِ موجودہ سید صاحب کو فی بڑا علمی کارنامہ انجام دے سکیں گے۔ یہ موت تو صرف اُن کے جسم کی موت تھی، ذہن و فکر کا ساز تو ایک زمانے سے خاموش تھا۔ مگر ان کے کارناموں اور خدمات کے پیشِ نظر اور اس صاف ستھری اور بے لوث زندگی کے پیشِ نظر جو انھوں نے بسر کی یہ کنا پڑے گا۔ ان کی موت محض ایک عالم ہی کی موت نہیں ہے، ایک محقق تاریخ نگار اور ادیب ہی کی موت نہیں ہے اور نہ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ تنہا پاکستان یا ہندوستان ہی سے متعلق ہے۔ ان کی موت سے علمی و قلمی مجروح ہوا ہے، شائستگی اظہار متاثر ہوئی ہے، ایک خاص قسم کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کو نقصان پہنچا ہے۔ یہ کہنا کسی طرح غلط نہیں کہ پورے عالمِ اسلامی میں اس حد سے محسوس کیا جائے گا۔ سید صاحب کے اٹھ جانے سے علم و شہرت کے کن کن گوشوں کو نقصان پہنچا ہے؟ اس کا اندازہ تو آئندہ حالات ہی سے ہوگا جب علمی ضرورتیں للکاریں گی اور کوئی سلیقہ اور بھروسے کا آدمی نہیں ملے گا۔ اس وقت بس اتنا ہی سمجھ لیجیے، ایک عرصے تک ادب و علم کی بزمِ آرائیاں ان کے بغیر بے کیفی اور بے رنگی سے دو چار رہیں گی۔

یوں تو ہمارے ہاں پاکستان میں خدا کے فضل سے علم کی کمی نہیں بہتیرے ایسے ہیں جن کی شعلہ مقالی سے گرمیِ محفل کا سامان بہم پہنچ جاتا ہے اور ملک میں اچھی خاصی پھل

چھ جاتی ہے۔ جن کی قلبی جنبشوں سے کتابوں کے انبار لگ جاتے ہیں اور حجم و ضخامت کی دنیا میں ایک طوفان آجاتا ہے، جن کے جبہ و عبا کی ہر ہر شکن زہد و تقدس کی ضامن و متکفل ہے۔ مگر ان میں وہ کون ہے جو سید صاحب کی سی متانت اور خاموشی رکھتا ہو اور بغیر کسی ادعا اور ڈھول پیٹنے کے ایسے ایسے جلیل القدر کام کر جاتا ہو کہ ان پر فخر کیا جاسکے۔ قحط الرجال کے اس دور میں جب کہ ہر طرف سطحیت اور اُتھلے پن کا دور دورہ ہے اور ایسے اہل علم و قلم کا افسوس کا حد تک فقدان ہے جن کی طرف پورے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ دیکھا جاسکے۔ سید صاحب کا ہم کو داغِ مفارقت دے جانا، ایسا حادثہ ہے جس کو آسانی سے نہیں بھلایا جائے گا۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ گزشتہ متعدد برسوں سے ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی آپہنچی تھی اور یہ اپنے اس مقام سے کہ جہاں ان کی بے نظیر شخصیت اور ان کی نمایاں انفرادیت اور عظمت کے علم گڑے تھے، ہٹ کر ایک خاص حلقے اور زاویے میں سمٹ آئے تھے، تاہم ہماری یہ رائے ہے کہ ان کی علمی خدمات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور علم و تحقیق میں ان کے اضافوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ کچھ ناگزیر نفسیاتی مجبوریوں کے پیش نظر سید صاحب نے اپنے کو آخر کے چند سالوں میں تمام علمی و تحقیقی حلقوں سے الگ کر لیا تھا اور اس میں اس حد تک غلو تھا کہ ان کو اپنے ہی ان کارناموں پر شرم محسوس ہونے لگی تھی، جو بیک وقت اتنے شاندار ہیں اور اتنے روحانی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے مزید تصوف آزمائی کی ضرورت نہیں تھی، لیکن بہر آئینہ یہ اُن کا ایک ذاتی فعل تھا اور ایسا رجحان تھا جس کو اپنانے میں وہ قطعی مجبور تھے۔ اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اس گراں قدر ہستی کے انتقال پر افسوس ہے اور اس صاحبِ علم و فضل کی وفات کا غم ہے، جس نے سیرت النبی کے بقیعہ ابواب و فصول کو اپنی ہنرمندیوں سے سجا یا، جس نے سیرت عائشہ لکھ کر ثابت کیا کہ ازواجِ مطہرات کی فضیلت صرف اس بنا پر نہیں تھی کہ ان کا تعلق آنحضرت سے میاں بیوی کا تھا، بلکہ ان کی بریں و سمیت کا راز ان کی سیرت و اخلاق اور مجتہدانہ بصیرت میں پنماں تھا۔ جس نے خطباتِ مدرّس لکھ کر ہزاروں واعظوں کے لیے سامانِ وعظ مہیا کیا اور آنحضرت کی جامعیتِ کبریٰ کو اس

انداز سے ثابت کیا، اور آپ کے کردار و سیرت کے ایک ایک خدو خال کی حفاظت و مسیانت کو اس طور پر واضح کیا کہ فتنہ انکارِ حدیث کے دروازے کم از کم معقول لوگوں پر تو بند ہی ہو گئے۔

ہمیں علامہ مرحوم کی زندگی کے ان لمحات سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں انھوں نے اپنی ذات کو حنفیت کے ایک تنگ اور جامد خانے میں محبوس کر لیا تھا اور ان جگہ بندیوں کو پھر سے اختیار کر لیا تھا جس کو خود انھوں نے اور ندویت نے برسوں کی کاوش و محنت سے توڑا تھا، ہمیں ان کی زندگی کے ان اوقات سے بھی بحث نہیں، جس میں انھوں نے روحانیت کی ایک خاص فقیہانہ شکل کو اپنا لیا تھا اور بظاہر ہم سے کٹ چکے تھے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، برسوں کے علمی مشغلوں نے ان کے جسم میں اتنی سکت ہی نہیں رہنے دی تھی کہ عمر کے آخری لمحوں تک وہ اس انداز کو قائم رکھ سکتے کہ جس کی علامہ شبلی نے طرح ڈالی تھی۔ لیکن اس علمی گدی و ازاد کے باوصف ان کی خدمات اور علمی کاوشوں کے ایسے پہلو موجود ہیں جو زندہ ہیں، جوان ہیں اور جن میں استدلال و فکر کی وہی جولانیاں ہنوز تازہ ہیں۔ اس لیے ہمارے دل میں اس سید سلیمان کے لیے اب بھی پوری پوری جگہ ہے جس نے کہ ہمارے علم و ادب کو اپنی معلومات و معارف سے مالا مال کیا اور ایک خاص نوع کی دینی بصیرت پیدا کی۔

### سید صاحب کا ایشار

دار المصنفین اعظم گڑھ کو گو علامہ شبلی مرحوم نے قائم کیا، لیکن اس کو ایک کامیاب ادارہ اور موسسہ کی شکل میں سید صاحب کی کوششوں نے ڈھالا اور انہی کی وجہ سے اس کی شہرت کو چار چاند لگے۔ یہ اگر چاہتے تو بڑی گراں قدر تنخواہ اور مشاہرے پر کسی یونیورسٹی میں بڑی آسانی سے پروفیسر ہو جاتے۔ لیکن پروفیسری پر لات مار کر تو یہ آئے تھے، اس لیے ان کا اصول تھا کہ علم کی خدمت و ثروت کے حصول سے کہیں بہتر ہے۔ باہر کے لوگوں کو شاید اس چیز کا علم نہیں کہ سید صاحب ایسا لگانے روزگار عالم کتنے کم معاوضے پر سارا سال تک دار المصنفین میں بیٹھا، علم و معارف کی اشاعت میں مصروف رہا، حالانکہ ان سے



بہت ہی کم دہجے کے لوگ بڑی بڑی ملازمتوں پر فائز تھے اور ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی یہ فطری درویشی اور قناعت ہی تھی کہ جس کی بدولت یہ ایک جگہ جم کر کام کرنے کے لائق ہو پائے اور بلند پایہ تصنیفات کو آئندہ نسلوں کی راہ نمائی کے لیے چھوڑ گئے۔ ورنہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ دولت کی بھوک اور ثروت کی بے پناہ طلب نے ان کی اچھی خاصی صلاحیتوں کو ضائع اور برباد کر دیا۔

کسی علمی کام کے معاوضے کے دوہی معیار ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس شخص کے رتبہ و مقام کو ملحوظ رکھ کر رقم کی تعیین کی جائے اور دوسرے یہ کہ اسے اتنا دیا جائے جس سے اس کا دماغی سکون برقرار رہے اور وہ فراغت و دل جمعی سے اپنے مشغلوں کو جاری رکھ سکے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ دارالمصنفین میں جو لوگ بڑے اونچے پیمانے کا علمی کام کرتے تھے، ان کی تنخواہیں ان دونوں معیاروں کے اعتبار سے بھی کم تھیں۔

غالباً ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے، علامہ مرحوم کی دعوت پر خاکسار کو ایک مہینے کے لیے دارالمصنفین میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا، دل چاہا کہ کسی نہ کسی طرح اس بنیم علم میں شرکت کا موقع مل جائے۔ علامہ مرحوم سے اس آرزو کا ذکر کیا، تو آپ مسکرائے (اور وہ صرف مسکراتے تھے، ہنسی اور قہقہے نے ان کے پُر شکوہ و قار و سنجیدگی کو کبھی مجروح نہیں کیا تھا) فرمایا، بھائی! تمہاری ضروریات و مجبوریوں کا مجھے علم ہے، ہماری صاف ستھری زندگی، اور ایک خاص قسم کی وضع داری پر نہ جاؤ، یہاں ہمیں جو کچھ ملتا ہے وہ اتنا تھوڑا ہے کہ تم اس پر گزر نہیں کر سکتے۔ اس وقت اپنی مجبوریوں پر تو جو افسوس ہوا وہ ہوا ہی، زیادہ تعجب اس امر پر ہوا کہ یہ لوگ کس قدر بے نفسی سے اور ایثار سے کام لے کر اتنے بڑے ادارے کو چلا رہے ہیں۔

ایثار و قربانی کا یہ جذبہ ان میں فطری تھا۔ ایک مرتبہ بدولہی ضلع سیالکوٹ میں جمعیت اہل حدیث کا جلسہ تھا۔ لوگوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس میں سید صاحب بھی تشریف لائیں۔ چنانچہ خط لکھنے کو تو لکھ دیا گیا اور اس میں شرکت کی باقاعدہ دعوت بھی دے دی گئی، لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اتنا بڑا آدمی اپنے علمی مشغلوں کو چھوڑ کر، کیا پنجاب کے قطعی غیر معروف

اور دُورِ افتادہ گاؤں میں آسکے گا، مگر ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب ہم نے دیکھا کہ یہ اہل حدیث کے چھوٹے سے جلسے میں بہ نفسِ نفیس تشریف لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں سننے کی بات یہ ہے کہ اعظم گڑھ سے بدو ملہی تنگ کے مصارفِ سفر سید صاحب نے خود برداشت کیے۔ اہل جلسہ نے ان سے بہتیرا کہا کہ جناب کچھ تو قبول فرمائیے اور زیادہ نہ سہی، ریل کا کرایہ تو آپ کو لینا چاہیے، مگر آپ نے یہ کہہ کر قصہ ختم کر دیا کہ یہ تو میرا اپنا مشن تھا، کیا اس پر بھی کسی صلے کا آپ مجھے مستحق سمجھتے ہیں — آہ! یہ ایثار پیشہ لوگ! اور یہ بے نفس ہستیاں!!

ان میں اور علامہ شبلی میں فرق، ان کا نقطہ نظر زیادہ صائب تھا۔

ان میں اور علامہ شبلی میں کیا فرق تھا؟ اندازِ تصنیف اور طرزِ نگارش میں، ان میں وہ کیا خصوصیات تھیں، جو ان کو میز کرتی تھیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے، اور آئندہ مورخ جب ان کی تاریخ لکھے گا اور ان کی تصنیفات پر نظر ڈالے گا تو خصوصیت سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ علامہ شبلی مرحوم میں جو ذہانت، جودتِ فکر اور جامعیت و وسعت تھی، اور ان کے اسلوبِ تحریر میں جو ادبیت، بے ساختہ پن اور ایک خاص قسم کی دلاویزی تھی، اس کا تتبع مشکل ہے، اور شاید اس تتبع اور پیروی میں ان کے شاگردوں میں سے مولانا عبدالسلام ندوی ہی کامیاب ہوئے ہیں (اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے) لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں تک نقطہ نظر کی اصابت و درستی کا تعلق ہے، علامہ مرحوم اپنے استاد سے سبقت لے گئے ہیں۔

علامہ شبلی مرحوم کا تاریخ اور دینیات میں لکھنے کا یہ جانا بوجھ طریقی تھا کہ غور و فکر اور مطالعہ سے پہلے چند مفروضات اور مقدمات کو ذہن میں قائم کر لیتے، اور اس کے بعد اُن کے مطابق آگے قدم بڑھاتے اور موضوع کو پھیلاتے اور روایات و احادیث کی ترجمانی میں اس تعبیر کو صحیح سمجھنے اور لائقِ استدلال ٹھہرتے، جو ان کے قائم کردہ مفروضات کے موافق ہوتی۔

ان کی یہ روش خاص، ان کی تمام تصنیفات میں برابر نمایاں ملتی ہے۔ چنانچہ جاننے

والے جانتے ہیں کہ تحقیق کا یہی انداز سیرت النعمان میں ہے، اسی کی جھلک سیرت النبی میں پائی جاتی ہے اور اسی طریق استدلال سے انھوں نے علم الکلام وغیرہ میں کام لیا ہے۔ اس کے برعکس علامہ سید سیاحان ندوی مرحوم کا طریق استدلال یہ تھا کہ مفروضات کو کتاب و سنت کے مقتضیات کے ہم آہنگ رہنا چاہیے۔

نقطہ نظر کی یہی اصابت تھی، جس نے سید صاحب مرحوم کو اہل حدیث کے حلقوں کے اتنا قریب کر دیا تھا کہ ایک زمانے میں ہمارے دوست مولانا امام خاں نوشہروی نے انھیں علمائے اہل حدیث میں شمار کیا، حالانکہ اہل حدیث کے معروف تصور کے اعتبار سے وہ کبھی بھی اہل حدیث نہ تھے۔

### الندوہ، الملل اور معارف

الندوہ میں انھوں نے جس دور میں لکھنا شروع کیا، وہ زمانہ تھا جب مضمون نگاری کی دنیا میں وہ نئے نئے آئے تھے۔ الملل میں بھی انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا رنگ ان پر چھایا ہوا تھا۔ اور انہی پر کیا موقوف ہے، الملل میں اس زمانے میں جس نے لکھا، اسی رنگ سے متاثر ہو کر لکھا، کیونکہ اس وقت پورے ہندوستان میں انہی کے جادوئے قلم کا چرچا تھا اور ناممکن تھا کہ کوئی لکھنے والا اس موج، متلاطم اور پُر شور دریا نے فصاحت و بلاغت سے بچ کر اپنی انفرادیت اور اسلوب کو قائم رکھ سکے۔

علامہ مرحوم کے جوہر اس وقت کھلے جب انھوں نے معارف میں تحقیق و نگارش کا ایک خاص انداز اختیار کیا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں انھوں نے اپنی بے بہا تصانیف سے علم و ادب کی خدمت انجام دی، وہاں انھوں نے معارف کے ذریعے اہل قلم کے سامنے تحقیق و کاوش اور محنت و سلیقہ کے نہایت عمدہ نمونے پیش کیے اور مضمون نگاری اور نکتہ سنجی کی نئی نئی دنیا میں کھولیں۔

اس وقت کے معارف کا کیا معیار تھا؟ اور کون کون لوگ اس میں لکھتے تھے؟ اس کو دیکھ کر اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ علم و ادب کی یہ کتنی بڑی خدمت تھی — یقیناً اس

وقت کے معارف کو صرف ایک پرچہ اور رسالہ سمجھنا غلطی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی حیثیت ایک ادارہ علمی کی تھی، جس سے کہ متعدد اہل علم و قلم نے فائدہ اٹھایا — معارف کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے لکھنے والوں کے ذوقِ علمی و دینی کی کستیں بدلیں، یعنی پہلے اگر اس وقت کے علما، امکانِ کذب اور امکانِ نظیر کے مسئلوں پر اپنی قوتیں صرف کرتے تھے، تو اب انھیں معلوم ہوا کہ تاریخِ اسلامی کا اہم اور سنجیدہ موضوع ان کی کاوش و محنت اور ذہانت و ذکاوت کا منتظر ہے۔ معارف نے پہلی دفعہ اور کامیابی کے ساتھ اسلامی تاریخ کے بٹے ہوئے نقش و نگار کو اجاگر کیا اور لکھنے والوں کا ایک گروہ تیار کیا، جس نے کہ اسلامی تاریخ کے مختلف گوشوں کے بارے میں نہایت ہی قیمتی معلومات بہم پہنچائیں، اس اعتبار سے معارف کی اہمیت ہمارے نزدیک ان کی باقاعدہ تصنیفات سے بھی زیادہ ہے۔

### سید صاحب کی سیاسی خدمات

سید صاحب مرحوم کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مشترکہ ہندوستان کی کوئی تحریک ایسی نہیں جس میں انھوں نے شایانِ شان حصہ نہ لیا ہو۔ انجمن ترقی اُردو کا غفلہ بلند ہوا تو انھوں نے بڑے زور سے اس کی تائید کی۔ جمعیت علمائے ہند کے دینی سیاسی حلقوں میں انھیں ہمیشہ اجلال و احترام سے جگہ دی گئی، خلافت کا چرچا ہوا تو دار المصنفین کے پرسکون گوشے سے نکل کر اس میں شریک ہو گئے اور اس کے اہم اجلاسوں کی صدارتیں کیں۔ پھر جب بیٹے ہوا کہ اتحادیوں کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈا کا اس کے گھر میں پہنچ کر جواب دینا چاہیے اور ایک ایسا وفد ترتیب دینا چاہیے جو یورپ میں گھوم پھر کر مسئلہ خلافت کے بارے میں شکوک و شبہات کا ازالہ کرے تو اس میں اس بنا پر سید صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں کہ ان سے بہتر اور کون اس مسئلے کے صحیح تاریخی و دینی موقف کی وضاحت کر سکتا ہے۔ اس وقت یورپ کے مدبرین جن کے قافلہ سالار لارڈ جارج تھے، دراصل یہ چاہ رہے تھے کہ ترک اپنی ریاست کو کہیں دینی قالب میں ڈھال دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں اور عالمِ اسلامی کے دباؤ سے مجبور نہ ہو جائیں کہ پھر ان جذبات و عواطف کو زندہ کریں جن کو ختم کرنے کے لیے نشر و اشاعت کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا اور جن کو بھیاناک

اور قابلِ نفرت ٹھہرانے کے لیے جھوٹ اور افترا کی پوری شینیزی کو حرکت میں لایا گیا تھا۔ سید صاحب اس قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے، لائڈ جارج سے ملے، پاپائے روم سے گفتگو کی، اور پیرس میں مشہور و معروف عربی خطبہ ارشاد فرمایا۔

مکہ معظمہ میں ابنِ سعود مرحوم نے جب مؤتمرِ عالمِ اسلامی کا اعلان کیا تو علامہ مرحوم نائبِ صدر کی حیثیت میں اس میں شریک ہوئے۔ افسوس کہ مؤتمرِ عالمِ اسلامی کا یہ تصور پروان نہ چڑھ سکا، ورنہ آج پورے مشرقِ اوسط کی سیاسیات کا رنگ دوسرا ہی ہوتا۔

نادر شاہ نے جب افغانستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو ارادہ کیا کہ کابل یونیورسٹی کا نصابِ تعلیم ایسے لوگوں کے مشورے سے طے پائے جو علم و فضل میں سندھ مانے جاتے ہوں۔ چنانچہ سید صاحب کو اس غرض کے لیے خصوصیت سے بلاایا گیا اور انھوں نے اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ اس فریضے کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا۔

### عربی ادبیات میں ان کا پایہ

تاریخِ اسلامی کے علاوہ ادبیاتِ عربی پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی۔ عربی بلا تکلف اور ایسی بولتے تھے کہ بقول ان کے، اس پر خود اہل زبان کو رشک آتا تھا۔ قرآن پر چونکہ اکثر غور کیا تھا اس لیے اس کی زبان اور اسالیب پر بہت عبور ہو گیا تھا۔ عربی زبان میں ایک دشواری صلات اور حروفِ روابط کی ہے۔ اچھے اچھے ادیب بھی جب لکھتے اور بولتے ہیں تو صدمات کے معاملے میں ان سے اکثر چوک ہو ہی جاتی ہے۔ کس فعل کا کیا صلہ ہونا چاہیے اور کن حروف کے ساتھ اسے آنا چاہیے۔ اس پر سب سے بہتر اور قابلِ اعتماد بلکہ حرفِ آخر قرآنِ حمید ہے۔ سید صاحب مرحوم کو چونکہ اس کتابِ ہدیٰ سے بے حد شغف تھا، اس لیے انھیں صلات کی خوب مشق تھی۔ وفہِ خلافت کے دوران میں جب یہ مصر میں ٹھہرے تو انھوں نے اپنے اس علم و مطالعہ کی روشنی میں بڑے بڑے ادباءِ مصر کو ان کی اس طرح کی غلطیوں پر متنبہ کیا اور ثبوت میں قرآنِ حمید کی آیات پیش کیں۔ ان کی اردو تصنیفات تو اس قدر مقبول ہیں کہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان ایسا ہوگا جو ان سے ناواقف ہو۔ لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ ان کو عربی زبان میں کس درجہ مہارت تھی۔

ان کا ایک رسالہ عربی میں غیر مطبوع ہے، جس میں کہ انھوں نے ان علما کے سوانح حیات بیان کیے ہیں اور ان حضرات کی خدمات کا نقشہ کھینچا ہے، جنھوں نے جغرافیہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ عربی اشعار کا ایک مکمل دیوان بھی ہے جو عرصہ ہوا، ادبائے بیروت نے اشاعت کے لیے مانگا تھا تھا، لیکن سید صاحب مرحوم نے نہیں بھیجا۔

ان کی موت ایک عہد اور دور کی مہلت ہے

ان کا ایک ایک لمحہ علم و فن کی خدمت میں گزرا۔ افسوس نامورانِ علم و دین کا جو سلسلہ الذہب مولانا عنایت رسول چریاکوٹی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا شبلی اور سید سلیمان مرحوم سے قائم تھا اور جو صرف سید مرحوم کے وجود سے زندہ تھا، آج وہ نظروں سے اوجھل ہے اور آنکھیں اس پر اشک بار ہیں — سید صاحب کی موت ایک عالم اور کامیاب و دقیقہ رس مصنف کی موت ہی نہیں، بلکہ پورے اس عہد اور دور کی موت ہے، آج سے چالیس پچاس برس پہلے جس کی ضیاء یابیوں سے پورا ہندوستان منور تھا۔ اپنے اس زمانے کے انحطاط کو دیکھیے، علم و فن کے افلاس اور ذہن و فکر کی کم مائیگی پر نظر ڈالیے اور پھر بتائیے کہ ایسے جلیل القدر لوگوں کے اٹھ جانے سے، اگر دل ملول و افسردہ ہیں اور آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں تو اس میں کیا بے جا ہے:

كنت السواد لمقلتي فبكى عليك الناظر

من شاء بعد فليمت فعليك كنت احازم

پہلی ملاقات اور پہلا تاثر

سید صاحب مرحوم سے پہلی ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ میں اس زمانے میں طالب علم تھا اور علامہ مدوح ندوہ کے معتمد تعلیمات - ہم درس طلبہ نے ڈرا رکھا تھا کہ ان کا سامنا نہ کرنا ورنہ سوالات کی بوچھاڑ ہوگی اور تم ہو گے اور ایسی ایسی باتیں پوچھی جائیں گی کہ تمھارا رنج ہو جانا یقینی ہے۔ لیکن یہاں یہ شوق دامن گیر تھا کہ جس سیریلان کو معارف کے علمی مضامین میں دیکھا ہے اور جس کی اثر آفرینیوں کا اندازہ سیرت النبی میں کیا ہے، اس کو قریب سے، محسوس اور متشکل قالب میں بھی دیکھا جائے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ میں پہلو بچاتا، خود ان کے

ہاں پہنچ گیا — بڑی محبت اور شفقت سے ملے اور خلافِ معمول مجھ سے کوئی بات انھوں نے نہ دریافت فرمائی — قصہ دراصل یہ تھا کہ ندوہ کے طالب علموں کے بارے میں چونکہ ان کو بڑی تشویش رہتی تھی کہ مبادا ان میں کوئی علمی خامی نہ رہ جائے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ جب یہاں سے فارغ ہو کر یہ نکلیں تو اس لائق ہوں کہ ملک کی اہم درس دہوں کو سنبھال سکیں۔ چنانچہ جب بھی ندوہ میں تشریف آوری ہوتی تو کئی کئی دن تک قیام رہتا۔ اس دوران میں طلباء کی علمی و اخلاقی حالت کا تفصیلی جائزہ لیتے۔ کیونکہ بحیثیت معتمد تعلیمات کے یہ اُن کے فرائض میں داخل تھا۔ اس سلسلے میں ان کا معمول یہ تھا کہ طلبہ سے مل کر مختلف النوع سوالات کرتے، کسی سے صیغہ پوچھتے، کسی سے تعلیل دریافت فرماتے، کسی سے فقہ و کلام کی کوئی بحث چھیڑتے اور کسی کسی کی آشفستگی لباس و وضع پر گرفت کرتے۔ اس احتساب کا نتیجہ یہ تھا کہ طالب علم ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ میں چوں کہ ابتداء ہی سے بحث و مناظرے کے چسکے سے آشنا تھا، اس لیے اس چیز سے مطلق نہیں گھبراتا تھا کہ خدا جانے سید صاحب کیا پوچھ بیٹھیں۔ بلکہ کچھ اس نیت سے بھی سید صاحب سے خود ملنے کی جرات کر بیٹھتا تھا کہ اس طرح میری معلومات میں اور اضافہ ہوگا اور ایک بڑے آدمی سے پنجرہ آزمائی کا موقع ملے گا۔ سید صاحب میرے مناظرانہ ذوق سے آگاہ تھے اور میری اس کمزوری کو جانتے تھے، اس لیے جب بھی کلام، فلسفہ اور دینی مسائل پر اس انداز سے گفتگو فرماتے کہ جس سے نہ صرف میرے اس ذوق کی باحسن و جرتسکین ہو جاتی، بلکہ مجھے ان کی علمی عظمتوں کا بھی پتا چلتا اور دل میں یہ تاثر ابھرتا کہ اسلامیات سے متعلق ان کے بتحرر اور فضیلت کا جو عالم ہے، یہ عام مناظرہ قسم کے علما میں نہیں۔ ان کی معلومات نسبتاً محض سطحی ہیں۔ یہ تاثر جو اوّل اوّل ندوہ کی صحبتوں میں پیدا ہوا تھا اور سید صاحب کی مخصوص توجہات سے پختہ ہوا تھا، آہستہ آہستہ بحث و مناظرہ سے کلی نفرت پر منتج ہوا اور ثابت یہ ہوا کہ علم قیل و قال اور معارضہ و دلیل سے کہیں زیادہ کاوش اور گہرائی چاہتا ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ علم ہی نہیں ہے، فسطائیت کی ایک گھٹیا شکل اور چربہ ہے بلکہ یہ دین کا بھی کوئی اعلیٰ تقاضا نہیں۔ انبیاء کے طریقِ دعوت میں ایسی پاکیزگی، نفسیاتی رعایتیں اور مقبولیت ہوتی ہے کہ جو مناظرانہ

اور چھ پن میں نہیں پائی جاسکتی۔  
طبیعت کا انداز اور لطائف

سید صاحب وضع کے بہت پابند تھے، جس شخص سے جس نہج کے ساتھ ابتدا میں تعلقاً استوار ہوئے آخر تک اسی جوش اور اخلاص کے ساتھ قائم رہے۔ میں نے سید صاحب سے کچھ پڑھا لکھا نہیں، اگرچہ سیکھا بہت کچھ ہے اور وہ میری زندگی کا بڑا ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جس محبت و شفقت سے وہ پہلے روز ملے تھے اسی انداز کو آخر تک نبایا۔ عام لوگوں کو ان کی کم آمیزی اور لیے دیے رہنے سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید ان میں پندار حد سے زیادہ ہے اور یہ کسی سے لپک کر ملنے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ وہ چونکہ علمی آدمی تھے اور سمجھ سوچ کر ایک مخصوص وضع انھوں نے اپنائی تھی، اس لیے ملنے جلنے اور تعلقات قائم کرنے میں وہ یہ دیکھ لیتے تھے کہ اس سے کیا علمی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اور آیا اس سے اس وضع اور انداز کو تو نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شخص سے جس کے متعلق اُن کو یہ معلوم نہ ہو کہ کیسا انسان ہے اور کس غرض سے آیا ہے، وہ کھل کر نہیں ملتے تھے اور نہ یہ مناسب ہی سمجھتے تھے۔ لیکن جن لوگوں سے ان کے مراسم ایک مرتبہ قائم ہو گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ ملنے کے لائق ہیں، ان سے بڑی ہی بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ اسی کم آمیزی سے لوگوں کو ان کی طبیعت کے بارے میں بھی شدید غلط فہمی ہوئی اور خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا گیا کہ یہ بس علم و فضل ہی کا سپیکر نہ رہے ہیں، جس تفتن سے یکسر محروم ہیں۔ حالانکہ ان کے لطائف نہایت شاندار ہوتے تھے۔ اس میں طنز، تنبیہ اور بلاغت کیا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ علامہ اقبال مرحوم کے متعلق ایک لطیفہ سنئے۔ ایک مرتبہ ان کے ہاں انجمن حمایت اسلام کی ایک سب کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی، جس کا ایک ممبر میں بھی تھا اور سید صاحب مرحوم کو بھی علمی مشورہ کے لیے بلا لیا گیا تھا۔ علامہ اقبال مرحوم میں ایک کمزوری یہ تھی کہ جتنا یہ اپنے اشعار میں اونچے تھے اور اپنے فلسفہ و افکار میں گہرے اور عمیق تھے، اتنا بات چیت میں بلند نہیں تھے، اردو خالص پنجابی لب و لہجہ میں بولتے تھے اور بقول طباطبائی کے 'جی ہاں' کے بجائے، 'ہاں جی' کہتے تھے اور جب کسی مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے



تو اکثر توازن و اعتدال کے حدود سے متجاوز ہو جاتے تھے۔ اس پر سید صاحب نے کہا، ڈاکٹر صاحب! آپ کو جو کچھ فرمانا ہو، بس نظم ہی میں فرمایا کیجیے۔ کیونکہ آپ کی نثر میں وہ بات ہرگز نہیں جو نظم و شعر میں ہے۔

دارالمصنفین میں ایک دفعہ ان کی ایک تصویر دیکھی۔ یہ گروپ فوٹو تھا، جس میں ان کے علاوہ عالمِ اسلامی کی کچھ اور علمی و دینی شخصیتیں بھی تھیں۔ مجھ سے کہا، جانتے ہو یہ کیلئے؟ میں نے عرض کیا آپ کی تصویر ہے۔ فرمایا نہیں۔ یہ تصویر کے جواز کا فتویٰ ہے۔ مقصد یہ تھا کہ جب میں نے اور ایسے ایسے نامور حضرات نے، تصویر کھنچوائی ہے تو اس کے جائز ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب سید صاحب فی الواقع فوٹو کے جواز کے قائل تھے اور اس پر ایک طویل سلسلہ مضامین پر قلم کر چکے تھے۔

اپنے معتمدی اور نظامت کے عہد میں ایک مرتبہ ندوہ کے ایک طالب علم سے، جس کی داڑھی خاصی بڑھ آئی تھی، پوچھا کہ میاں کس درجے میں پڑھتے ہو؟ اس نے شاید یہ کہا کہ چہارم میں یا پنجم میں۔ آپ کو یہ سن کر تکلیف ہوئی کہ اس عمر میں بھی یہ درجہ چہارم یا پنجم سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ فرمایا میاں تمہارا علم تمہاری داڑھی سے بہت چھوٹا ہے، اس لیے یا تو علم میں ترقی کرو یا داڑھی کی ترقی کو روکو۔

اسی طرح کے بیسیوں لطیفے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں تفتن و مزاح کی صلاحیتیں موجود تھیں اور وہ اس طرح خشک اور متکشف نہیں تھے جیسا کہ بعض لوگوں نے سرسری ملاقاتوں سے اندازہ کیا۔

## آخری ملاقات

علامہ مرحوم سے آخری ملاقات ”جامعہ اشرفیہ“ میں ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ مولانا عبدالباری جو پہلے پروفیسر عبدالباری تھے، اس وقت علامہ مرحوم کی معیت میں لاہور آئے تھے۔ ان سے بھی یہیں علیک سلیک ہوئی۔ اللہ! اللہ! ان لوگوں میں کیا کیا انقلاب آئے، یا تو ہم اس عبدالباری صاحب کو جانتے تھے جنہوں نے برکلے کی ارتباہیت پر قلم اٹھا یا تھا، مذہب و عقلیات پر بحث کی تھی اور سیرۃ النبی کے ان ابواب پر کامیاب طبع آزمائی کی تھی، جن کا تعلق

معجزات و خوارق سے تھا یا اب ایسے عبدالباری سے دوچار تھے، جن پر فلسفہ و حکمت کے کسی شائبہ تک کا پتا نہ چلتا تھا۔ بالکل یہی حال خود علامہ مرحوم کا تھا، ان میں بھی جو کایا پلٹ ہوئی اس کا بھی یہی انداز تھا۔ یا تو ہم اس سید صاحب سے آشنا تھے اور برسوں ایسی جامع شخصیت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا تھا کہ جن کی مجلس میں علم و ادب کے چرچے بہتے تھے، بات بات میں نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کا ثبوت دیا جاتا تھا اور تفتن و مزاح کے ایسے عمدہ نمونے پیش کیے جلتے تھے کہ جن پر وجد طاری ہو جاتا تھا اور یا اب ایسی ذات کا سامنا تھا کہ جس پر اس سے بالکل مختلف دوسرا ہی رنگ چھایا ہوا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ اب علامہ مرحوم ایسے لوگوں میں رہ رہے تھے جو ان کی بلندیوں اور عظمتوں سے قطعی آگاہ نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ذہنی سطح کے اعتبار سے ان میں اور علامہ مرحوم میں بڑا فرق تھا۔ سید صاحب جب ان لوگوں میں سے ایسے اشخاص کو ”حضرت صاحب“ کہہ کر پرکارتے تھے کہ جن کا علمی درجہ اور علمی خدایات ہرگز اس لائق نہیں تھیں کہ وہ اس طرزِ تشاطب کے سزاوار ٹھہرتے تو ہمیں بے حد تکلیف کا احساس ہوتا اور مارے شرم کے ہماری گردن جھک جاتی۔ سچ بات یہ ہے کہ سید صاحب کا ”یہ ایشائے نفس“ ہمیں اس لیے بھی نہیں بھایا کہ انھوں نے ازراہِ اخلاص جس چیز کو تصوف و تقویٰ اور کردار کی بلندی سمجھ لیا تھا وہ ایک خاص طرح کی مقررہ زندگی، متعین چھاپ اور رکھ لکھاؤ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

جس طرح اسلام ایک طرح کی حکمت ہے اسی طرح تصوف بھی زندگی کے جامع تصور کا نام ہے۔

کیونکہ اسلام جس طرح ایک جامع اور ہمگیر حکمت ہے اور اس سے مراد زندگی کی تنہا کوئی ایک ہی شاخ نہیں ہو سکتی، اسی طرح تصوف و تقویٰ کا مفہوم یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے مقصود زندگی کے بعض جانے بوجھے گوشے ہی ہیں۔ بلکہ یہ تو پوری زندگی کے مقابلے میں محض ایک طرح کے طرزِ فکر اور اندازِ خیال کا نام ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص تصوف کی طرف مائل ہو گیا ہے تو اس سے ہمارا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس نے عمل کے لیے زیادہ حکیمانہ، زیادہ استوار اور مخلصانہ بنیادیں تلاش کر لی ہیں۔ یعنی اب یہ شخص اس لیے نہیں جی رہا ہے کہ

دولت و ثروت اس کے قدم چومے، شہرت و ناموری اس کا کلمہ پڑھے اور عزت و وجاہت اس کی چاکری کرے، بلکہ ان سب دواعی و اسباب کے علی الرغم اس کے عمل کے محرکات اب کچھ اس طرح کے ہو گئے ہیں کہ یہ آخرت کو دنیا سے کہیں زیادہ لائق غور سمجھنے لگا ہے اور عوام الناس اور اربابِ حکومت و جاہ کی خوشنودی سے کہیں بڑھ کر احکم الحاکمین کی خوشنودی اس کے مد نظر ہے۔ یہ نہیں کہ دنیا کی عارضی مسرتیں اس کا نصب العین ہیں — یہ تبدیلی صرف نقطہ نگاہ اور نیت کی تبدیلی ہے، زندگی کی بوقلمونی اور زرگارنگی اس سے متاثر نہیں ہوتی — گویا تصوف اختیار کرنے کے باوجود یہ ممکن ہے کہ گوناگوں علمی مشغلے جاری رہیں۔ زندگی میں بے لاشت و انشراح اور نشاطِ کار کی صلاحیتیں قائم رہیں اور ادب، حکمت، فلسفہ، تاریخ اور فن و شاعری کی وہ تمام کیفیتیں اور نوعیتیں جو ان کی توں باقی رہیں جن کو پہلے سے اپنا رکھا ہے۔ بلکہ ان تمام چیزوں میں پہلے سے زیادہ چمک اور رونق پیدا ہو جائے — تصوف کے یہ اونچے معنی تو ہماری سمجھ میں آتے ہیں کہ ایک ادیب اور اچھا ادیب ہو جائے، ایک مورخ زیادہ ذمہ دار مورخ بن جائے اور ایک فلسفی و حکیم اپنے فلسفے کے لیے پہلے سے بڑھ کر استوار بنیادیں تلاش کر لے۔ لیکن یہ کہ یہ نفسِ زندگی ہی سے دست بردار ہو جائے، قلم توڑ دے اور خاص طرح کے تکلفات اور اندازِ زیست کو تقویٰ و کردار کی عمدہ مثالیں قرار دے لے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آنے والی نہیں۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو سید صاحب مرحوم اور ان کے ساتھ پوری ندوی ٹیم نے جو متصوفانہ کروٹ لی ہے وہ کامیاب نہیں رہی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ یہ حضرات جب تک صوفی نہیں ہوئے تھے، ایسے ایسے ادبی، علمی اور ذہنی و تاریخی شہ پارے ان کی کاوشوں سے منصفہ شہود پر آئے کہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ لیکن جوں ہی ادب و علم کے میکدہ حیات سے اُٹھ کر اس قافلے نے خانقاہ کا رخ کیا، فکر و نشاط اور عمل و زندگی کا سارا کارخانہ ہی بند ہو گیا اور اگر کچھ لکھا بھی تو وہ زندہ بہنے والا نہیں۔

ہماری مجبوریاں

ہمارے اس نوع کے احساسات کو ممکن ہے، بعض لوگ بے موقع سمجھیں مگر ہمارے

لیے یہ بہت ہی باموقع ہیں۔ ہماری مجھوریاں اس سلسلے میں یہ ہیں کہ سید صاحب کی موت نے قدرتاً ہمیں ان تمام دوسرے صدموں کی یاد بھی دلا دی ہے جن کا تعلق اس نئی تبدیلی سے ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ان کا اظہار ہو ہی جائے اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارے سوا ان صدموں کے ذکر کرنے والا اب رہ بھی کون گیا ہے ؟ ندوہ، وہ میکہ، علم، وہ بیت الحکمت، وہ مجمع اخوان الصفا، وہ دارالادب، اور مصنفین کا گہوارہ اور وہ گلہ سترہ ریاض ذوق، جس کو تیس چالیس سال کی تاریخی کوششوں نے ترتیب دیا تھا، آج کہاں ہے ؟ اب ندوی بھی اور اولیاء بولیں بولنے لگے ہیں اور اس جمود اور مقلدانہ روش کو سرانے لگے ہیں جس کی مخالفت کی وجہ سے یہ مدرسہ فکر معرض ظہور میں آیا تھا۔ اس لیے اگر ہم بھی نہ بولیں اور اس صورت حال کا ماتم نہ کریں تو اور کون ان جذبات کی ترجمانی کرنے والا ہے ؟ —

ندوی گروہ نے تصوف میں آکر کیوں کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا ؟ اس کی دو وجہ ہیں

بہر آئینہ غرض یہ ہے کہ سید صاحب مرحوم اور پورے ندوی طائفہ کے اس میلان سے ندوی تحریک و تصور کو جو نقصان پہنچا وہ تو پہنچا ہی، خود ان حضرات کی علمی ترقیات بھی رُک گئیں۔ اس کی دو نمایاں وجہیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اس وقت تصوف کی آغوش میں آئے جب تحقیق و تفحص کی انگلیوں اور ولولوں سے پیمانہ قلب و ذہن خالی ہو چکا تھا اور جو کچھ انھیں کرنا تھا وہ ماضی میں کر چکے تھے اور جن جن شہ پاروں کو ترتیب دینا تھا دے چکے تھے، اور وہ بلاشبہ ایسے ہیں کہ تاریخ ان کو یاد رکھنے پر مجبور ہے۔ اب یہ عمر کی ایسی منزلوں میں تھے کہ جہاں پہنچ کر اشہب فکر سستانا چاہتا ہے اور نفسیاتی طور پر ایسے عقائد و تصورات کی پناہ میں آنا چاہتا ہے جو خارجی افکار کو بھلا دیں اور ایک طرح کی باطنی آسودگی و اطمینان مہیا کریں۔

دوسرے یہ کہ انھوں نے تصوف کے جس رخ کا تتبع کیا وہ سراسر فقہی اور تنگ دلانہ تھا اور زندگی کی ایسی سمٹی ہوئی تعبیر پر مشتمل تھا کہ اس میں خلاقی و وسعت خیال کی گنجائش

نکل ہی نہیں سکتی تھی، اس میں مسائل ہو سکتے تھے، اختلافات اُبھر سکتے تھے اور حنفیت و تقلید کے فوائد و برکات کو اجاگر کیا جاسکتا تھا، لیکن گہرائی، زندگی اور تخلیق کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ مذہب کی طرح تصوف بھی زندگی کا ایک مستقل بالذات تصور ہے اور اس کی تعبیر و ترجمانی میں بھی وہی اختلافِ خیال اور تشددِ رونما ہے جو نفسِ مذہب میں ہے۔ پھر جس طرح مذہب کے معاملے میں یہ صحیح ہے کہ اس کی کچھ تعبیریں اونچی اور حیات آفریں ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کے ڈانڈے زندگی کی نفی اور رہبانیت سے ملے ہوئے ہیں، اس طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ تصوف کی بھی کئی کئی تعبیریں ہیں۔ کچھ وہ ہیں کہ جن میں گہرائی، روشن ضمیری اور زندگی ہے اور کچھ وہ ہیں کہ جن کا تعلق چند اوضاع، مخصوص نوع کی پابندیوں اور التزامات سے ہے اور بس۔ ہمیں افسوس تو یہی ہے کہ ندوی گروہ نے اگر قدم بڑھانے ہی تھے تو ایسے تصوف کی طرف بڑھائے ہوتے جس سے کہ ان میں نئی زندگی جنم لیتی اور فکر و عمل کی تازہ کاریاں اُبھرتیں، نہ یہ کہ جو کچھ کیا دھڑا تھا، اسی پر پشیمان ہوتے اور جس خول سے نکلے تھے پھر اسی خول میں جا گھستے۔

### مقامِ شکر اور اظہارِ عبرت

غیر، جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا اور سید صاحب کے ساتھ شکوہ و شکایات کا یہ باب بھی دفن ہوا، اور ہمیں امید ہے کہ سابقہ روایاتِ کرم کی بنا پر ہماری ان گستاخیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ ایک آخری بات ہم تحدیثِ نعمت کے طور پر ضرور کہنا چاہتے ہیں، اس لیے کہ اس کا یہی موقع ہے، پھر نہ ہم کہیں گے اور نہ کوئی دوسرا اس پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ اس اختلاف و تنقید کے باوصف جس کو ہم نے روا رکھا، صرف ہم ہیں جو ان کی حقیقی قدر و منزلت سے آگاہ ہیں۔ صرف ہمیں یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ان کے انتقال پر ریڈیو پاکستان سے پہلی تعزیتی تقریر نشر کر سکیں اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ گزارشات پیش کر سکیں۔ اس عرصے میں ہم نے ان تمام مضامین کو نظرِ امعان دیکھا ہے جو اس سلسلے میں مختلف رسائل و اخبارات میں چھپے ہیں، اور ہمیں یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی کہ جن لوگوں کے

ساتھ علامہ مرحوم نے آخر آخر میں اپنا رشتہ محبت و تودد جوڑا تھا وہ انا للہ اور انا الیہ رحمت کرے کے رسمی الفاظ سے آگے نہیں بڑھ سکے، اور ان کی حقیقی عظمت کا اعتراف کرنے میں انھیں کافی احتیاط کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ سید صاحب قبلہ براہ راست ان کے اکابر میں سے نہیں تھے اور ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ ان کے اکابر کے آستانہ عقیدت پر مجبور ہو کر ان کو آنا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ اللہ نے ان کو اپنے مرشد میں فنا ہو جانے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

گویا نہ سیرت النبی کوئی کارنامہ ہے، نہ ارض القرآن کوئی خدمت ہے، نہ حیات مالک کوئی کام ہے اور نہ حیات عائشہ اور دوسری گراماں قدر تصنیفات ہی کوئی دینی مقام رکھتی ہیں، صرف مرشد میں فنا ہو جانا ہی بہت بڑی نیکی ہے۔

عام حالات میں ہیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص جسے چاہے اپنا رہنما مان لے، جس گروہ میں چاہے شامل ہو جائے اور جس طرح کے عقائد بھائیں اختیار کر لے۔ اس معاملے میں ہر شخص صرف اپنی ہی صواب دید کے سامنے جواب دہ ہے، دوسروں کو اس پر اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لیکن سید صاحب کا معاملہ جدا ہے۔ وہ معمولی اور عام آدمی کی صف میں نہیں آتے اور نہ ان کو وہ رسالت ہی دی جاسکتی ہے جو عوام کو دی جاتی ہے، کیونکہ انھوں نے عمر عزیز کا بہترین حصہ ایک خاص تھوڑے کی اشاعت میں بسر کیا ہے، کچھ رفقا اور ساتھیوں کو لے کر ایک منزل تک پہنچے ہیں، علم و عمل کا ایک سانچہ پیش کیا ہے اور ان علمی و عملی روایات کی طرح ڈالی ہے جس سے کہ ندوی گروہ دوسروں سے میسر ہوتا ہے۔

اب اگر صورت حال یہ ہو کہ خود انھوں نے ہی ان سب چیزوں کو ختم کر دیا ہو تو ان کے دوستوں اور عزیزوں کو اس پر کم از کم اظہارِ افسوس کی اجازت تو ہونا ہی چاہیے اور اس تمام مضمون آرائی کا یہی خلاصہ ہے۔ یہ کچھ کلمے ہیں جو بے اختیار نہ دل سے نکلے ہیں اور صفحاتِ قرطاس پر پھیل گئے ہیں۔ پرانی دیواریں گرتی ہی ہیں، خشک اور خزاں رسیہ پتوں

کا جھڑ جانا ہی ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کسی طرح بنا بنایا محل گر پڑے اور کوئی ایسا باغ بادِ سموم کی نذر ہو جائے جس کا ایک نظارہ ہی عمر میں اضافہ کر دینے کا موجب ہو تو کسے افسوس نہیں ہوگا۔

ایک اور بات یہاں صاف ہو جانا چاہیے، تاکہ کسی نوع کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ یہ جن خیالات کا اظہار ہوا ہے، اس کا منشا کوئی گروہی تعصب نہیں، یہ محض سید صاحب مرحوم و مغفور قبلہ کی نسبت سے اس انداز کی باتیں لکھی گئی ہیں، ورنہ ہم کم از کم برسوں کے غور و فکر کے بعد عقیدہ و فکر کے جس موڑ پر ہیں وہ ایسا ہے کہ جہاں تعصب کی طرف کوئی راہ نہیں کھلتی۔ ہمارے نزدیک ہر شخص جو کتاب و سنت کی روشنی میں قدم بڑھاتا ہے، عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہے اور اس کے کاموں اور خدمات کی ایک متعین قیمت اور سطح ہے، چاہے تفصیلات میں وہ ہم سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

### ایک ضروری تجویز

اس آخری گلے کے ساتھ جو خدا جانے کس سے ہے اور کیوں نوکِ قلم پر بے اختیار ٹپک پڑا ہے، ہم ان کلمات اور تجویز پر اس تعزیت کو ختم کرتے ہیں کہ :

اللہ تعالیٰ اگر حکومتِ پاکستان کو توفیق عطا کرے تو وہ سید صاحب کی یادگاریں ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کر دے جو ان رجحانات کو فروغ دے جو پہلے پہل ندوہ کے پیشِ نظر تھے۔ یا قائدِ اعظم کی یادگاریں جو دارالعلوم زیرِ تجویز ہے اس کو جلد از جلد پروان چڑھانے اور اس میں علامہ مرحوم کے نام سے اسلامیات کا ایک مخصوص شعبہ کھول دینے کا انتظام کرے جس میں کہ منتهی اور فارغ التحصیل طلبہ اونچے پیمانے کا تنقیدی اور تصنیفی کام کر سکیں۔ اس میں ایسے لائق اور قابل اساتذہ رکھے جائیں جن کی نظر و سیخ ہو اور جو دینیات کے علاوہ موجودہ مدارسِ فکر سے بھی اچھی طرح آگاہ ہوں اور یہ جلتے ہوں کہ برائی اقدار کو نئی مصطلحات میں کیونکر ڈھالا جاسکتا ہے اور نئے نئے مذاہبِ فکیہ کی اسلامی نقطہ نظر سے کیونکر تشریح ممکن ہے؟

صرف یہی ایک طریق ہے جس سے کہ ہم سید صاحب کے نام اور کام کو علمی دنیا میں زندہ

رکھ سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ ہو بھی سکے گا؟ اس کا جواب ہم کیا دیں۔ پاکستان میں یہ سوال ہی کب زیر بحث ہے کہ اپنی تہذیب و ثقافت کو قائم رکھنے کے لیے کچھ کیا جائے اور بنیادی و اساسی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ یہاں تو ہر شخص اس دھن میں بے قابو ہو رہا ہے کہ دولت و اقتدار کی جو سلسبیل یہاں بہہ رہی ہے، اس میں اپنا حصہ لگایا جائے، ورنہ کیا معلوم یہ موقع پھر ملے یا نہ ملے۔

## حسرت کی یاد میں

مولانا چراغ حسن حسرت کا انتقال ۲۶۔ جون ۱۹۵۵ء کو لاہور میں ہوا، مولانا ندوی نے ۱۵۔ جولائی ۱۹۵۵ء کے الاعتصام میں ”حسرت کی یاد میں“ کے عنوان سے ان پر تعزیتی مضمون لکھا جو درج ذیل ہے:

اسحاق بن ابراہیم موصلی کی شہرت ایک مغنی کی حیثیت سے ہوئی۔ چنانچہ ابوالفرج اصفہانی نے ”طغانی“ میں بے شمار قصے اس کی نغمہ فرینیدیوں کے بیان کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کی نزاکتوں پر اس کو کس درجے کا قابو حاصل تھا۔ مگر خود اس کی رائے اپنے متعلق یہ تھی کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ چنگ و رباب کا مشغلہ تو اس کے فوق لطیف کا صرف ایک اظہار تھا، جس کو یار لوگوں نے اس قدر اچھا لاکہ اس کو اس کا طرہ امتیاز سمجھ لیا گیا، ورنہ دراصل وہ جامعیت کے اعتبار سے اعجوبہ روزگار تھا۔ اور ایسا یگانہ فرد تھا کہ بہت کم لوگ اس کی ہم سری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ یعنی تمام علوم دینیہ و ادبیہ میں کاملانہ دست گاہ رکھتا تھا۔ صرف و نحو کے رموز اس پر واضح تھے، عروض و شعر کا یہ دہتی تھا، منطق و الہیات کی مشکلات اس کے سامنے ہیچ تھیں اور فقہ و حدیث اور علم المسائل میں تو وہ اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ کردار و سیرت کی پاکیزگی کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ وقت نے یہ کہہ کر اس کی عظمت کا اعتراف کیا کہ:

”اسحاق! تو اگر شعر و غنا سے مہتمم نہ ہوتا تو تمہارا عفاف اور اصابت رائے اس بات کی متقاضی تھی کہ میں تمہیں عہدہ قضا کی پیش کش کرتا۔“



مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ بھی کم و بیش اسی طرح کا مثنویہ وابستہ ہے۔ ان کی شہرت اگرچہ ایک کامیاب اور صاحبِ طرز مزاح نگار کی حیثیت سے ہوئی، لیکن وہ صرف ظرافت نگار اور ادیب ہی نہ تھے، بلکہ تاریخِ اسلامی پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ فارسی کے ذخیرہ نظم و نثر کے شناور ہی نہیں، بہترین نقاد بھی تھے۔ اساتذہ سخن اور ان کی خصوصیاتِ فنی از بر تھیں اور اردو تو ان کے گھر کی چیز تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے چند تاریخی سلسلوں کو جس سلیقے اور ہنرمندی سے مدقن کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ تصنیف و تالیف کو مستقل طور پر اپنا لیتے اور اسی کے ہو رہتے تو اس میدان میں ان کی خدمات بہت سے پیشہ وروں کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیتیں۔

ان سے پہلی ملاقات آج سے بیس پچیس سال پہلے عرب ہوٹل کی ایک صحبت میں ہوئی اور پھر اس نے گھر سے روالہ کی ایسی صورت اختیار کر لی کہ جواب تک محفوظاتِ دل کی متاعِ گراں بہا ہے۔ ان دنوں یہ عموماً ہمیں بالائز ام محفل آرا ہوتے تھے اور یہیں ان کی قابلیت و جامعیت کے جوہر کھلتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے منتہی طالب علموں کا ایک ہجوم انھیں گھرے رہتا۔ ادبِ جدید، شعر و شاعری، کانگریس اور لیگ اور دینی مسائل اپنی تمام رنگارنگیوں کے ساتھ بحث کی جھپیٹ میں آجاتے اور حسرت ان سب سے نمٹتے۔ کسی کو شعر سناتے، کسی پر بھتیجتے، کسی کے سامنے تحقیق و تنقید کا دریا بہاتے اور کسی کسی کو ٹرغا بھی دیتے۔ عربی، خاقانی، سعدی، حافظ اور غالب و میر کے تو ایسے ایسے چیدہ اشعار سناتے کہ وجد آجاتا۔

یہاں کی بحثوں میں اکثر ایک نازک موڑ کمینوزم اور اس کے نظریہ تاریخ کا آجاتا۔ کالج کے پرجوش لڑکے اس کو پیش کرتے اور ان سے رائے پوچھتے۔ اس پر حسرت تاثر میں ڈوبے ہوئے لب و لہجے میں کہتے کہ مولانا! (یہ ان کا تکیہ کلام تھا) ہم بہر حال مسلمان ہیں، ہمارا ماضی سے گہرا تعلق ہے اور ہم اسلام کے لاتعداد احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اور درحقیقت اسلام ان کے قلب و ضمیر میں ایسا چا ہوا تھا کہ جیتے جی اس سے دست بردار ہونا انھیں کسی طرح گوارا نہ تھا۔ جو شخص بھی ان کو بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ کوٹ پتلون میں ملبوس

دیکھتا، وہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کے پیلو میں ایک اسلام پسند دل ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ حسرت نہ صرف اسلامی ذہن و فکر رکھتے تھے، بلکہ بہت سی باتوں میں خاصے قدامت پسند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جدید رجحانات کو چھوڑ کر ادبیات میں ”کلاسیکس“ سے ان کا شغف نسبتاً زیادہ تھا اور باہمی تعلقات اور دوستی میں تو بالکل مشرقی تھے (علامہ مشرقی نہیں) وہی وضع داری، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی اخلاص اور حفظِ مراتب۔

ذہن کی یہ خاص کیفیت، یہ اسلامیّت اور خیالات و افکار میں سلامت روی کا سبب غالباً یہ تھا کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ حسرت نے ذہنی تربیت کی مثالیں فارسی ادبیات کے آغوش میں طے کیں۔ اور بقول مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کے، فارسی ادبیات میں یہ عجیب تاثیر ہے کہ اگرچہ اس کا سارا تار و پود تغزل اور رندی و ہوسنائی کے مضامین سے تیار ہوا ہے، مگر اس سے ذہن میں استواری، اخلاق میں بلندی اور اسلامی عقائد و تصورات کے ساتھ ایک طرح کا لگاؤ ضرور ابھر آتا ہے۔

حسرت سے آخری ملاقات بھی ایک ہوٹل ہی میں ہوئی۔ اب یہ پہلے سے تنومند، قوی، ہیکل اور زندگی سے معمور حسرت نہیں تھے۔ بلکہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، ایک خیال، طیف اور مجرد لوح۔ میں انھیں اس عالم میں دیکھ کر کتنا کہ یہ حسرت نہیں، حسرت کا جوہر اور خلاصہ ہے۔ باتیں اسی طرح دھواں دھار، پرجوش اور مخلصانہ۔

ہم میں کسی نے مینک اور انشورنس کا قسط چھیڑ دیا۔ پھر کیا تھا فوراً ایک تقریر بھجوا دی۔ کہنے لگے کہ ہمارے پاس کبھی اتنا روپیہ ہی نہیں ہوا کہ اس معصیت کا اڑکاب ہو سکے۔ انشورنس کے البتہ مواقع تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب، علما کے فتوے بھی لے آئے اور باطلر کہا کہ اپنے بال بچوں پر رحم کرو اور زندگی کا بیمہ کرالو۔ لیکن میں نے کہا کہ میں بیمے کی پیش کش کو ایک گناہ سمجھ کر تو قبول کر سکتا ہوں، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو جائز سمجھوں۔ عمل کی کوتاہیاں قابلِ معافی ہیں، لیکن عقیدہ و فکر میں ٹیڑھ قطعی قابلِ بخشش نہیں۔ رہا بال بچوں کا سوال تو جو بات میں اپنے لیے جائز نہیں سمجھتا، اس کو اپنے بچوں کے لیے کیوں کر روا رکھ سکتا ہوں۔ حسرت کی لا ابالیانہ زندگی کے ساتھ اس انداز کا تقشف بظاہر بے تکا معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہر انسان اپنی بے شمار کوتاہیوں اور لغزشوں کے باوجود

دین کے بعض کاموں میں بڑا متشدد ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ متشدد رہنا چاہتا ہے۔ حسرت کی ذہنی مجبوریاں بھی کچھ اسی ساخت کی تھیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اگرچہ اسلامیات میں مہارت و رسوخ کا مرحوم نے کبھی دعویٰ نہیں کیا، پھر بھی اسلام کے صحیح مزاج سے نفرت ہائے مجازی کے بہت سے قارئین کے علی الرغم اچھی طرح واقف تھے اور اس حقیقت کے رمز شناس تھے کہ اسلام وسیع تر انسانی اقدار و مفادات کے تحفظ کے لیے نازل ہوا ہے۔ بارہا معاشرے کی موجودہ ناہمواریوں پر اُن سے تبادلِ افکار کا موقع ملا۔ ان کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ اسلام جاگیر داری کا حامی و ناصر نہیں ہو سکتا اور کسی ایسے نظام کا موید نہیں ہو سکتا جو معاشی ناہمواریوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رکھنا چاہتا ہے۔

ان کا حلقہ احباب بہت وسیع اور متنوع تھا۔ چنانچہ علمی و ادبی شخصیتوں کے علاوہ ایسے لوگوں سے بھی راہ و رسم رکھتے تھے جو بالکل اُن پڑھ ہیں۔ ان تعلقات کا دلچسپ پہلو یہ ہوتا کہ ان سے ہنسی مذاق کی باتیں انہی کی اصطلاحات میں ہوتیں۔ اس وقت یہ ٹھیکہ پنجابی کی حیثیت سے گفتگو کرتے۔ تعجب ہوتا کہ حسرت کی شخصیت بھی کیسی حاملِ افسانہ ہے، یا تو یہ گومتی اور جمنائی دھلی ہوئی بولی میں موتی بکھیر رہے تھے اور یا ایک جست میں چناب اور راوی کی افسانہ خیز سرزمین میں پہنچ گئے۔

حسرت کے کردار میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ بھائی وہ ان کا خاص فلسفہ حیات تھا۔ دوسرے دانشوروں کی طرح ان پر بہت اچھے دن بھی آئے اور ایسے سخت اور کڑے دن بھی کہ ایک پانی پاس نہیں۔ لیکن کیا مجال کہ کسی وقت بھی ستم روزگار کا شکوہ زبان کو آلودہ کرے یا چہرے کی کوئی شکن دل کی الجھنوں کی غماز ہو سکے۔ وہی مشاغل جاری ہیں، چائے اور کافی کا دور چل رہا ہے، خوش گپیاں ہو رہی ہیں اور غموں کو بھلائے اور نظر انداز کیے ہوئے محوِ مکالمہ طرازی ہیں۔ ”مکالمہ طرازی“ دراصل حسرت کا مخصوص جوہر تھا جو قدرت نے انھیں خصوصیت سے عطا کر رکھا تھا۔ اس فن میں وہ ایسے طاق تھے کہ بہت کم لوگ اس سلسلے میں ان کے حریف ہو سکتے ہیں، اور یہ ان کا فن ہی نہ تھا بلکہ ذریعہ تسکین بھی تھا۔ اس سے مرحوم خوب خوب کام لینا بھی جانتے تھے۔ یہ کیا کم ہے کہ

اس طرح کم از کم غم ایام کی تلخیوں کو فراموش کر دینے میں کامیابی حاصل کر لیتے تھے۔  
 پاکستان میں اہل قلم و ذوق کا پہلے سے قحط ہے، حسرت کی موت نے اس کی  
 خوف ناکوں کو اور بڑھا دیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کا کوئی عقیدت مند ان  
 کی جملہ نگارشات کو ان کے مختصر سے سوانح حیات کے ساتھ جمع کر دے۔ اس سے اتنا  
 تو ہو گا کہ گو حسرت گوشت پوست کی زندگی میں ہمارے رفیق نہیں رہے، تاہم ان کی ادبی  
 رفاقتیں تادیر زندہ رہیں گی۔

## مولانا ظفر علی خاں مرحوم

مولانا ظفر علی خاں ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ ان پر مولانا ندوی کا تعزیتی مضمون  
 ۱۹ دسمبر ۱۹۵۶ء کے الاعتصام میں چھپا جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔  
 مولانا ظفر علی خاں اگر عربی ادبیات پر قلم اٹھاتے تو حیرری اور ہمدانی ہوتے۔ فارسی میں  
 لکھتے تو ابوالفضل اور فیضی ان کی نگارشات پر سرزد ہنتے اور انگریزی میں طبع آزمائی فرماتے  
 تو انڈین اور میکالے سے کم رتبہ کیا پاتے لیکن انھوں نے اظہارِ خیال کا ذریعہ ایسی  
 زبان کو ٹھہرایا جس میں دوسے زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم داغِ دہلوی نے  
 ان کی اردوئے معلیٰ کو سراہا۔ حالی نے ان کی قوتِ تاثیر کو ان الفاظ میں تسلیم کیا:  
 ڈالایہ تیرری پکار نے غل جی اٹھے وہ مُردے چوتھے بے جاں  
 ملور سر سید تو ایک مرتبہ ان کے قطعے کو سن کر جھوم جھوم گئے۔  
 اردو پر ان کو جو قدرت حاصل تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایے کہ یو پی والوں  
 نے بھی ان کو ہمیشہ مستند مانا ہے۔

اقبالِ الشیخا کا کتاب بڑا شاعر ہے۔ اس نے مسلمانوں کو کیا نہیں دیا۔ حکمت، فلسفہ،  
 اور دین کا گہرا اور اونچا تصور اس کے کلام کا طرہ امتیاز ہے۔ بلاشبہ اس نے خیالات و  
 افکار کی پرانی سمتیں بدل ڈالی ہیں اور ایک ایسی بلند پایہ شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے جس

میں علاوہ تخلیقی صلاحیتوں کے دعوت بھی ہے، زندگی کا متعین زاویہ نگاہ بھی ہے اور غضب کی بھین بھی ہے۔ مگر ایک طبقے کو بایں جلالتِ قدر ان کی زبان نہیں بھائی۔ ان کو اس میں تذکیر و تائید اور اضافت و محاورے کی غلطیاں نظر آئی ہیں۔

مولانا کا معاملہ دوسرا ہے۔ ان کی ہر بات سے اختلاف ممکن ہے، سوا زبان کے، مگر اس بارے میں قطعی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ صحیح لکھنا بھی ایک درجہ ہے، مگر مولانا کی ذاتِ گرامر ایسی تھی کہ ان کے ذوقِ ادب نے زبان کو سنوارا، اسے نئی نئی تعبیریں بخشیں، اچھوتے اور نادر پیرایہ ہائے بیان عطا کیے اور زندگی و جوش کی نعمتوں سے مالا مال کیا۔ جو لفظ ان کے منہ سے نکل گیا، سند ہے اور جو اصطلاح ان کے دار الضرب سے ٹھہل کے آئی، مقبول ہے۔ اس بات کا فیصلہ کرنا سخت دشوار ہے کہ ان کی تقریر و تحریر میں کیا فرق ہے؟ دونوں میں یکساں زور ہے، آمد ہے اور فصاحت و بلاغت کا دریا ہے کہ متلاطم ہے۔ بولتے تو معلوم ہوتا کہ حسین و جمیل الفاظ کی ایک سلسبیل ہے کہ جاری ہے اور لکھتے تو گمان ہوتا کہ الفاظ و لغات کا ایک ذخیرہ ہے جو اُٹا ہوا چلا آ رہا ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے کرتے کہ اصل کتاب اس سے کم درجے کی معلوم ہوتی۔ چنانچہ ڈیرپیر کی زندگی اگر وفا کرتی اور وہ سن پاتے کہ ”معرکہ مذہب و سائنس“ ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے تو یہ انگریزی نسخہ تلف کر دیتے اور اس کے اردو ایڈیشن پر فخر کرتے۔

افسوس ہے کہ میر عثمان علی کی کمزوری اور اڈوانٹر کی دشمنی کی وجہ سے ان کو حیدر آباد میں زیادہ عرصہ رہ کر اردو زبان کی خدمت کا موقع نہیں ملا، ورنہ جس ٹھاٹھ سے انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اردو بڑی حد تک علمی و فنی مصطلحات سے بے نیاز نہ ہو جاتی۔ ان کے بہارِ آفرین قلم نے جس طرح صحافت کو معمولی و قانع نگاری کی سطح سے اونچا اٹھایا اور اس میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ یہ تازہ بتاؤں اور نو بہ نو سیاسی واردات کی کامیابی سے ترجمانی کر سکے، اسی طرح اگر بہ ترجمہ و تالیف کے مشغے کو جاری رکھتے تو یقیناً جانیے کہ ادائے مطالب میں اردو آج کسی مغربی زبان سے پیچھے نہ ہوتی۔

ان کی ذات بجائے خود ایک ادارہ تھی اور علم و ادب کے ایسے مرکز سے تعبیر تھی کہ جس نے وجاہت حسین، وحید الدین سلیم اور نیاز فتح پوری ایسے باکمال النشا پر دازوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ گویا سرسید کے بعد یہ دوسرے آدمی تھے جنہوں نے وقت کی اہم شخصیتوں کو اس درجے متاثر کیا۔

آج پاکستان میں خدا کے فضل سے بہتر سے بہتر اُردو روزنامے موجود ہیں، لیکن ان میں کوئی ایسا نہیں جس کی صحبت کو ایک شب و روز سے زیادہ تنگ کے لیے گوارا کیا جاسکے۔ لیکن وہ ”زمیندار“ جس کو خود مولانا نے برسوں مرتب کیا تھا اور اپنی تخلیقات ادبی سے نوازا، آج بھی اس لائق ہے کہ قلب و ذوق کی دلچسپیوں کا سامان مہیا کر سکے۔ اُردو ادبیات میں جس طرح ”الہلال“ اور ”ابلاغ“ کا مقام ہے، اسی طرح ”زمیندار“ کے پڑانے فائل نکسالی ادب کا بہترین مرقع ہیں۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ الٹا کا کوئی بندہ اٹھے اور پچاس سالہ زمیندار کے فائلوں کو اس نقطہ نظر سے دیکھ جائے کہ اس میں کیا کیا گہرائی ہے اب دار ایسے بکھرے پڑے ہیں جو چننے کے قابل ہیں۔ اگر کوئی جم کر یہ کام کر سکے تو نہ صرف یہ کہ اُردو ادب کی بیش بہا خدمت ہوگی بلکہ اس سے پاک و ہند کی نئی سیاسی تاریخ لکھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ یہی نہیں، اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہنا چاہیے کہ صرف اس طریق سے معلوم ہو سکے گا کہ انگریزی استعمار نے کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں اور کس کس طرح سچائی کو کچلنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح صرف ”زمیندار“ کی گزشتہ تاریخ کے مطالعہ ہی سے پتا چل سکتا ہے کہ حق کس کس طرح دب کر ابھرتا ہے اور کیونکر ہر نئی افتاد کا مقابلہ کر کے پہلے سے بھی زیادہ نکھرتا ہے۔

بعض لوگ مرحوم کی نظموں سے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ہنگامی ہیں اور اس میں اس غصہ کی افسوس ناک حد تک کمی ہے جو نظم کو حیات جاودانی بخشا ہے۔ لیکن ایسے معترض حضرات اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ شعر صرف غیر فانی معانی ہی سے تعبیر نہیں، بلکہ اس میں اور بھی بہت سی باتیں دیکھی جاتی ہیں۔ اگر شکوہ الفاظ، محاورے کی پابندی، قوافی و ردیف کا

اچھوتا پن، بندش کی جستجو اور ایک خاص ڈھب کی موسیقی، کسی نظم میں جان ڈال دینے کے مترادف ہے، تو کم و بیش یہ خصوصیات مولانا کی تمام نظموں میں جلوہ گر ہیں کیا حسن بھائے خود ایک ادبی مہر نہیں؟ اور اگر یہ صحیح ہے تو ہم دعوت سے کہہ سکتے ہیں کہ ظفر علی کی ہر نظم حسن و جمال کے تقاضوں کی بہترین آئینہ دار ہے۔ ہم نے جلی کی یہ زور دار نظم بھی پڑھی ہے اور مرے لے لے کے پڑھی ہے:

روحی خداک اے صنم! بطحی لقب

آشوب ترک شور و عجم فتنہ عرب

محسن کا کوروی کا بدائع و صنائع سے آراستہ نعتیہ کلام بھی پیش نظر ہے۔ لیکن ہوا لطف حاکم کے ان سادہ اشعار میں پایا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

مُرادیں غریبوں کی بڑہ لاسٹے والا

وہ سوائے مولانا ظفر علی خاں کی اس مشہور نعت کے اور کہیں نظر نہ آیا:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

اک روز چمکنے والی تھی کل دنیا کے دو باروں میں

مروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مولانا کے جذبات و احساسات کا نہایت ہی نازک

گوشہ تھا۔ جب تو ہم اس طرف مبذول ہوتی تو پھر نہ پوچھئے کہ عقیدت و نیاز مہندی کیوں

سمٹ کر زندہ و جاوید نظم کی صورت اختیار کر لیتی۔ چہذا اشعار ملاحظہ ہوں:

اے کہ تیرا اجمال ہے زینت محفل حیات

دونوں جہاں کی رونقیں ہیں تیرے حسن کی زکات

بلوگہ الست سے بخش دیے گئے تجھے

سب فلکی تصرفات سب فلکی تجلیات

چہرہ کشا کرم ترا قاف سے تاجہ قیرواں

لطف ترا کرشمہ سنج کعبہ سے تابہ سومناں

دیکھتے ہی ترہا جلالِ کفر کی صفِ الٹ گئی  
 مجھک گئی گردنِ ہبل ٹوٹ گیا طلسمِ لات  
 سر پر اندھیری رات ہے، گھر گئی ہے بھنویں ناف  
 موجِ بلا ہے تاک میں ڈور ہے ساحلِ نجات  
 تھام کے پایہِ عرض کا کیجیے اب اس سے التجا  
 اسے کہ ہے مبداءِ فیوض اک فقط تری ہی ذات  
 موردِ لطفِ خاص پر کس لیے آج یہ عتاب  
 ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشہٴ چشمِ التفات

شعر و شاعری اور تقریر و تحریر کی جستجی ان کی زندگی کا اصلی رخ نہیں تھے۔ یہ تو اصل میں نتیجہ تھے ان کی بے چین طبیعت اور دلِ درد مند کا۔ یہ سب سے پہلے ایک سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ یہ بات بڑے تعجب کی ہے کہ اگرچہ مولانا کے والد مولانا سراج الدین احمد خاں، سرسید سے بہت متاثر تھے اور خود مولانا علی گڑھ کے فیض یافتہ تھے، تاہم کیا مجال کہ ان کے ٹھیکہ عقاید پر اس کی پرچھائیں بھی پڑ سکی ہو۔

ملک میں دینیات کے بارے میں دو واضح رجحان رہے ہیں۔ ایک ان لوگوں کا جو قبر پرستی اور الحاد و زندقہ کے حامی ہیں اور دوسرے ان لوگوں کا جنہوں نے کتاب و سنت اور توحید و رسالت کے سوا اور کسی نقطہ نظر کی تائید نہیں کی۔ مولانا نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے ہمیشہ آخری گروہ کا ساتھ دیا۔ اور اس سلسلے میں لومہ لائٹ کی پروا نہیں کی، بلکہ بڑی بڑی دینی و سیاسی شخصیتوں سے بسا اوقات لڑ بھی گئے۔ چنانچہ سلطان ابن سعود نے جب حجاز کو اپنی اصلاحی کوششوں کا مرکز قرار دیا تو مشترکہ ہندوستان میں اس سے مخالفت و عناد کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ صرف مولانا کا دل گردہ تھا کہ انھوں نے سلطان کے موقف کی غیر مشروط طور پر حمایت کی۔

سیاسیات میں ان کی عمر عزیز کا بہت بڑا حصہ گزرا۔ انگریز کے استعمار کو انھوں نے ہر ہر مورچے پر شکست دی، بلکہ بعض اوقات تو نبرد آزمائی کے لیے نئے نئے مورچے پیدا



کیے۔ سیاسی جماعتوں اور ملک کی بڑی بڑی سیاسی تحریکوں کو انھوں نے ہمیشہ اپنے نقطہ نظر سے دیکھا اور اپنی مجوزہ کسوٹیوں سے پرکھا اور جانچا۔ نہ سب کی مخالفت کی اور نہ سب کی تائید و نصرت کا بیڑا ہی اٹھایا۔ ان کا مرکزی نقطہ خیال اس خصوص میں یہ رہا کہ اگر کسی تحریک سے اُن کے جذبہ اسلامیت کی تائید کا پہلو نکلتا ہے تو اس کے بے غرض اور بے لوث مبلغ و داعی بن گئے اور اگر اُن کے ٹھیکہ اسلامی احساسات کو اس سے ادنیٰ ما گزند پہنچنے کا بھی احتمال نظر آیا تو اس کے خلاف پھہر گئے اور کسی قیمت پر اس تحریک کے چلانے والوں کو معاف نہیں کیا۔ یہ ہے ان کی سیاسی زندگی کا ٹھیک ٹھیک تجربہ۔ اس کو سمجھ لینے سے یہ اعتراض خود بخود اٹھ جائے گا کہ انھوں نے کیوں ملک کی بڑی بڑی تحریکوں کا آخر وقت تک ساتھ نہیں دیا۔

انگریزی استعمار سے ٹکر لینے کے معاملے میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم منفرد اور تنہا نہیں، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ملک کے کچھ اور جلیل القدر حضرات بھی ہیں، جن کی مجاہدانہ مساعی اور کوششوں کا نتیجہ پاکستان اور ہندوستان کی موجودہ آزادی ہے، اور یہ ناشکری ہوگی کہ اس مرحلے پر ان کو فراموش کر دیا جائے۔

لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ آزادی کی اس جنگ میں جو کم و بیش نصف صدی تک جاری رہی، کس نے کیا قیمت ادا کی اور کون مصائب و محن کی کن کن نوعیتوں سے دوچار ہوا۔؟ تو اس اعتبار سے مولانا ظفر علی خاں اور ان کے اخبار ”زمیندار“ کا نام نامی سرفہرست رہے گا۔

آخر میں ہمیں مولانا اختر علی سے کہنا ہے کہ وہ تمام دوسرے کاموں کو ملتوی کر کے

”حیاتِ ظفر علی خاں“

کی تدوین کر ڈالیں۔ یا چند اہل قلم کو اس کام پر لگا دیں جو اس کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیں۔

## سید عطار اللہ شاہ صاحب بخاری

عظیم خطیب اور عظیم مجاہد

سید عطار اللہ شاہ بخاری کا ساخرا تھال ۲۱ اگست ۱۹۶۱ کو ملتان میں پیش آیا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ۸ ستمبر ۱۹۶۱ کے الاعتصام میں ان پر جو تعزیتی مضمون تحریر کیا، وہ یہ ہے :

شاہ صاحب کے انتقال سے ملک ایک سحر طراز خطیب اور شیوا بیان مقرر سے محروم ہو گیا ہے۔ بہ حیثیت فن کے خطابت اور تقریروں کا چونکہ ایک خاص موسم ہوتا ہے جو اپنی تمام بہار آفرینیوں کے ساتھ گزر چکا، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ مستقبل بعید میں بھی کسی ایسے شعلہ مقال خطیب کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی تو اس میں قطعی مبالغہ غلو کی آمیزش پائی نہیں جاتی۔

وہ عظیم شخص جس کی موخر اور دلاویز تقریروں سے آج سے پچیس تیس سال پہلے پورا ہندوستان گونج رہا تھا، آہ ! آج آسودہ لحد ہے۔ اب وہ ببل ہزار داستان جس کی چمک سے چمن زارِ وطن کا پتہ پٹا اور بوٹا بوٹا گویا تھا، آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ہے۔

جن لوگوں نے شاہ صاحب کی تقریروں اور خطبوں سے براہِ راست استفادہ نہیں کیا، ان کے سامنے ان کے خطیبانہ کمالات کا نقشہ کھینچنا مشکل ہے۔ ہاں ! اگر دریا کی روانی کا کوئی تصور آپ کے ذہن میں پایا جاتا ہے، پھولوں کی نزاکت اور ہبک سے آپ آشنا ہیں۔ آگ کے شعلوں کو آپ نے دیکھا ہے اور کسی ایسے فن کار کو سنا ہے جو لغموں کے ساتھ ساتھ اثر و سحر اور کیف و وجد کی کیفیات کو بھی سامعین کے دلوں میں اُتار سکتا ہو، تو آپ کو شاہ صاحب کی جامعیتِ تقریر کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ مگر ٹھہریے ! ابھی نقشے کے تمام رخ آپ کے سامنے نہیں آپائے۔

شاہ صاحب کی تقریروں میں شیر کی گرج، شاعر کے احساسات اور صوفی و عارف کے اخلاص، سر مستیوں کو بھی شامل کیجیے، جب کہیں جاکر ان کی خطیبانہ خصوصیات فہم و فکر کی گرفت میں آسکیں گی۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ شاہ صاحب کی موت پر قریب قریب ہر حلقے نے اظہارِ افسوس کیا ہے، اور ان کی خدمات کے پیشِ نظر ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر افسوس ہے اس سلسلے میں ان کے سیاسی افکار و معتقدات کی ایک غلط بحث خواہ مخواہ چھیڑ گئی ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ نہیں کہ ان کا تعلق ماضی میں کس سیاسی جماعت سے رہا ہے اور اپنی معاصر سیاسی جماعتوں کے بارے میں انھوں نے کس موقف کو اپنے لیے پسند کیا ہے، اس کے برعکس دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ شروع سے زندگی کا جو نقشہ انھوں نے تجویز کیا، کیا سر موہاں سے منحرف ہوئے؟ اور جن خیالات و تصورات کو انھوں نے اپنایا، ان کی پوری پوری قیمت ادا کی یا نہیں؟ اس سے بھی زیادہ جو چیز ان کی شخصیت کو نکھارنے والی ہے، وہ ان کی بے نظیر جرأت و بے باکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس جگہ داری کے ساتھ انھوں نے انگریز سے ٹکرائی ہے، جس بہادری اور حوصلہ مندی کے ساتھ انھوں نے قید و بند کی سختیوں کو بھینٹ دیا ہے، اس کی کوئی مثال ان کے حریفوں میں تلاش کی جاسکتی ہے؟

شاہ صاحب کی عظمت کا راز ان کی عزیمت میں ہے، ان کے ایشاں میں ہے، ان کی درویشی و فقر میں ہے، ان کے غنا اور بے نیازی میں ہے، ملک سے وفا شعار میں ہے اور راہِ درسم دوستی کی استواریوں میں ہے۔

ان پر زبانِ اعتراض دراز کرنے والے اپنے گریب انوں میں جھانک کر دیکھیں، کیا اس متاعِ گراں مایہ کے کسی حصے کو بھی ان کے دامنِ کردار نے سمیٹا ہے؟ ان میں یہ جتنی خوبیاں مبداءِ فیاض کی طرف سے جمع ہو گئی تھیں، ان میں کی ایک ایک خوبی ایسی ہے کہ جو کسی شخص کے کردار و سیرت کو چمکا دینے کے لیے کافی ہے۔

شاہ صاحب اپنی ان خداداد قابلیتوں کے بل پر اگر پیری مریدی کا کاروبار اختیار کرتے تو لاکھوں ہاتھ بیعت کے لیے آگے بڑھتے اور اگر اپنی اس محبوبیت و شخصیت سے کوئی مالی

فائدہ اٹھانا چاہتے تو سیم و زر کی فراوانیاں ان کا غیر مقدم کرتیں۔ دنیا جانتی ہے کہ شاہ صاحب نے یہ دونوں کام نہیں کیے۔ کیا یہی ایک چیز ان کی عظمت کے لیے کافی نہیں؟ ایک اور پہلو سے ان کی زندگی کا جائزہ لیجیے۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ آزادی حریت کی روشنی کسی ایک ہی دروازے سے داخل ہوتی ہے یا تخت و اورنگ کی بزم آرائیاں تنہا کسی ایک ہی شخص یا جماعت کی کوششوں کی رہیں منت ہوتی ہیں۔ روشنی کئی دروازوں سے صحن تک آتی ہے اور تخت و اورنگ کی بزم آرائیوں کے پیچھے کئی تاریخی عوامل ہوتے ہیں، جو کار فرما ہوتے ہیں۔

اگر واقعاتِ عالم و تاریخ کا یہ تجزیہ صحیح ہے تو پھر حصولِ پاکستان کی کامرانیوں کا انتساب ان تمام تحریکوں اور شخصیتوں کی طرف ہوگا، جنہوں نے براہِ راست یا بالواسطہ انگریزی استعمار کو ختم کرنے کی کوششیں کی ہیں، یا ہندو کی اجارہ دارانہ ذہنیت پر کارمی ضرب لگائی ہے۔

ترتیبِ اشیا کو اگر اس انداز سے دیکھیے تو حصولِ پاکستان کے ضمن میں سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کا حصہ کسی طرح بھی کم اہم نظر نہیں آئے گا، اس لیے کہ انھوں نے اس وقت انگریز کے قلعہٴ اقتدار میں شگاف ڈالے، جب اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت کرنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت سلطانِ جابر کے سامنے آزادی و حریت کا کلمہ بلند کیا، جب اس کے صلے میں طوق و سلاسل کی گراں باریوں کو انگیز کرنا لازمی تھا۔ شاہ صاحب کی سیاسی خدمات کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ انھوں نے تحریکِ ہجرت کا آغاز کیا، خلافت میں جان ڈالی اور ہر اس سیاسی محاذ پر دادِ شجاعت دی، جس سے انگریز کے پتدارِ استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔

توحید کی پرجوش اشاعت اور سنت کی ترویج میں جس والہانہ انداز سے انھوں نے حصہ لیا، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عشقِ رسول کی نزاکتوں اور توحید کے اسرار و رموز کو اس کامیابی سے بیان کرتے تھے، جو کہ صرف انہی کا حصہ تھا۔

اردو بولتے تو معلوم ہوتا تھا کہ غالب اور داغ نے شاعری کو چھوڑ کر خطابت

اختیار کر لی ہے اور پنجابی میں تقریر کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ چناب اور راوی نے اپنی روانیاں انھیں بخش دی ہیں۔  
 آہ! آج ہم ایسی جامع صفات شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

اور آخر میں ایک لطیفہ — ”بوذر“ اور ”بوذر“

ایک مرتبہ دو عالم دین مصروفِ گفتگو تھے، ایک مولانا محی الدین لکھوی اور دوسرے ایک اور بزرگ۔ میں اور مولانا حنیف ندوی چند بے تکلف دوستوں کے ساتھ ان سے کچھ دور بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مولانا محی الدین لکھوی ایک پرمیزگار اور صوفی عالم ہیں، ہمان نوازی اور مستحقین کی امداد و اعانت ان کا خاصہ ہے۔ پیسہ ان کی جیب میں ٹھہر نہیں سکتا، ادھر آیا اور ادھر گیا۔ دوسرے عالم جن سے وہ محو گفتگو تھے، اس سے برعکس طبیعت کے مالک ہیں اور روپے پیسے سے خاص ربط و شغف رکھتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ان کے پاس ایسا مقناطیس ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے پیسے کو دوسرے کی جیب سے کھینچ کر ان کی جیب میں ڈال دیتا ہے — ہم میں سے کسی نے کہا۔ ”مولانا محی الدین اس دور کے بوذر ہیں۔“ مولانا ندوی نے فرمایا، ”مولانا محی الدین بوذر (ذال کے ساتھ) ہیں اور جن صاحب کے پاس یہ بیٹھے ہیں، وہ بوذر (ز کے ساتھ) ہیں۔“

دونوں کی طبیعت کے اعتبار سے یہ لطیفہ عین مبنی برحقیقت تھا۔

یہ ہیں مولانا محمد حنیف ندوی اور ان کی وہ خدمات جو انھوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے یا اس کے بعد ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ کے علاوہ مختلف اوقات میں دیگر اداروں میں سرانجام دیں۔

# مولانا محمد حنیف ندوی

کا اسلوب نگارش

(چند اشارات)

میرزا ادیب

میں سب سے پہلے ایک ذاتی واقعہ عرض کرنے کی اجازت مانگوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ صورت یہ ہوتی تھی کہ اردو اور انگریزی میں سب سے زیادہ نمبر لیتا تھا لیکن حساب میں ہمیشہ وہ چیز میری بھولی میں آگرتی تھی جسے ”انڈہ“ کہا جاتا ہے۔ استادوں نے بہتیری کوشش کی کہ انڈے سے میری دلچسپی ختم ہو جائے مگر ان کی ساری کوششیں رائیگاں ہی گئیں۔ چھٹی سے ساتویں میں چلا گیا۔ ساتویں کا سالانہ امتحان ہوا تو میں نے اپنی روایت کو برقرار رکھا۔ یہ بات ہیڈ ماسٹر صاحب تک پہنچی تو انھوں نے یہ اچھا نہ سمجھا کہ ایک لڑکا جو سب مضامین میں پوری طرح طاق ہو، حساب میں قیل ہو جائے۔ انھوں نے فرمایا: ”جسکے اس کا حساب کا امتحان خود لوں گا۔“ چنانچہ وہ اس غرض سے کلاس روم میں آگئے۔ فرمایا: ”میں زبانی سوال پوچھوں گا۔“ پہلے انھوں نے اپنی طرف سے دو تین بڑے آسان سوال پوچھے۔ مگر میری حالت یہ تھی ”ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم“ مسکرا کر بولے ”اب آخری سوال پوچھتا ہوں۔ دو اور دو کتے ہوتے ہیں۔“ میں نے ذرا سوچ کر کہا ”چار۔“ ”بس تم پاس ہو گئے ہو۔“ انھوں نے نعرہ مارا اور میں یوں ساتویں سے آٹھویں جماعت میں چلا گیا۔ آج بھی وہی مرحلہ دہائش ہے۔ کہاں مولانا محمد حنیف ندوی جیسے متبحر عالم اور کہاں میں۔ ان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ قارئین کرام بھی وہی رویہ اختیار کریں جو میرے نرم دل ہیڈ ماسٹر صاحب نے اختیار کیا تھا اور مجھے موجودہ امتحان میں پاس کر دیں۔ جہاں تک مولانا محمد حنیف ندوی کی ذات گرامی کا تعلق ہے میں یوں بھی ان سے خواہا مرعوب ہوں۔ ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ چند سال پیشتر اکادمی ادبیات نے ادبا کو

اسلام آباد میں بلایا اور ان کے لیے ہوٹل میں کمرے مخصوص ہونے لگے تو مولانا نے از روِ خلوص محبت مجھے اپنا ”روم میٹ“ بنانے کا اظہار کر دیا۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا مگر میری توسیعی گم ہو گئی۔ مولانا سے دو مہینہ بار ملاقات ہو چکی تھی۔ عالمانہ شکوہ سے گفتگو کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ سوچا اگر انھوں نے حسبِ عادت اردو عربی لب و لہجے میں بولنی شروع کر دی تو میرے پلے کیا پڑے گا۔ اتفاق یہ ہوا کہ عین اس وقت اپنے یارِ مہربان رحیم گل آگئے۔ چھٹری ٹیکتے ہوئے خراشاں خراشاں آئے اور آتے ہی پٹھانی لہجے میں بولے۔ میرزا! آپ میرے ساتھ کمرے میں رہیں گے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور مولانا سے رحیم گل پر ساری ذمے داری عاید کر کے معذرت طلب کر لی اور مولانا نے بڑی فراخ دلی سے مجھے معاف کر دیا۔

آج مجھے مولانا کے اسلوب پر کچھ کہنا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ کچھ کہنے کی کوشش کرنا ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ دوں۔ اس سلسلے میں دو باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

مولانا کسی حیثیتوں سے اپنی تخلیقات میں سامنے آئے ہیں۔ وہ ایک محقق ہیں، شارح ہیں، مفسر ہیں، مترجم ہیں، نقاد ہیں اور مقدمہ نگار ہیں۔ اگر تعمقِ نظر سے ان کی فاضلانہ تحریر کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی اور حیثیتیں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وہ عالمِ دین ہیں، فلسفی ہیں، منطقی ہیں، مورخ ہیں۔ ان میں سے ہر حیثیت ایک خاص اسلوبِ نگارش کی مقتضی ہے۔ ہر حیثیت کے لیے ایک خاص ذہن کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خاص ذہن اپنے فکری نتائج کے اظہار کے لیے وہی اسلوب اپنانے کا جو ان فکری نتائج کو بہتر طور پر مدد و سہولت کے حوالے کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہو۔ محقق کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، شارح اور مفسر کا اپنا مترجم کو مصنف کے ساتھ ساتھ قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ نقاد کے ہاں ”قطیعت“ ہوتی ہے، اس کا انداز بیان غیر جذباتی اور حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ اسی طرح فلسفیانہ اور منطقیانہ افکار کی ترسیل کے لیے ایک فلسفی اور منطقی جو اسلوب اختیار کرتا ہے وہ شارح اور مفسر کے اسلوب سے لگاتار نہیں کھاتا۔ تو کیا مولانا نے الگ الگ اسلوب کو اختیار کیا ہے؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے اور اولین توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔



میں سمجھتا ہوں ایسا نہیں ہے اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ اسلوب کا مطلب ہے صاحب اسلوب کی حقیقی شخصیت۔ اور شخصیت کو مختلف حصوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ اگر شخصیت کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو حقیقی شخصیت اکائی کی صورت میں روپذیر نہیں ہو سکے گی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہو گا کہ ہم اس کے اسلوب کو سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔ البتہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ایک شخصیت کا اسلوب تو ایک ہی ہوتا ہے جسے اس کا ”مجموعی اسلوب“ کہہ سکتے ہیں، تاہم اس کے کچھ اپنے جدا جدا پہلو، جدا جدا عکس، جدا جدا رنگ ہوتے ہیں۔ ایک درخت کی طرح جس کی شاخیں درخت سے اس طرح وابستہ ہوتی ہیں کہ ان میں سے ہر شاخ کو درخت کا جزو ہی کہے جائے گا اور ہر شاخ اصولاً درخت کی نمائندگی کرتی ہے۔

تو مولانا کا مجموعی اسلوب کیا ہے؟

جہاں تک مولانا کی تحریریں پڑھ کر میں اندازہ لگا سکا ہوں، کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کا مجموعی اسلوب منطقیانہ ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ ان کا یہ منطقیانہ اسلوب عام منطقیوں جیسا خشک، بے کیف، بے رنگ نہیں ہوتا بلکہ اس میں ادیبانہ رنگ کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے اور کی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب میں جہاں منطقیانہ سطح پر دلائل آفرینی ہے، وہاں ادبی سطح پر تخلیقی حسن و جمال بھی ہے۔ اس قسم کے انداز میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اگر صاحب اسلوب شعوری طور پر ایک رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کرے تو دوسرا رنگ پھیکا پڑ جائے گا مگر مولانا کے ہاں منطقیانہ اور ادیبانہ سطح ہموار رہتی ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی وجہ میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا شعوری طور پر، ارادہ یا باقاعدہ کوئی منصوبہ بنائے بغیر اظہار خیال نہیں کرتے۔ یہ دونوں جزو، منطق اور ادب ان کی شخصیت کے جزو و لاینفک ہیں جو بغیر کوشش کے ان کی تحریروں میں در آتے ہیں۔

اس ضمن میں دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ مولانا کے تجزیاتی مطالعے کا طریق کار یہ ہے کہ وہ زیر گفتگو موضوع کو امکانی حد تک الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصے پر اختصار کے

ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اس سے دو فائدے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک فائدہ یہ کہ مصنف کو ہر پہلو پر بحث کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور دوسرا فائدہ اس کے پڑھنے والوں کے لیے ہے کہ وہ بسہولت تمام موضوع کے سارے پہلوؤں کو یکے بعد دیگرے اپنے ذہنوں میں سمیٹنے چلے جاتے ہیں۔ یہ مولانا کے اسلوب کی بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ ایک مرکزی عبارت کو ذیلی عنوانات پر پھیلا دیتے ہیں اور ہر عنوان پر کھل کر بات کرتے ہیں۔

جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس نوع کا تجزیاتی مطالعہ صرف مولانا کے لیے مختص نہیں ہے۔ تاہم اس انداز سے کسی فکری بحث کو اس کے متعلقہ اجزاء کے ساتھ ذہنی گرفت میں لے کر ایک ایک جزو کا تجزیہ کرنا مولانا ہی کے اسلوبِ خاص کا منظر ہے۔  
تجزیے کے اس طریقِ عمل پر صرف وہی شخص حاوی ہو سکتا ہے جو موضوع کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتا ہو اور ہر پہلو پر ان تمام معلومات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر چکا ہو، جن کی اس سلسلے میں ضرورت ہو سکتی ہے۔

عام طور پر ”جزو نگاری“ سے عبارت کے تسلسل اور روانی میں فرق آ جاتا ہے، مگر مولانا کے ہاں ایسی کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اجزاء کو باہمی طور پر مربوط کرنے کا فن خوب جانتے ہیں، اس لیے ان کی تحریر میں انقطاع تسلسل نہیں ہوتا اور نہ روانی کہیں رکتی ہے۔ مولانا، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مختلف حیثیتوں کے ساتھ ہمارے سامنے آئے ہیں بلکہ ان ساری حیثیتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ مگر ان کا اسلوب اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ ان کے ان مقدمات میں صورت پذیر ہوتا ہے، جو انھوں نے اپنی تصانیف کی ابتدا میں سپردِ قلم کیے ہیں۔

اردو میں کئی بڑے طویل، جامع اور مبسوط مقدمے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً مولانا حالی کا ”مقدمہ شعر و شاعری“، ڈاکٹر عبدالرحمن بخوری کا ”محاسن کلامِ غالب“، اور مولوی عبدالحق کا وہ مقدمہ جو مولانا ظفر علی کے ترجمے ”معرکہ مذہب و سائنس“ پر ہے۔ لاریب یہ مقدمے فن مقدمہ نگاری میں سنگِ میل تصور کیے جاتے ہیں، لیکن جب مولانا حنیف ندوی کے مقدمات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ سب سے زیادہ ”مقدمہ“ ثابت ہوئے ہیں۔

ان کے ”سلسلہ غزالیات“ ہی کو لیجیے۔ یہاں چار کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ سرگزشتِ غزالی، تعلیماتِ غزالی، افکارِ غزالی، تہافتِ الفلاسفہ۔ اب ان کے مقدمات کی تفصیل ملاحظہ کیجیے؛ سرگزشتِ غزالی کا مقدمہ ۱۰۸ صفحات کو محیط ہے اور اصل کتاب ۱۰۹ سے شروع ہو کر ۱۸۸ پر ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اصل متن سے مقدمہ طویل ہے۔

تعلیماتِ غزالی کا مقدمہ ۱۰۳ صفحات پر پھیل گیا ہے۔

افکارِ غزالی پر مقدمہ ۱۱۳ صفحات لیے ہوئے ہے۔

تہافتِ الفلاسفہ میں جو مقدمہ شامل کیا گیا ہے وہ ۸۸ صفحات پر چھایا ہوا ہے۔

ایک اور کتاب کا حوالہ بھی دوں گا۔ یہ کتاب ہے ”افکار ابنِ خلدون“ جس کا مقدمہ جو اصل میں مقدمہ المقدمہ ہے، ۷۷ صفحات پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

مولانا نے اپنے ہر مقدمے میں کتاب کے متن کی شرح و بسط کے ساتھ تفسیر بھی کی ہے اور جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے تنقید بھی کی ہے۔ میں اگر پورے اختصار کے ساتھ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ دوں تو عرض کروں گا کہ مولانا ہر مصنف کے پیچھے پیچھے آنکھیں بند کر کے نہیں چلے بلکہ ہر مصنف کے ہم قدم چلے ہیں اور آنکھیں کھول کر۔ جہاں انھوں نے دیکھا ہے کہ مصنف اپنی حقیقی راہ سے الگ ہو گیا ہے تو وہ خاموش نہیں رہے۔ اس کی طرف واضح اشارہ کر دیا ہے۔ مولانا کا منطقیانہ، ادیبانہ اور تجزیاتی اسلوب اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ ان مقدمات میں موجود ہے۔ وہ جو کہتے ہیں بال کی کھال اُتارنا، تو یہ چیز قدم قدم پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

مولانا کا انداز مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح خطیبانہ نہیں۔ خطیبانہ بلند آہنگی مولانا کے یہاں کہیں بھی نظر نہیں آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا بنیادی طور پر ایک منطقی ہیں۔ ایک منطقی اظہارِ افکار و خیالات کے لیے خطابت کی راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اُس کے پیش نظر دلائل کی منطقیت ہوتی ہے خطیبانہ آہنگ نہیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اپنی طرف ہی سے کہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اسلوب کے سلسلے میں دو تین مثالیں دوں تاکہ مولانا کی اپنی گواہی بھی مل جائے۔

سرگزشتِ غزالی کے مقدمے میں فرماتے ہیں۔

”کیا غزالی فلسفی ہیں؟“ اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غزالی اندازِ استدلال اور ذہن و فکر کی ساخت کے اعتبار سے تو قطعی فلسفی ہیں ہی۔ زندگی اور اسلوبِ زیست کے نقطہ نظر سے بھی فلسفی ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کیونکہ ذہن و فکر کے اعتبار سے فلسفی ہونا اور بات ہے اور پوری زندگی کو حکمت کے سانچوں میں ڈھال لینا شئی دیگر۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ساری فلسفیانہ نگ دود اور حکیمانہ موشگافیاں دینی قسم کی ہیں اور ان کا مقصد کائنات کے اسرار و رموز کے بارے میں مطلق سچائی کو پالینا نہیں، بلکہ صدق و حقانیت کی ایسی منطق تک رسائی حاصل کرنا ہے جس سے اسلامی عقائد و افکار کی تائید ہو سکے“ (صفحہ ۵۵)

انکارِ غزالی میں تصوف کی وضاحت و صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔  
 ”ہمارے نزدیک وہی تصوف صحیح ہے جو ذوقِ عبادت کو نکھارتا اور کردار و سیرت کو چمکا تا ہے یا جس سے نظر و بصر میں حکیمانہ اور عارفانہ مذاق اُبھرتا ہے۔ اگر تصوف کو ان حدود میں رکھا جائے اور اخلاص و طرزِ فکر تک اس کے فیوض سے فائدہ اٹھایا جائے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی جُز کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے بلکہ اس کے دائرے اجتماعیت کے دوائر سے ملتے ہیں، اور ان میں نہایت مفید تبدیلیوں کے موجب ثابت ہوتے ہیں“ (ص ۳۷)  
 صرف دو مثالیں اور دوں گا۔ تحریکوں کے بارے میں تعلیماتِ غزالی کے صفحہ ۴ پر یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔

”دینی اور علمی تحریکیں اپنے سفر کا آغاز کسی متعین وقت سے نہیں کرتیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں فکر و عمل کے کچھ سادہ نقطے معاشرے کی سطح پر اُبھرتے ہیں اور پھر وقت کی رفتار اور مناسبتوں سے یہی نقطے متعین نقوش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن میں رنگ و روغن بھی ہوتا ہے اور شوخی اور چلا بھی۔“

افکارِ ابنِ خلدون میں یہ بتاتے ہوئے کہ ابنِ خلدون نے خود کو نمایاں کرنے کے لیے کوئی سطحی طریقہ اختیار نہیں کیا تھا، لکھتے ہیں:

”پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اتنے بڑے آدمی کو جس کی ذہنی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں

اور حوائیہ مقام و موقف اور شخصیت کی اثر آفرینوں سے روشناس بھی ہے جیسا کہ اس کی تحریروں

سے ظاہر ہے، ضرورت ہی کیا پڑی ہے کہ وضع و جعل کے گھٹیا اور نامہروپ سے اپنی عظمت میں اضافہ کرے، جب کہ اپنی بے پناہ قابلیتوں کے بل بوتے پر وہ اس لائق ہے کہ سفاک مشرق تیمور سے لے کر فٹاک مغرب پیڈرو تک کو متاثر و مسحور کر سکے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کی تحریروں میں کہیں کہیں مشکل الفاظ بھی آجاتے ہیں مگر ان الفاظ کے استعمال سے عبارت ادق اور عیسر الفہم نہیں ہوتی۔ اپنے تخلیقی کاموں میں ہر لمحہ عربی زبان سے ان کا جو تعلق قائم ہے اس سے ایسا ہونا ضروری ہے لیکن مولانا کی خوبی یہ ہے کہ وہ عبارت کی روانی میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے۔ ان کا سنبھلا سنبھلا، نکھر نکھرا، اُجلا اُجلا اسلوب انتہائی مؤثر ہے اور قاری کے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

میں نے دینی علوم کے تین بڑے مفکروں کی تحریریں پڑھی ہیں۔ ان میں سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، دوسرے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور تیسرے مولانا محمد حنیف ندوی۔ میں ان کے اسالیب بیان کا تجزیہ اس طرح کرتا ہوں:

مولانا ابوالکلام کے اسلوب کا تصور کرتا ہوں تو میری نگاہوں کے سامنے ایک ایسی شوریہ مندی آجاتی ہے جو طوفانی رفتار سے بہتی ہوئی، لڑکتے کے بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتی ہوئی اور انھیں بہاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اسلوب کی مثال ایک ایسی صاف، شفاف، آئینہ رنگ ندی کی ہے جو پتھروں سے بچتی ہوئی، دھیرے دھیرے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

مولانا حنیف ندوی کے اسلوب کو بھی ندی ہی کے توسط سے پیش کروں گا، مگر یہ ایک ایسی ندی ہے جو نہ تو طوفانی رفتار سے بہتی ہے، نہ اس میں داخلی اور خارجی نوعیت کا جوش و خروش ہے۔ یہ پتھروں سے ٹکراتی بھی نہیں، مگر ان سے الگ بھی نہیں ہوتی، بلکہ بڑی ملائمت سے انھیں اپنی گود میں لے کر چپ چاپ چلی جاتی ہے۔

# دینِ حنیف

اور

مولانا محمد حنیف ندوی

تحسین فراقی

ندوہ کا تصور کیجیے تو ایک بہ یک لوح ذہن پر ایک دو نہیں بیسیوں ندوی راہب مبتدل کے چراغ کی طرح کو دینے لگتے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کی جوئے شیر کے فرہاد سید سلیمان ندوی سے آغاز کیجیے اور عبدالباری ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالرحمن نگرامی ندوی، رئیس احمد جعفری ندوی، نجیب اشرف ندوی، شاہ معین الدین ندوی اور مسعود عالم ندوی تک اور وہاں سے ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد صنیف ندوی تک پہنچ جایے، کہیں بھی یہ سلسلہ متین ٹوٹتا ہوا محسوس نہیں ہوتا بلکہ مور و محض کی طرح ایک تسلسل سے ہم کنار ہے۔ علمائے اسلام کا یہ وہ گروہ ہے جس نے دل کے عوض دانش اندوزی نہیں کی بلکہ دل اور دانش دونوں کے اتصال جمیل سے ایک چیزے دیگر ترتیب دی ہے۔

آج سے تقریباً ایک صدی قبل جب غاک ہند لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کے درج ذیل مقاصد متعین کیے گئے:

- ۱۔ نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔
- ۲۔ علما کے باہمی نزاع اور اختلافی مسائل کے رد و کد کا پورا انسداد۔
- ۳۔ عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کی تدبیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات سے یکمل علیحدگی۔
- ۴۔ ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام۔
- ۵۔ محکمۂ افتا کا قیام۔

ندوہ، ندویوں اور ندوی تحریروں کے کامل فہم کے لیے ان مقاصد کو پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ خود ندوہ اور خصوصاً ندوی ان مقاصد کی کہاں تک پاس داری کر سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ ندوہ بالعموم اور ندوی بالخصوص

ان مقاصد میں سے ایک دو کے ساتھ منسلک نہ رہ سکے، مثلاً سیاسی اور ملکی معاملات سے مکمل علیحدگی نہ ممکن تھی نہ مستحسن۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدا میں ندوہ سیاسی معاملات سے الگ تھلگ رہا۔ یہ الگ بات کہ اس کے باوجود صوبہ جات متحدہ کا گورنر انشونی میکڈونل ندوہ کا سخت مخالف ہو گیا، اور ادھر مولانا احمد رضا خاں نے ندوہ کے مقابلے میں ”جدوہ“ قائم کیا۔ ندوہ آج بھی قائم ہے، ”جدوہ“ کا نام صرف کتابوں میں محفوظ رہ گیا۔ دل کی دھڑکنوں اور صباغ کی کردٹوں میں بار نہ پاسکا۔ اور ہاں اس سلسلے میں دو اور دلچسپ باتیں سننے چلیے۔ ایک تو یہ کہ ندوہ کا سنگ بنیاد کسی دیسی نے نہیں بدیسی نے رکھا یعنی مالکِ متحدہ کے گورنر سر جان ہیوٹ نے اور دوسرے یہ کہ بقول ایس ایم اکرام اس سے پانچ سال بعد یعنی ۱۹۱۳ میں ندوہ کے معتمد علامہ شبلی نے ندوہ کے ایک مدرس مولوی عبدالکریم کو جہاد پر ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں معطل کر دیا :

اے عقل چہ می گوئی، اے عشق چہ فرمائی ؟

ندوی کلچر کی تفہیم کے لیے یہ بات بھی مد نظر رہنی چاہیے کہ اس کی تعمیر میں علی گڑھ کی فکریات اور جدید مصری علم کلام دونوں کا حصہ ہے اور شیخ محمد اکرام کے خیال میں یہ دونوں زاویہ ہائے فکر شبلی کے توسط سے ندوہ پہنچے اور پہلے پھولے۔

دورِ حاضر میں جب خبرِ بازاری اور خرید و پستی بہت بڑھ گئی ہے، نیک و بد کی تمیز اٹھ گئی ہے، حسین اور قبیح کا امتیاز ختم ہوتا جا رہا ہے اور جب ہم میں سے اکثر علم کے نام پر سائے کو اسیر کرنے کی فکر میں ہیں تو حقیقی اور نافع علم کی کساد بازاری پر تعجب کیسا ؟ عارفِ رومی فرماتے ہیں :

مرغ بر بالا پراں و سایہ اش      میدود بر خاک، پر آں مرغ و ش  
اہلبے صیاد آں سایہ شود      میدود چنداں کہ بے مایہ شود  
یعنی نتیجہ یہ کہ :

شوقِ لیلانے سول سروں نے اس مجنون کو

اتنا دوڑا یا لنگوٹی کر دیا پستون کو

افسوس کہ ہم دھوئیں کے شیدائی اور آگ کے وجود کے منکر ہیں۔



بہر حال ایسے میں مولانا محمد حنیف ندوی جیسے بزرگوں کے کام اور قد کو دیکھ کر زندگی پر اعتماد بحال ہوتا ہے اور سچے علم کی پیاس بڑھتی ہے۔ پیرِ رومی نے فرمایا تھا کہ عالم کو دیکھنا عبادت ہے کہ اس سے نیک بختی کے دروازے کھلتے ہیں۔ اللہ الحمد کہ ہم نے ندوی صاحب کی متعدد بار زیارت کی ہے۔

مولانا حنیف ندوی صاحب کی تحریروں میں ایک نہیں کئی چراغ روشن ہیں۔ فلسفہ، علمِ کلام، فقہ، تفسیر، تعبیر، توحید، تہذیب، لسانیاتِ قرآن اور حدیث کے سلسلے کے مباحث۔ آپ ان چراغوں کو الگ الگ تو پہچان سکتے ہیں لیکن ان سے صادر ہونے والی روشنی ایک دوسرے میں اس طرح نفوذ کر گئی ہے کہ اس کو الگ الگ کرنا کارِ محال ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلام کے بہشت پہلو تکررِ صحن و مقف تک رسائی حاصل کرنے کے لیے علومِ اسلامیہ کے صدر دروازے سے گزرنا کس قدر ضروری ہے۔ اسی ضرورت نے ”اساسیاتِ اسلام“، ”مطالعہ حدیث“، ”مطالعہ قرآن“، ”افکارِ غزالی“، ”تعلیماتِ غزالی“، ”سرگزشتِ غزالی“، ”عقلیاتِ ابن تیمیہ“ اور ”لسان القرآن“ جیسی کتابوں کو جنم دیا ہے۔ مولانا ندوی نے اپنے موضوعات کے انتخاب اور احاطے میں توازن کو برقرار رکھا ہے اور اس باب میں خاصی وسعت بہم پہنچائی ہے اور یوں اپنے موضوعات سے انصاف کیا ہے۔ ورنہ ہمارے لکھنے والوں میں سے اکثر کا حال اس امریکی پروفیسر سے مختلف نہیں جس کا موضوعِ گفتگو تھا ”SNAKES IN IRELAND“ اور جو شیخ پر چڑھا تو یہ کہہ کر اتر آیا تھا:

“LADIES AND GENTLEMEN, THERE ARE NONE”

نامردی و مردی قدے فاصلہ دارد

مولانا عبد الماجد دریا بادی نے اپنے سفر نامہ پاکستان میں مولانا حنیف ندوی کا ذکر کرتے ہوئے ایک عرصہ پہلے لکھا تھا،

”جعفری صاحب بھی اچھا خاصہ وقت گزار کر واپس گئے اور صبح جب آئے تو ایک صاحب کو ساتھ لیے ہوئے۔ یہ صاحب کوئی تاجِ مہمل نہ تھے، مولانا محمد حنیف ندوی تھے، خاصے پرانے اہل قلم اور بزمِ ثقافت میں جعفری صاحب کے ہم بزم۔ ان سے کوئی ۱۲-۱۵ سال پہلے

## ارمغانِ حنیف

اسی لاہور میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اس وقت بالکل جوان تھے، اب سپمانے نہیں جاتے تھے مسک کے لحاظ سے اہل حدیث لیکن اعتقادی، کلامی، فقہی ہر غلو ندوی ”کلچر“ سے دبا ہوا۔ مہذب مشستہ اور شائستہ“

اور واقعہ یہ ہے کہ دریا بادی صاحب کا یہ بیان ندوی صاحب کی شخصیت کے فہم میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مسک کے اعتبار سے اہل حدیث ہونے کے باوجود ان کی تحریروں میں اس خستونت اور سرکہ آرائی کو کہیں دخل نہیں جو عموماً اس گروہ میں اور اس کی تحریروں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں وہی شائستگی، رفتگی اور شستگی نظر آتی ہے جو ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔

مولانا کی چودہ پندرہ کتابوں کا فرداً فرداً محاکمہ نہ تو اس نشست میں ممکن ہے اور نہ میں خود کو اس کا اہل پاتا ہوں۔ البتہ ان کے مطالعے سے جو مجموعی تاثر ذہن پر مرتسم ہوتا ہے، وہ ایک ایسے عالم دین کا ہے جو دین کا قابل لحاظ فہم بھی رکھتا ہے اور مختلف عصور و دہوروں کے فکری سرمائے کے علاوہ اپنے عہد کی روح اور اس کے مسائل سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔ جس کا نقطہ نظر مختلف علوم اور سماجی، سیاسی اور تہذیبی نظام ناموں کے سلسلے میں واضح، غیر جانب دارانہ اور معروضی ہے۔ جو تنقیح و تہذیب اور جرح و تعدیل کے فن سے کما حقہ واقف ہے۔ جو تقلیدِ جامد کا مخالف ہے، اجتہاد کو دنیا نئے اسلام کی اہم ترین ضرورت خیال کرتا ہے اور اہم تر بات یہ ہے کہ زبان عربی اور اس کی نزاکتوں اور دلائلوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ جو مغربی علوم و آثار سے نہ تو بدگشتا ہے اور نہ انھیں کلیدۃ قبول کرنے کا حامی ہے اور جس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ :

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر  
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کی سحر کر

مولانا ندوی اس بات کے قائل ہیں کہ زمانہ ہر لحظہ متغیر ہو رہا ہے، اس کے احوال و ظروف بدل رہے ہیں، اس کی کیفیات اور کمیتیں متبدل ہو رہی ہیں اور اس کے مظاہر و منہاج میں تبدیلی آ رہی ہے، اس لیے اس تیز رفتور زمانے کا ساتھ دینے کے لیے مسلم فکریات میں اجتہاد کے

اصول کا کارفرما ہونا نہایت ضروری ہے، لیکن کم نظر اور جاہل شخص اجتہاد کا ہرگز اہل نہیں اور اس کے لیے جو کڑی شرائط اکابر نے مقرر کی ہیں، ندوی صاحب ان سے کاملاً متنق نظر آتے ہیں۔ چونکہ اجتہاد کی شرائط میں سے اولیت کامل قرآن فہمی کو حاصل ہے، اس لیے مولانا نے ”مسئلہ اجتہاد“ میں قرآن فہمی کے اصول بڑی خوبی سے منتق کیے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا نے ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں،

” مدت ہوئی ایک صاحب کے فہم قرآن کا بڑا چرچا تھا اور یہ مشہور تھا کہ فہم قرآن میں ان کا اپنا ایک قابلِ قدر مدرسہ فکر ہے۔ یہ بزرگ خود تو اکثر باہر رہے۔ ان کے ایک شاگرد رشید کو البتہ یہ توفیق ہوئی کہ وہ اُن کے تفسیری نوٹوں کو شائع کریں۔ ہم نے جب پہلے پہل میں محشی قرآن کو دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ اس میں آیاتِ حیض سے بڑے بڑے سیاسی مسائل کا استنباط کیا گیا تھا۔“

مولانا نے تفسیر، تلویل، توجیہ اور تعبیر کے اصولوں سے اپنی کتابوں میں بڑی فکر افروز بحثیں اٹھائی ہیں۔ وہ چیزوں کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر رکھتے ہیں۔ انھیں اس بات پر افسوس ہے کہ قرآن کی بعض ایسی مؤیدات ہیں جن پر غور نہیں ہوا۔ حدیث کے بدنام وقائع عبدالکریم بن ابی العوجار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”جب فیصلہ ہوا کہ اس کی گردن مار دی جائے تو اس نے کھلے بندوں اقرار کیا کہ میں نے قریب قریب چار ہزار حدیثیں گھڑی اور مسلمانوں میں رائج کی ہیں، جن میں بہتری حلال چیزیں ہیں، جن کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اور بہتری حرام ہیں جن کو حلال قرار دیا گیا ہے۔“

اس بیان پر مزید دلچسپ اور فکر افروز اضافیوں کہتے ہیں: ”ہماری رائے میں یہ ابن العوجار کا آخری بھوٹ ہے جو وہ بول سکا ہے۔ اس سے اس کی غرض یہ تھی کہ وضع حدیث کا حیلہ تو کامیاب نہیں ہوا، اس طرح محدثین کے حلقوں میں پھیل تو پیدا ہو جائے گی، ورنہ کون نہیں جانتا کہ ابن العوجار سے بہت پہلے حلت و حرمت کی واضح بنیادوں پر اسلامی معاشرہ قائم ہو چکا تھا اور چل رہا تھا۔“

اجتہاد بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح برسرِ کار آتا ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے

کر لیجیے کہ حضرت عمرؓ نے قطعِ ید کی سزا اس لیے منسوخ کر دی کہ معاشرہ اور حکومت ایسے حالات و ظروف نہ پیدا کر پاتا تھا جس میں کوئی شخص چوری سے باز رہتا، حلال کہ اس باب میں سورہ مانہ میں نصِ صریح قطعِ ید سے متعلق موجود تھی! اسی طرح غلامی کا مسئلہ ہے، ندوی صاحب کی رائے میں غلامی کے انسٹی ٹیوشن کو اضطراراً اور بعض شرائط و تریمات کے ساتھ قبول کر لیا گیا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حالات کی تبدیلی کے بعد بھی اس ادارے کو محض اس لیے قائم رکھا جانا چاہیے تاکہ فقہ و حدیث میں اس سے متعلق جو بحثیں اور تفصیلات مرقوم ہیں ان سے استفادہ کیا جاسکے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر بالفرض مستقبل میں سوزاک و آتشک اور برص و جذام سے انسان مخلصی حاصل کر لیتا ہے تو بعض لوگوں کو اس پر اصرار ہو کہ ان بیماریوں کا وجود ضروری ہے تاکہ ان کے باب میں تحقیق و کاوش پر مبنی طبی سرمایہ بے کار نہ رہا جائے۔ اجتہاد کے باب میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا زوال اور انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا نازک بھی ہے۔ مولانا نے بعض متاخرین کا تو اس باب میں دفاع کیا ہے کہ اس زمانے میں حالات میں بے راہ روی تھی، حکومتیں کمزور اور غیر اسلامی رجحانات کی حامل ہو رہی تھیں، عوام میں ہوس دنیا کا غلبہ تھا۔ عقلی فتنوں نے عقیدوں کی استواری میں کئی کئی رخنے ڈال دیے تھے اور ہر جاہل و بد عقیدہ آدمی کو حق حاصل تھا کہ دین کے بارے میں جو چاہے کہے۔۔۔ اس نزاکتِ احوال کو دیکھ کر فقہانے ملحدانہ اجتہاد کے مقابلے میں تقلید و تقیید کی قباحتوں کو ترجیح دی۔

سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کے اسلام میں سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حالات آج بھی دیئے نہیں ہیں؟ پھر اجتہاد کا دروازہ کھولنے پر اصرار کیوں کیا جا رہا ہے؟ میں نہیں کہتا کہ اس باب میں علامہ اقبالؒ کا نقطہ نظر کس حد تک درست تھا، مگر انھوں نے تو عہدِ حاضر کے لیے بھی ”تقلیدِ آبا“ ہی کو اولیٰ تر قرار دیا تھا، اور یوں متاخرین فقہانے اتفاق کیا تھا۔

عہدِ حاضر فتنہ ماریر سراست	طبعِ ناپروائے او آفت گراست
جلوہ اش مارا زما بیگانہ کرد	سازِ مارا از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتشِ دیرینہ برد	نور و نارِ لاله از سینہ بُرد

مضمحل گردو چو تقویمِ حیات      ملت از تقلید سے گیر و ثبات  
 راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است      معنی تقلید، ضبطِ ملت است  
 درخزاں لے بے نصیب از برگ و بار      از شجرِ گسل باُستد بہار  
 بحرِ کم کردی زیاں اندیش باش      حافظِ جوئے کم آبِ خویش باش

(رموزِ بے غوی)

مطلب یہ کہ ایسے دورِ پُرفتن میں زمانہ نامنہی کی سحر بے کراں کی طرح پھیلی ہوئی عظمتوں کا حصول تو ممکن نہیں رہا، مگر تقلید کے ذریعے اپنی ”جوئے کم مایہ“ کو تو بہر حال بچایا جاسکتا ہے۔ مولانا ندوی صاحب کی تحریروں میں فکر و تدبیر کا عنصر ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔ وہ سوال اٹھاتے چلے جاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہیں فلسفے کی نارسائیوں پر گفتگو ہو رہی ہے تو کہیں متکلمین اسلام کی بے نفع موشگافیاں زیرِ بحث آرہی ہیں، کہیں اقا نیم ثلاثہ کی بے منتوی اجاگر کی جا رہی ہے تو کہیں ثقافت کے خدو خال نمایاں کیے جا رہے ہیں۔ کہیں تاریخی جبریت کی نفی کی جا رہی ہے تو کہیں مستشرقین کی تلبیس و دجل کا پردہ چاک کیا جا رہا ہے۔ کہیں ابنِ خلدون کے تنقیدی، عمرانی اور علمی خیالات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور اس کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا جا رہا ہے اور کہیں یونانیات کے گھنیرے بادلوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کی حالت اور امام غزالی کے بصیرت افروز ارشادات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ یوں مولانا کی تحریروں میں حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے جو عہدِ حاضر میں کم کم علما کو نصیب ہوا ہے۔

امام ابن تیمیہ پر بالعموم اور غزالی پر بالخصوص مولانا نے جس تفصیل سے لکھا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ مولانا نے ان موضوعات اور ان کی RELEVANCE کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ امام ابن تیمیہ ہوں یا غزالی، دونوں نے اپنے عہد کے داخلی و خارجی فتنوں میں اور قیامت خیز انتشار میں احیائے اسلام کے نقشے مرتب کیے۔ امام ابن تیمیہ نے تو بقول مولانا چوکھی لڑائی لڑی اور جہاں انھیں تانابریوں اور نصیریوں کے مقابلے میں تلوار اٹھانا پڑی، وہیں فقہائے جمود اور صوفیائے الحاد اور شعبہ طرازیوں اور متکلمین کے غلط تصورات کے خلاف قلم کو جنبش دینا پڑی۔ لیکن افسوس کہ انھیں عام طور پر رجعت پسند گردانا گیا، حالانکہ ندوی

صاحب کے خیال میں ان پر یہ الزام بے معنی ہے۔ ان کی رائے میں ”جو شخص ارسطو کی منطق پر کڑی تنقید کرتا ہے اور لیکن اور لائبنز سے بھی پہلے اس کی افادیت کو مشکوک قرار دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک مثبت، آسان اور قابلِ فہم منطق کی طرح ڈالتا ہے تو یقیناً ایسا شخص تقدم پسند اور فکر و دانش کے قافلوں کو آگے بڑھانے والا ہے۔“

امام غزالی نے مسلم نشاۃ ثانیہ میں جہاں دیگر کئی کارنامے انجام دیے، وہیں ان کا ایک بڑا معرکہ فقہ اور تصوف کی تطبیق و ترویج ہے، اوریوں دونوں کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھ لیں کہ اسی غزالی نے اپنے عہد میں بقول شبلیؒ ”ایک جم غفیر کو برا فرضہ کیا۔۔۔“ فقہانے فتویٰ دے دیا کہ ان کی تصنیفات اور خصوصاً احیاء العلوم کا مطالعہ کرنا گناہ ہے۔ اسپین کے علمائے، جن کے سرگروہ قاضی عیاض تھے، ان کی تصنیفات بادشاہ کے سامنے پیش کیں اور رائے دی کہ سب جلادینے کے قابل ہیں، چنانچہ کل کی کل جلادی گئیں۔۔۔ مخالفت کا سلسلہ امام صاحب کی وفات کے بعد بھی مدت تک قائم رہا۔“

واضح رہے کہ ان کتابوں کو جلادینے کا فتویٰ قاضی عیاض مالکی جیسے عالم نے دیا تھا جو کتاب الشفا کا ممتاز مصنف اور مسلم کا شارح تھا۔ آج علامہ غزالی کی تمام کی تمام کتابیں علماء و مشائخ کی جلے پناہ ہیں۔ شبلی کے بعد غزالی کا احیا مولانا محمد حنیف ندوی کے حصے میں آیا ہے اور وہ لائقِ مبارک باد ہیں۔

مولانا کا تازہ ترین کارنامہ ”لسان القرآن“ کی تدوین و تصنیف ہے۔ مولانا سے پہلے اردو، انگریزی اور عربی میں متعدد حضرات نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ اردو میں محمد عبدالرشید نعمانی اور غلام احمد پرویز کی لغات القرآن کا نام لیا جاسکتا ہے، عربی میں امام راغب کی مفردات کا اور انگریزی میں جان پینرس J. PENRICE کی "DICTIONARY" "Glossary of the Quran" کا، جو انیسویں صدی کے اواخر میں

شائع ہوئی۔ اردو میں اس باب میں عبدالرشید نعمانی کا کام اب تک اہم ترین کارنامہ تھا کیونکہ انھوں نے اپنی کتاب میں صرف لغاتِ قرآنی کے معنی ہی نہیں دیے تھے بلکہ جا بجا تاریخی، کلامی اور دیگر متعدد تفسیری و فقہی مباحث بھی درج کیے ہیں اور اکابر کے اقوال

نقل بھی کیے ہیں اور ان پر محاکمہ و تجزیہ کا اہتمام بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالمجید دریا بادی نے جامعیت کے لحاظ سے اسے مفرداتِ راغب پر ترجیح دی تھی۔ آج مولانا دریا بادی زندہ ہوتے تو مولانا ندوی کے اس کارنامے کو راغب اور نعمانی دونوں سے بہتر بتاتے۔

مولانا ندوی کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے کام کو سات آٹھ صفحات میں تو نپٹایا نہیں جاسکتا۔ انھوں نے اپنے لیے جتنے سنگلاخ موضوعات کا انتخاب کیا، ان کی اجمالی تفصیل بھی ناممکن ہے۔ فلسفہ، لسانیات، علم کلام اور اجتہادی و فقہی موضوعات پر مولانا نے جس سہولت سے لکھا ہے وہ قابلِ داد ہے اور یہ سب کچھ ایک نکھرے سُتھرے اسلوب میں پیش کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا ندوی کی کتابیں فکر کو غذا مہیا کرتی ہیں اور اسلام کی بہتر تفہیم میں معاون ہوتی ہیں اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ مولانا لائقِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنی عمر طویل اعتراض اور گوشہ نشینی میں گزار دی اور یوں متنوع علمی کارنامے انجام دے سکے۔ مور لوگوں کی نظر میں آنے لگے تو اس کے پر اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ مولانا اپنی روشنی طبع کے باوجود دشمنوں کے شر سے محفوظ رہے اور دوستوں کی تحسین بے جا سے بے نیاز!

# مولانا محمد حنیف ندوی

بہشتی ریڈیو مفت سر

عبدالحی قریشی



۱۹۶۳ میں مجھے ریڈیو پاکستان لاہور کے شعبہ تقاریر کا انچارج پروڈیوسر بنایا گیا۔ اُن دنوں دینی تقاریر کا کوئی الگ شعبہ تو ہوتا نہیں تھا، بس ہفتے میں دو تقریریں اردو تقاریر کے جدول کا حصہ ہوتی تھیں۔ میرا شعبہ تقاریر میں دوسرا ہی دن تھا، پروگرام مینٹگ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ ایک بزرگ نہایت عمدہ سلی ہوئی علی گڑھ کٹ کی شیرانی، سفید پاجامہ اور چمک دار براؤن جوتا پہنے ہر پر جناح کی پ رکھے میری میز کے سامنے والی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ چہرے پر پاکیزگی کے آثار نمایاں تھے، میں ان سے نہایت متاثر ہوا۔ میں نے سلام عرض کیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس بزرگ سے عرض کیا ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ انھوں نے باریک خط میں لکھا ہوا دو صفحات پر مشتمل مسودہ اور اس کے ساتھ نٹھی کیا ہوا کنٹریکٹ کا جوابی حصہ میری طرف بڑھا دیا۔ مسودے کے ایک کونے پر لکھا ہوا نام پڑھ کر میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ادب سے سلام عرض کیا۔ یہ تھی میری حضرت مولانا محمد حنیف ندوی سے پہلی ملاقات — ان کا نام میں نے سُن رکھا تھا اور تحریریں بھی پڑھی تھیں۔ اسلامی فلسفے کے موضوع پر اُن کی تحریروں سے میں بہت مرعوب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے مولانا کا نام پڑھا تو ان کی عظمت و احترام نے مجھے کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس زمانے میں تقریریں ریکارڈ کرنے کا رواج نہ تھا اور نہ ریڈیو پاکستان کے پاس ٹیپس اور ٹیپ ریکارڈ تھے، سارے ریڈیو اسٹیشن پر ایک ایکس ٹیپ ریکارڈ ہوتا تھا جو صدر، وزیراعظم اور دیگر مقتدر حضرات کی تقریریں ریکارڈ کرنے اور نشر کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ کنٹریکٹ پر نظر پڑی تو ابھی اس تقریر کے نشر ہونے میں دس دن باقی تھے۔ میں نے عرض کیا، ”حضور ابھی تو اس تقریر کے نشر ہونے میں دس روز باقی ہیں، آپ یہ مسودہ اور کنٹریکٹ کسی دوسرے

آدمی کے ہاتھ بھجوا دیتے، آپ نے خود زحمت کیوں کی۔“ بڑی شفقت سے فرمانے لگے ”کنٹرکٹ پر لکھا ہے کہ مسودہ تاریخ نشر سے دس روز پہلے بھجوا دیا جائے۔ خود لے کر اس لیے آگیا ہوں کہ آپ اُسے ایک نظر دیکھ لیں اور اگر اس میں کوئی تبدیلی کرنا مقصود ہو تو آپ کی مرضی کے مطابق کر دوں۔“ میں تو مولانا کے سامنے ایک ادنیٰ درجے کا طالب علم تھا، میں ان کے مسودے میں کیا تبدیلی کر سکتا تھا۔ عرض کیا ”آپ کا مسودہ یقیناً ٹھیک ہوگا، میں اُسے کیا دیکھوں؟“ فرمانے لگے ”ہم تو اپنے علم کے مطابق اس کو لکھ لائے ہیں، حکومت کی پالیسی کیا ہے، یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ آپ اس مسودے کو پالیسی کے نقطہ نظر سے دیکھ لیں۔“ میں نے مسودہ پڑھا، نہایت رواں اور سلیس اردو میں، موضوع سے متعلق اتنا خوب صورت اور مدلل مسودہ میں نے کم ہی لوگوں کا دیکھا ہے۔

مولانا کو اپنے سامعین کا پورا خیال رہتا ہے۔ ان کی کتابیں بھی پڑھی ہیں، زبان و بیان نہایت عالمانہ۔ کتاب پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہوتی ہے لیکن ریڈیو کے سامعین میں تو ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، تعلیم یافتہ بھی اور اُن پڑھ بھی، لیکن معلومات حاصل کرنا اور مختلف امور سے آگاہ ہونا اُن پڑھوں کا بھی حق ہے، وہ بھی ریڈیو سے جو بات نشر ہو رہی ہو اس کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مولانا کو ان کا بھی خیال رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، آسان الفاظ، عمدہ استدلال اور زبان اس درجے آہستہ خرام کہ ایک کے بعد دوسری بات سامعین کے ذہن نشین ہوتی جاتی ہے، اور یہی کسی ریڈیو مقرر کا کمال سمجھا جاتا ہے کہ جب گفتگو ختم ہو تو ہر سننے والا نشر کی گئی بات اپنی ذہنی استعداد کے مطابق سمجھ چکا ہو۔ میرے خیال میں مشکل نویسی سہل ہے اور آسان و سلیس نویسی نہایت مشکل۔ مولانا محمد حنیف ندوی، اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔

اپنے دور کے علما میں مولانا اُن چند گنی چنی ہستیوں میں سے ہیں جن کی ہر بات سند کا درجہ رکھتی ہے۔ بعض لوگوں کو اس احساس نے کسی حد تک مغرور اور خود پسند بھی بنا دیا اور ان کے ذہن میں ہر وقت پروٹوکول رہتا ہے، مگر مولانا کو تو یہ بات چھو کر بھی نہیں گئی۔ وہ منکسر المزاج، خلیق، چھوٹے بڑے ہر ایک سے شفقت و محبت سے گفتگو کرتے ہیں۔

ریڈیو پاکستان کے پروگرام کا عملہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں سے منتخب کیا جاتا ہے اور ان میں بعض لوگ اپنے اپنے دائرہ کار میں سند کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ پڑھے لکھے حضرات سے بے تکلفی سے بات کرتے ہیں۔ لیکن مولانا محمد حنیف ندوی جب بھی ریڈیو سٹیشن تشریف لائے ہر ایک نے ان کا احترام کیا اور ان کے مقام کا خیال رکھا۔ بعض اوقات یہ احترام سنجیدگی بھی اختیار کر جاتا تو مولانا اس بات کو بھانپ کر ماحول کو خوش گوار بنانے کے لیے نہایت شستہ اور شائستہ لطائف بھی سناتے، جس میں مزاح کے ساتھ اعلیٰ پائے کی علمی باتیں بھی سامعین کو میسر آتیں۔

مولانا مسک کے اعتبار سے غیر مقلد ہیں اور یہ عام خیال اور تجربہ ہے کہ غیر مقلد حضرات بہت سختی سے اپنے مسک کی پابندی اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر مولانا محمد حنیف ندوی اور مرحوم مولانا سید ابوبکر غزنوی یہ دو ایسے غیر مقلد میں نے دیکھے ہیں جو اپنے مسک سے ہٹے بغیر دوسروں کی دل جوئی کا خیال رکھتے۔

ریڈیو پر ہر قسم کے دینی موضوعات پر مولانا حنیف ندوی نے تقریریں کی ہیں، مگر کبھی ایک فقرہ بھی ایسا نشر نہیں ہوا جو قابل گرفت ہو یا کسی دوسرے مسک پر تنقید کا پہلو لیے ہوئے ہو۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے میں نے ایک نہایت جرأت مندانہ پروگرام ”حی علی الفلاح“ کا آغاز کیا۔ اس پروگرام میں زندگی سے متعلق نازک ترین موضوعات زیر بحث آتے، مقالہ نشر کرنے کے بعد مقالہ نگار کو وضاحتی سوالات کے جواب بھی دینا پڑتے۔ یہ مرحلہ مقالہ لکھنے سے زیادہ کٹھن ہوتا ہے کہ اچانک کوئی کتنا بیڑھا تنقیدی سوال کر دے۔ بڑے بڑے جید علمائے اکثر مجھے کہا کہ قریشی صاحب مقالہ لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا آپ کے وضاحتی سوالات کے جواب دینا مشکل ہوتا ہے۔ مگر مولانا موصوف نے نہ کبھی اس مشکل کا اظہار کیا اور نہ کبھی کسی پیچیدہ سوال سے گھبراتے، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ مولانا کو اس سوال کا پہلے سے علم تھا اور وہ اس سے متعلق ہوم ورک کر کے اور پوری طرح تیار ہو کر تشریف لاتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے صفر کے مہینے کے آخری آٹھ دنوں میں ایک گھنٹہ روزانہ کا پروگرام

”ہفتہ“ حدیث کے عنوان سے ترتیب دیا۔ اس میں ایک مقالہ حجیتِ حدیث کے موضوع پر مولانا محمد حنیف ندوی کے نام بھی رکھا۔ میں اس پروگرام کی اطلاع دینے خود بھونڈپورہ مزنگ میں مولانا کے گھر پر حاضر ہوا۔ مولانا موضوع سن کر خوش ہوئے اور فرمانے لگے، آپ نے ریڈیو پر بڑی جرأت مندی کے ساتھ یہ موضوعات شیڈول کر دیے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں ایک بہت مؤثر سول سروس کا طبقہ حدیث کے حجت فی الدین ہونے سے انکاری ہے۔ اور ایک اور طبقہ بھی اس کے بیشتر حصے کی صحت سے انکاری ہے۔ میں نے عرض کیا مولانا میں نے علمی سطح پر حدیث کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ہی یہ ہفتہ شیڈول کیا ہے اور آپ جیسے علما کا مجھے تعاون حاصل رہا تو مجھے یقین ہے کہ اس کی ہر جگہ پذیرائی ہوگی۔ مولانا نے نہایت مدلل مقالہ لکھا اور اس سے متعلق وضاحتی سوالات کے جواب دیے۔ یہ سارے پروگرام مختلف سٹیشنوں سے کئی بار نشر ہو چکے ہیں اور بہت سے ایسے لوگ جو علمِ حدیث کے بارے میں شبہ میں مبتلا تھے، وہ راہِ راست پر آ گئے۔ یہ تمام پروگرام ریڈیو پاکستان کے سنٹرل پروڈکشن یونٹ میں محفوظ ہیں اور ایک علمی سرائے کا درجہ رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں مولانا کی آواز میں شاید اس سے زیادہ طویل دورانیہ کا کوئی پروگرام ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں محفوظ نہیں ہے۔

# مولانا محمد حنیف ندوی

واقعات و لطائف کے آئینے میں

محمد اسحاق بھٹی

۳۰۔ جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے مولانا محمد حنیف ندوی کے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا گیا تو ہمارے ڈائریکٹر جناب سراج میر صاحب نے مجھے فرمایا کہ میں مولانا کے واقعات و لطائف قلم بند کروں۔ چوں کہ عرصہ دراز سے میرا مولانا سے تعلق ہے اس لیے خود میں بھی چاہتا تھا اور یہ میرا دل پسند موضوع بھی ہے۔ پھر کسی دوسرے کے لیے اس فرض منصبی سے عہدہ برا ہونا مشکل بھی ہے، لہذا

قرعہ فال بنام من دیوانہ زردند

میں نے اس فریضے کو انجام دینے کے لیے اپنے ماضی قریب اور ماضی بعید کو آواز دی تو چھوٹے بڑے بے شمار واقعات قطار باندھ کر میرے سامنے آکھڑے ہوئے اور میں نے فوراً ان کو قلم اور کاغذ کی گرفت میں لے لیا۔ ان واقعات میں لطائف کا عنصر زیادہ ہے اور ہر واقعہ کسی نہ کسی جہت سے لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

لطائف کے لفظ سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ صوفیا کی طرف منسوب ہوں تو لطائف تصوف کہلائیں گے، علما سے متعلق ہوں تو لطائف علمیہ کے نام سے موسوم ہوں گے، ہمارے اکابر و اسلاف کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں تو انھیں اقوال و ملفوظات سے تعبیر کیا جائے گا اور اگر روزمرہ کی مجلسی زندگی میں بیان کیے جائیں تو ان پر ایسے لطائف و ظرائف کا اطلاق ہوگا جن میں ہلکا پھلکا مزاح بھی پایا جاتا ہو اور بے تکلفانہ پیرایہ بیان میں اظہار واقعہ بھی ہو۔

لطیفے سے پتا چلتا ہے کہ کوئی شخص کتنا زندہ دل، کتنا خوش طبع اور کس قدر خوش مزاج ہے۔ تنگ دل یا تنگ حوصلہ نہیں ہے۔ خود بھی بات کہنے کا ڈھنگ

جانتا ہے اور دوسروں کی بات برداشت کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ میں اپنے قارئین کو اس نتیجے پر پہنچانے کی کوشش کروں گا کہ مولانا محمد حنیف ندوی میں وہ تمام اوصاف پوری طرح پائے جاتے ہیں جن کا ایک مجلسی اور سوشل آدمی میں پایا جانا ضروری ہے۔ مولانا سے میری آشنائی پینتالیس برس کے طویل لیل و نہار میں پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۳۹ء سے (جب کہ میری عمر چودہ برس کی تھی) ۱۹۴۷ء تک ہر سال دو سال کے وقفے کے بعد مجھے ان کو دیکھنے، ان کی تقریریں سننے اور ان سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۹ء سے وسط ۱۹۵۲ء تک ان کے ساتھ بلکہ ان کے ماتحت کام کرنے اور کام سیکھنے کا شرف حاصل رہا۔ اس زمانے میں ہم زیادہ تر اکٹھا ہی رہتے تھے۔

۱۹۵۲ء سے اکتوبر ۱۹۶۵ء تک روزانہ شام کے بعد ہمارا ہوٹل بازی کا دور تھا۔ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء سے (جب کہ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوا) ۲۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء تک (جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں) ہوٹل بازی متروک ہے اور روزانہ دفتر میں ملاقات بھی ہو جاتی ہے، لطیفے بازی کا ”جس“ بھی پورا کر لیا جاتا ہے اور ادھر ادھر کی ضروری باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ مولانا سے بے پناہ تعلق خاطر اور بے حد عقیدت و محبت کے باوجود مجھے ان کی سب باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ اسی طرح مجھ پر انتہائی شفقت اور ہر اعتبار سے خیر خواہی کے باوصف وہ میرے سب خیالات سے متفق نہیں ہیں۔ بعض مسائل و معاملات میں نہ میں ان سے ہم آہنگ ہوں اور نہ وہ میرے ہم رائے ہیں، اور یہ ممکن بھی نہیں۔ یہ فطری امر ہے کہ کوئی دو آدمی فکر و عمل کے تمام گوشوں میں کبھی متحد اور متفق نہیں ہو سکتے۔ اس جہانِ رنگ و بو کی گماگمی اختلاف ہی کی رہینِ منت ہے :

گلمائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیبِ اختلاف سے

لیکن کسی اختلافِ رائے کو ہم نے کبھی یہ موقع نہیں دیا کہ وہ ہمارے باہمی تعلقات

پر ذرا بھی اثر انداز ہونے کی جرأت کرے۔ ہم نے اختلاف رائے کی باگیں ہمیشہ کس کر رکھیں ہیں، کسی لمحے بھی انھیں ڈھیلا نہیں چھوڑا اور اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ ہمارے دلوں میں نقب لگا سکے۔

ایسا بھی ہوا کہ بعض اوقات مولانا نے کسی معاملے میں مجھے سخت ڈانٹ پلائی، حالانکہ میں اس میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا تھا اور اس کے لیے دلائل بھی دے سکتا تھا، مگر میں نے سکوت کی چادر اوڑھ لی اور گردن نیچی کر کے ان کی ڈانٹ سہتا رہا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ مولانا سے تعلق عقیدت کی بنا پر کچھ لوگوں نے مجھے نشانہ عتاب بنایا، جس کا مجھے خمیازہ بھی بھگتنا پڑا، اور اس کا مولانا کو علم تھا، لیکن میں نے کوئی پروا نہیں کی۔

ان سطور میں جو آپ آگے پڑھیں گے نہ میں نے مولانا کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، نہ ان کے علم و فضل کے حدود کی وضاحت کی ہے، نہ ان کے افکار و نظریات کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے، نہ ان کے فلسفہ و حکمت کی بات کی ہے، نہ ان کی زبان و انداز اور اسلوب تحریر سے متعلق گفتگو کی ہے اور نہ ان کے تدبیر و تقویٰ اور زہد و عبادت کی داستانیں بیان کی ہیں۔ میں نے ان کو ایک شگفتہ مزاج انسان کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اسی حیثیت سے وہ واقعات و لطائف حوالہ قرطاس کیے ہیں جو میرے سامنے ظہور میں آئے۔

مولانا چھتر سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، اس لحاظ سے بلاشبہ وہ ایک بزرگ عالم دین ہیں۔ وہ اصطلاحی معنوں میں ”پیر“ نہ سہی لغوی معنوں میں بہر حال ”پیر“ ہیں۔ ہمارے ہاں یہ رواج پیدا ہو گیا ہے کہ جو عالم دین عمر پیری کو پہنچ جاتا ہے، ہم اس کے صرف وہ واقعات قلم و زبان پر لاتے ہیں، جن کا تعلق ورع و عبادت، تقویٰ، تدبیر اور زہد و تلہیت سے ہو، اور پھر اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک اُسے معصومین کی صف میں کھرا نہیں کر دیتے۔ اس حقیقت کو قطعاً پیش نگاہ نہیں رکھتے کہ وہ ایک انسان ہے، اس کے بیوی بچے بھی ہیں، دوست احباب بھی ہیں اور لوگوں



سے اس کے روالہ و مراسم بھی ہیں۔ وہ ہر ایک سے ملتا اور موقع و محل کے مطابق سب سے الگ الگ برتاؤ کرتا ہوگا۔ ہنستا بھی ہوگا، کسی سے بے تکلف بھی ہوتا ہوگا اور لطائف و ظرائف بھی سنتا اور سناتا ہوگا۔ اس کے صفحاتِ زندگی سے ہم یہ سب باتیں حذف کر دیتے ہیں اور اس پر کشف و کرامات کے غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی حیاتِ مستعار کے بے شمار انسانی پہلو پر وہ مخفا میں چلے جاتے ہیں۔ کسی عالمِ دین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور نیک ہے، زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک عالمِ دین یہ کام کرتا ہی ہے۔ اس کے اظہار کی آخر کیا ضرورت ہے۔ کسی کو شبہ ہے کہ وہ یہ فرائض بجا نہیں لاتا اور اس شبہ کا ازالہ ضروری ہے؟

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا کے قدم بہ قدم میری ”میں“ بھی چلی ہے اور اس کا مجھے احساس ہے۔ لیکن اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ جب عام زندگی میں مولانا میرے بغیر نہیں چلتے تو یہاں مجھے چھوڑ کر اکیلے کیوں کر آگے بڑھ سکیں گے۔ اگر ”میں“ اپنی ”میں“ کو مولانا کے ساتھ نہ چلاؤں یا وہ اسے اپنے ساتھ لے چلنے پر آمادہ نہ ہوں تو میرا قلم ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ان کی زندگی کے اس پہلو کی وضاحت ہو سکتی ہے جو کرنا مقصود ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ میری ”میں“ کو نہ صرف برداشت کر لیا جائے بلکہ اس کا خیر مقدم کیا جائے۔ میری ”میں“ اور مولانا کے واقعات و لطائف کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہی ان کی زندگی کے اس گوشے کی نقاب کشائی کا اصل اور واحد ذریعہ ہے۔ اس کو درمیان سے نکال کر ”حقائق“ کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔

یہاں یہ واضح کر دوں کہ ”میں“ سے عربی کی ”انا“ یا انگریزی کی ”ایگو“ مراد نہیں، جس کا مطلب اپنے متعلق آکڑ پھاڑ یا تعلیٰ کا اظہار ہے، بلکہ اس سے فارسی کی ”من“ مراد ہے جو بے چاری بڑی ہی معصوم ہے۔

آئیے اب میری ”میں“ کی وساطت سے مولانا محمد حنیف ندوی کے واقعات و

لطائف کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔

## پہلی ملاقات اور قصہ چائے پینے کا

۱۹۳۹ کی سردیوں کا موسم تھا کہ میں اپنے استاد محترم مولانا عطار اللہ حنیف کے ساتھ لاہور آیا۔ مغرب کی نماز ہم نے ایک مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد کچھ سفید اور کچھ کالی چھوٹی چھوٹی داڑھی والے ایک گورے چٹے خوب رو شخص جو شیروانی اور تنگ موری کا پاجامہ پہنے اور سر پر ٹوپی لیے ہوئے تھے، پہلی صف سے اٹھے اور مہلتے پر جا بیٹھے۔ ان کے سامنے اور دائیں بائیں چالیس پینتالیس آدمی، جن میں داڑھی والے کم اور منڈھی داڑھی والے زیادہ تھے، لکڑی کی لمبی لمبی تختیوں پر قرآن مجید کھول کر بیٹھ گئے۔ اس شخص نے قرآن مجید کھولا اور چند آیات کی تلاوت کر کے ان کا ترجمہ کیا اور پھر ان آیات کی تفسیر بیان کرنا شروع کی۔ میں اور مولانا عطار اللہ حنیف مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے سنتے رہے۔ یہ سلسلہ تقریباً پون گھنٹے تک جاری رہا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی گئی۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس خوش پوش اور خوب رو شخص نے کیا کہا اور کن مسائل کو ہدف بحث ٹھہرایا۔

دعا کے بعد مولانا عطار اللہ صاحب نے بتایا کہ یہ مسجد مبارک ہے اور اسلامیہ کالج کے میدان کے ساتھ واقع ہے اور یہ مولانا محمد حنیف ندوی ہیں جو اس مسجد میں جمعہ پڑھاتے ہیں اور ہر روز نماز مغرب کے بعد یہاں ان کا درس قرآن ہوتا ہے۔ ان کے سامعین زیادہ تر اسلامیہ کالج کے استاد اور طالب علم ہیں۔ یہ حضرات ان کے خطبہ جمعہ میں بھی آتے ہیں اور درس قرآن میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا عطار اللہ صاحب، جنہیں مولانا محمد حنیف ندوی پہلے سے جانتے تھے، اپنی جگہ سے اٹھے اور مولانا سے ملنے کے لیے ان کے پاس گئے۔ مولانا نے ان کو دیکھا تو کھڑے ہو کر نہایت تپاک سے ملے۔ میں بھی آگے بڑھا اور گردن جھکا کر مصافحہ کیا۔

ان دنوں نے ایک دوسرے سے خیر خیریت پوچھی اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔  
پھر مولانا عطار اللہ صاحب نے جانے کے لیے اجازت چاہی تو مولانا ندوی نے کہا ”اتنی جلدی؟  
چلیے آپ کو چائے پلائیں۔“

مولانا نے دائیں ہاتھ میں چھڑی پکڑی اور ہم تینوں مسجد سے باہر نکلے۔ یہ دونوں  
آگے آگے اور میں مقتدی پیچھے پیچھے۔ ریلوے روڈ کی طرف اسلامیہ کالج کے  
بڑے دروازے سے باہر نکل کر ٹرک پارک کے ذرہ آگے بڑھے تو ایک عمارت پر بہت بڑا  
بورڈ آویزاں تھا، جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا ”عرب ہوٹل“!

ہم مولانا کے ساتھ ہوٹل کے اندر جا کر ایک کونے میں میز کے ارد گرد پڑی ہوئی کرسیوں  
پر بیٹھ گئے۔ بہرہ آیا اور مولانا نے اُسے تین چائے لانے کو کہا۔ وہ ایک ٹرے میں چینی  
کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی تھالیوں میں رکھ کر لایا۔ پیالیوں کے  
ایک طرف چینی کی کُنڈیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے نہ کبھی چائے دیکھی  
تھی، نہ پی تھی اور نہ یہ معلوم تھا کہ چائے پینے کے کیا ادب آداب ہیں؟ میں سمجھا یہ کوئی  
دوایا بوٹی ہوگی جس کا نام چائے ہے اور لاہور کے لوگ اسے عرب ہوٹل کی ”دکان“ میں آکر  
پیتے ہوں گے، اسی لیے تو چھوٹی چھوٹی پیالیاں میں لائی گئی ہے، ورنہ کھانے پینے کی چیزیں  
تو کانسٹی یا پیتل کے بڑے بڑے برتنوں میں لائی جاتی ہیں تاکہ اچھی طرح پیٹ بھر جائے۔  
میں دیکھتا رہا کہ مولانا ندوی اور مولانا عطار اللہ صاحب کس طرح یہ فریضہ انجام دینا  
شروع کرتے ہیں۔ جس طرح ان کو دیکھا، اسی طرح میں نے پیالی کی کُنڈی میں انگشت  
شہادت ڈالی اور اُسے اٹھا کر مُنہ کو لگایا اور پھر گرم گرم چائے کا پانی کی طرح جو پورا گھونٹ  
بھرا تو وہ حلق کو چیرتی ہوئی معدے میں جاگری اور ایک ہی لمحے میں چودہ طبق روشن ہو گئے۔  
آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، زبان پر یکایک چھالے اُبھر آئے اور ایسا لگا جیسے پیٹ  
میں آگ ڈال دی گئی ہے۔ اندر کا سارا نظام آنا فانا درہم برہم ہو گیا۔ یوں سمجھیے کہ:

برپا ضمیر نہ ہدی میں کھرام ہو گیا

ایمان دلوں میں لہزہ بر اندام ہو گیا

مولانا محمد حنیف ندوی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ صحیح لفظوں میں کہنا چاہیے کہ یہ پہلا دیدار تھا جو میں نے مولانا کا کیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ انہی کے ساتھ چائے پینے کا شرف حاصل ہوا۔ یالیوں کہیے کہ میری چائے نوشی کا افتتاح مولانا کے ہاتھوں ہوا اور انہی کی نیک کمائی سے ہوا۔ اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی۔

عرب ہوٹل کسی زمانے میں لاہور کے ایسوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کا مرکز تھا اور اس کے ساتھ علم و ادب اور لطائف و ظرائف کی ایک تاریخ و البستہ تھی۔ اب کئی سال ہوئے عرب ہوٹل بھی ختم ہو گیا ہے، اس کے مالک بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور اس میں بیٹھنے والے بھی اکثر لوگ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ ع۔

آں قدرج بشکست و آں ساقی نماند

### دوسری ملاقات

اس سے کم و بیش ایک سال بعد ۱۹۴۰ء میں فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداس پور، مشرقی پنجاب) میں وہاں کی انجمن اہل حدیث کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم نے کی تھی جو مشہور ماہر قانون میاں محمود علی قصوری کے والد بزرگوار تھے اور متحدہ ہندوستان کے ممتاز علمائے دین اور زعمائے سیاست میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مذاہب کانفرنسوں کے انعقاد کا بہت رواج تھا اور ایک ہی سٹیج پر ”میرا مذہب مجھے کیوں پیارا ہے؟“ کے موضوع پر مختلف مذاہب کے اہل علم باری باری اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ ہر مذہب کا ایک ہی مقرر ہوتا تھا اور تقریر کے لیے وقت متعین کر دیا جاتا تھا۔

فتح گڑھ چوڑیاں کے جلسے کے اشتہار میں لکھا تھا کہ اس موقع پر مذاہب کانفرنس بھی ہوگی، جس کی صدارت مولانا ثناء اللہ امرتسری فرمائیں گے اور مسلمانوں کی طرف سے تقریر مولانا محمد حنیف ندوی کریں گے۔

میں ان دنوں فیروز پور میں علوم عربیہ کا طالب علم تھا۔ میرے ایک استاد مولانا محمد شفیع صاحب ہوشیار پوری تھے، وہ اس جلسے میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی

تیار کر لیا۔

مولانا محمد شفیع صاحب نے ہر مجلس کا نیا نیا سائیکل خریدا تھا اور اس زمانے میں سائیکل کو امیرانہ سواری سمجھا جاتا تھا۔ مولانا نے مجھے سائیکل کے پیچھے بٹھایا اور خود چلانے لگے فیروز پور سے چل کر ہماری پہلی منزل امرتسر تھی۔ رات وہاں مدرسہ غزنویہ میں بسر کی اور دوسرے دن دس بجے کے قریب فتح گڑھ چوڑیاں پہنچے۔

جلسہ تین دن جاری رہا۔ آخری دن نمازِ عصر کے بعد مولانا شانار اللہ امرتسری مرحوم کے زیرِ صدارت مذاہب کا نفرنس منعقد ہوئی۔ مجھے یاد ہے مسلمان، ہندو اور سکھ کثیر تعداد میں جلسے میں موجود تھے۔ ہندوؤں کی طرف سے جس مقرر نے تقریر کی وہ گیر وے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے مقرر مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا نے تقریر میں کیا کہا، یہ البتہ یاد ہے کہ سب مذاہب کے لوگوں نے مولانا کی تقریر نہایت توجہ اور غور سے سنی اور اس کی تحسین کی۔ صدرِ جلسہ مولانا شانار اللہ امرتسری مرحوم نے اپنی صدارتی تقریر میں ہر مذہب کے مقرر کے افکار و ارشادات کا تجزیہ کیا اور اس موضوع پر مولانا ندوی کی تقریر کو بہترین تقریر قرار دیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میں مولانا کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوا۔

تیسری ملاقات اور واقعہ میرے امتحان کا۔

۱۹۲۲ء میں، میں گوجرانوالہ میں مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم کے دارالعلوم کا طالب علم تھا اور درسِ نظامیہ کی انتہائی کتاب میں پڑھتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ طلباء کے سالانہ امتحان کے لیے لاہور سے مولانا محمد حنیف ندوی کو یہاں بلایا جاتا ہے۔ یہ بھی پتا چلا کہ وہ اصلاً گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کے پرانے شاگرد ہیں۔ یہ بات بھی علم میں آئی کہ وہ قدیم و جدید عربی ادبیات کے ماہر ہیں، تفسیرِ قرآن ان کا خاص موضوع ہے اور کتبِ تفسیر و حدیث اور فقہ کے زبانی امتحان میں ایسے سوالات بھی پوچھتے ہیں جن کا تعلق نئے دور کے مسائل سے ہے۔

میں لکھائی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنے کا بھی شوقین تھا۔ سوچا، دیکھا

جائے گا، ڈرنے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

امتحان کے دن آئے تو مولانا تشریف آئے۔ لباس اور وضع قطع میں عام حضراتِ علمائے مختلف۔ سفید کھدر کا تنگ موری کا پاجامہ، کھدر کا کرتہ اور شیروانی زیب تن، سر پر ٹوپی، خشک نشی داڑھی جس کے سفید اور کالے بال برابر برابر ہوں گے یعنی فنی فنی۔ سرخ و سفید رنگ، چہرے پر وقار اور نمکنت، ہاتھ میں چھڑی۔

صحیح بخاری کا زبانی امتحان شروع ہوا۔ ہر طالب علم کو الگ الگ بلا یا گیا۔ میری باری آئی تو تین چار سوال پوچھے، جن کے میں نے جواب دیے۔

اس دور میں علمائے دین میں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ لاوڈ سپیکر یعنی آلہ مکبر الصوت کا استعمال شرعی معاملات میں جائز ہے یا نہیں؟ اور امام اس کے ذریعے خطبہ جمعہ دے سکتا اور نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ نیز ریڈیو اور ٹیلی فون کی وساطت سے رویتِ ہلال کی اطلاع کو صحیح تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے؟

علماء کا ایک گروہ اسے صحیح مانتا اور اس کے دلائل دیتا تھا۔ دوسرا اسے غلط قرار دیتا تھا۔ مولانا نے مجھ سے یہی سوال پوچھا اور فرمایا وضاحت سے بتائیے کہ سائنس کی نئی ایجادات سے شرعی معاملات میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے یا نہیں اٹھایا جاسکتا؟ یہ سوال انھوں نے صحیح بخاری کی حدیث صومو الرؤیتہ و افطہم و الرؤیتہ (یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ رکھنا بند کرو) کے سلسلے میں پوچھا۔

ایک تو میں اس کا پہلے سے حامی تھا، دوسرے سوال کے تیور سے سمجھ گیا تھا کہ ممتحن کا نقطہ نظر کیا ہے۔ عرض کیا علوم و فنون میں ارتقا اور نئی سے نئی ایجادات و اختراعات کا عمل حالات و مقامات کے مطابق ہمیشہ جاری رہتا ہے اور جاری رہے گا۔ اسلام دائمی مذہب ہے اور معاشرہ تغیر پذیر ہے۔ ان پیش آنند مسائل میں جو کتاب و سنت سے متصادم نہیں یا جن کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہیں، معاشرے کا اسلام کے ساتھ اور اسلام کا معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ میں نے یہ بات اپنے فہم کے مطابق تفصیل سے بتائی اور ساتھ ہی کہا کہ اصول فقہ کا مسئلہ

ہے کہ بتغیر الاحکام بتغیر الاحوال۔ یعنی عبادات کو چھوڑ کر باقی احکام جو انسانی زندگی میں ہر روز پیش آتے ہیں، احوال و مقامات کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔

آخر میں عرض کیا کہ خطبہ جمعہ اور نماز کے لیے لاؤڈ سپیکر کا استعمال بھی جائز ہے اور ریڈیو اور ٹیلی فون کے ذریعے رویتِ ہلال کی اطلاع کو بھی شرعاً تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے جائز و عدمِ جواز کے متعلق اگر آج مولانا مجھ سے امتحان بھی سوال پوچھیں تو میں اصولِ فقہ کے اسی اصول کی روشنی میں کہ تغیرِ احوال سے تغیرِ احکام ہو جاتا ہے، دوسری قسم کا جواب دوں گا اور لاؤڈ سپیکر کے مسرفانہ استعمال پر پابندی لگانے کو دلائل سے ضروری قرار دوں گا۔

امام بخاری بہت بڑے فقیہ تھے اور ان کی فقہانیت کے جوہر ان کے قائم کردہ تراجمِ ابواب سے کھلتے ہیں۔ مولانا نے اس ضمن میں بھی ایک دو سوال پوچھے۔

بدایہ کے زبانی امتحان میں مولانا نے پوچھا کہ فقہانے امام کے لیے کیا شرائط بیان کی ہیں؟ میں نے بتایا علم، عمر، نیکی، تقویٰ وغیرہ۔ ساتھ ہی تھوڑا سا مسکراتے ہوئے بصورتِ استفسار عرض کیا۔ حضرت! فقہائے کرام امامت کے بارے میں عمر کی قید لگاتے ہیں؟ لیکن کیا یہ قرینِ صحت نہیں کہ کم سن امام کی اقتدا میں نماز کا زیادہ ثواب ملنا چاہیے؟ کیوں کہ کم سن امام کے گناہ کم ہوتے ہیں، جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے، گناہوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ فرمایا آپ کے اس ”فقہی نکتے“ پر مجھے تو ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں، فقہا سے پوچھ لیجیے یا خود فقیہ بن کر یہ فتویٰ جاری کر دیجیے۔

بہر حال مولانا نے نتیجہ سنایا تو مجموعی طور پر مجھے سب سے زیادہ نمبر ملے اور میں اوّل درجے پر رہا۔

بہ اعتبار ترتیب کے مولانا سے یہ میری تیسری ملاقات تھی۔ پہلے دو مرتبہ ان کی زیارت سے بھی مشرف ہوا تھا اور تقریر سننے کی سعادت بھی حاصل ہوئی تھی۔ اب تیسری مرتبہ ہم کلاں سے بھی بہرہ مند ہوا۔ بصورتِ سوال و جواب یہ ہماری پہلی باہم باتِ چیت تھی جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مجموعی لحاظ سے تقریباً تین گھنٹے جاری رہی۔

جو تھی ملاقات اور تشریف لے جانا میرے وطن میں

میرا سابق وطن کوٹ کپورہ ہے جو مشرقی پنجاب کی ریاست فرید کوٹ (اور اب ضلع فرید کوٹ) کا اُس نواح میں مشہور شہر ہے۔ اس شہر میں مسلمان خاصی بڑی تعداد میں آباد تھے اور بانیس مسجدیں تھیں۔

کوٹ کپورہ کے انجمن اصلاح المسلمین کے زیرِ اہتمام ہر سال تبلیغی جلسہ ہوتا تھا، جس میں برصغیر کے نامور علمائے کرام کو دعوتِ شرکت دی جاتی تھی۔ ان علمائے کرام میں مولانا سید سلیمان ندوی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا شام الدین امجدی، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا عبدالقادر قصبوری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محی الدین احمد قصبوری، مولانا محمد علی ایم اے کینٹشب قصبوری، مولانا عبداللہ قصبوری، مولانا اسماعیل غزنوی، مولانا حافظ محمد زکریا غزنوی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا محمد حیات گڑھی دہلوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ، مولانا عبدالحمید سوہدروی اور جماعتِ مجاہدین کے رکن صوفی ولی محمد فتوحی والا کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب حضرات سفرِ آخرت اختیار کر چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اس بزمِ اہل علم میں جو حضرات زندہ ہیں، ان میں مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا عطار اللہ حنیف، مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی شامل ہیں۔ مولانا عطار اللہ حنیف تو تین چار سال (۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک) وہاں خطابت و تدلیس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو تادیر سلامت رکھے اور لوگ ان کے علم و فضل سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

انجمن اصلاح المسلمین کا آخری جلسہ جو چھبیسواں سالانہ جلسہ تھا، مارچ ۱۹۴۷ء میں

الحمد افسوس ہے حضرت حافظ صاحبؒ ۲۴ جون ۱۹۸۵ (۱۴۰۶-۱۳ رمضان ۱۴۰۵ء) کو گوجرانوالہ میں وفات پا گئے۔

ان اللہ وانا الیہ راجعون۔



منعقد ہوا۔ اس وقت میری عمر بائیس تیس برس کی تھی اور میں اس انجمن کا سیکرٹری تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی اس جلسے میں مدعو تھے اور میں نے سیکرٹری کی حیثیت سے ان کو جلسے میں دعوتِ شرکت دی تھی، اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو خط لکھا۔ ان کی تقریر کا موضوع تھا، ”اسلام اور دیگر مذاہب“

مولانا شام کو چھ بجے کی گاڑی سے لاہور سے کوٹ کپورے پہنچے، میں اپنے رفقا کے ساتھ استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ جلسے کے آخری دن اتوار کو دس بجے ان کی تقریر ہوئی۔ مسلمان، ہندو اور سکھ اچھی خاصی تعداد میں جلسے میں شریک تھے۔ مولانا کی تقریر اس قدر جامع، مدلل اور زوردار تھی کہ سب مذاہب کے لوگ اس سے یکساں متاثر ہوئے۔ مولانا نے ہندو، عیسائی اور سکھ مذاہب کا اسلام سے مقابلہ کیا اور جو باتیں ان میں مشترک ہیں، ان کی وضاحت کی اور پھر اسلام کو جن امور میں دیگر مذاہب پر فوقیت حاصل ہے، انہیں تفصیل سے بیان کیا۔ کسی مذہب کی تنقید نہیں کی اور کسی مذہب کے مابینے والوں کو نشانہ ر تنقید نہیں بنایا۔

تقریر میں ہندوستان کے موجودہ صدر گیارنی ذیل سنگھ بھی موجود تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو گیارنی جی نے مجھ سے کہا، ”اسحاق جی! یہ مولانا صاحب کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ یہ بہت بڑے عالم ہیں اور انھوں نے بہت اچھی تقریر کی ہے۔ میں انھیں سلام کرنا چاہتا ہوں؟“ میں ان کو مولانا کے پاس لے گیا، انھوں نے مولانا کو سلام کیا اور ان کی تقریر کی تعریف کی۔

گیارنی ذیل سنگھ خود بھی اچھے مقرر تھے اور میرے دوست تھے۔ اب بھی ہندوستان کے صدر ہونے کے باوجود میرے دوست ہیں اور ہماری باہم خط و کتابت بھی ہے۔ میرے شہر سے دو میل کے فاصلے پر ان کا گاؤں تھا، جس کا نام ”سندھواں“ ہے۔

مولانا سے یہ میری چوتھی ملاقات تھی۔

آجانا میرا لاہور میں اور ملنا مولانا سے

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں ہم ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) کی

تحصیل جڑانوالہ کے ایک گاؤں چک ۵۳ گ ب منصور پور میں آباد ہوئے جو جڑانوالہ سے تین میل کے فاصلے پر فیصل آباد روڈ پر واقع ہے۔

۲۲۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو لاہور میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان قائم ہوئی۔ اس کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم تھے جو اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ عربی کے صدر تھے اور اب اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) کے سینئر ایڈیٹر ہیں۔ مجھے جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر مقرر کیا گیا اور میں اس خدمت کی انجام دہی کے لیے ۸۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو لاہور آ گیا۔ جمعیت کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا۔ اس کی مجلسِ عالمہ اس دور کے ممتاز اہل علم پر مشتمل تھی۔ اس کے ایک رکن مولانا محمد حنیف ندوی تھے جو ان دنوں مسجد مبارک میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے اور نمازِ مغرب کے بعد روزانہ درسِ قرآن دیتے تھے۔

میری یہاں آمد کے دو ماہ بعد (فروری ۱۹۴۹ء میں) مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلسِ عالمہ کا جو پہلا اجلاس ہوا، میں نے ناظم دفتر کی حیثیت سے، صدر جمعیت مولانا سید داؤد غزنوی اور ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم کی ہدایت کے مطابق ارکانِ عالمہ کو اس میں شرکت کے لیے دعوت نامے بھیجے۔ مقررہ وقت پر سب سے پہلے مولانا محمد حنیف ندوی تشریف لائے۔ میں نے اُنھیں کمرِ سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ پھر عرض کیا:

”کیا نوش فرمائیں گے؟“

بولے ”چائے“!

مجھے فوراً عرب ہوٹل کی وہ چائے یاد آگئی جو دس سال پہلے انھوں نے پلائی تھی اور جس کے پہلے ہی گھونٹ سے میرے باطن کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔

مولانا داؤد غزنوی علمی اور جماعتی معاملات میں مولانا حنیف ندوی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ان کے مشوروں کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے کہ یہ ہر معاملے میں صاف اور واضح بات کرتے اور ہمیشہ صائب مشورہ دیتے تھے۔ مولانا ندوی اکثر مولانا غزنوی کے ہاں تشریف لے جاتے تھے اور ان بزرگوں کی باہمی گفتگو میں بسا اوقات مجھے بھی شامل

ہونے کا موقع ملتا تھا۔ بعض دفعہ لطائف و ظرائف کا دور بھی چل پڑتا۔ لیکن میں چپ چاپ بیٹھا سنتا رہتا، کسی بات میں دخل نہ دیتا۔ مجھے مولانا ندوی کی باتوں سے پتا چل گیا تھا کہ یہ بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج عالم اور صاحبِ لطائف و ظرائف ہیں اور اس فنِ لطیف کی نزاکتوں کے تمام پہلوؤں سے باخبر ہیں۔

لطیفہ بیان کرنا، کسی سے سننا اور آگے سنانا اور اس کے لیے موقع و محل کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ایک خاص انداز کے ساتھ ان الفاظ کو زبان سے ادا کرنا، سب فنونِ لطیفہ میں شامل ہے اور مولانا ندوی اس سے خوب آگاہ ہیں۔ ”یہ علم وہی ہے جو اللہ کی ایک دین ہے۔ مولانا اپنی اُس وقت میں چلوڑے عربستان کا چکر کاٹتی ہوئی ان کے پاس پہنچی ہے، اسے غالباً ”موصیتِ الہیہ“ سے تعبیر فرمائیں گے۔

### چھوٹا ہونا خطیب کی داڑھی کا

مولانا اس نعلیے میں مسجدِ مبارک میں خطبہ جمعہ دیتے تھے، میں بھی وہیں جاتا اور پہلی صف میں بیٹھتا تھا۔ مولانا کا خطبہ نہایت توجہ بلکہ کننا چاہیے کہ انتہائی ”خشوع و خضوع“ کے ساتھ سننا تھا، اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب ہمک مولانا کی باتیں ذہن و دماغ کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے نہ سنی جائیں، کچھ پلے نہیں پڑتا۔ اس لیے یہ ایک مجبوری ہے کہ انسان ذہنی اعتبار سے تمام اطراف سے گھٹ کر مولانا کی طرف متوجہ ہو۔ یعنی اس حنیف کے ساتھ خود بھی حنیف ہو جائے۔ مولانا کے بالکل سامنے منبر کے قریب علامہ حسین میر کا شیریں مرحوم بیٹھتے تھے۔ علامہ مرحوم کی داڑھی لمبی اور گھنی تھی اور وہ جسمانی لحاظ سے فرہ تھے۔ خطبے کے دوران وہ اپنی موٹی موٹی قدرے سرخ آنکھیں مولانا کے چہرے پر گاڑے رکھتے اور کامل انہماک سے خطبہ سنتے۔ مولانا کی داڑھی چھوٹی تھی اور یہی انداز تھا جواب ہے۔ داڑھی منڈھے تو اس کو واقعی داڑھی سمجھتے ہیں، لیکن بعض علمائے کرام کے نزدیک یہ داڑھی کسی شمار قطار میں نہیں آتی۔ ایسی داڑھی کے بابے میں وہ صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ یہ بھی کوئی داڑھیوں میں داڑھی ہے۔

مولانا ایک دن خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے کہ صحنِ مسجد سے ایک عالم دین اٹھے

اور خطیب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”خطیب صاحب آپ کی دارِ اُصی چھوٹی ہے۔“

علامہ حسین میر نے یہ الفاظ سنے تو وہ دایاں ہاتھ زمین پر اُتار دیا اور بائیں ہاتھ گھٹنے پر رکھ کر اپنے بوجھل جسم کے ساتھ اُٹھے اور مولانا کے برابر کھڑے ہو کر جلد آواز میں دارِ اُصی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بلوائے:

”حضرت! خطبہ ان کا سنیے، دارِ اُصی میری دیکھیے۔“

ظاہر ہے علامہ صاحب کے ان الفاظ سے ان عالمِ دین کا غصہ اور بیڑھ گیا تھا جسے کی نماز ختم ہوئی تو وہ عالم مولانا کے پاس آئے اور فرمایا:

”میں آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

مولانا اس سے پچنا چاہتے تھے۔ کہا:

”اب میں جلدی میں ہوں اور جانا چاہتا ہوں، آپ پھر کسی وقت تشریف لائیے۔“

انھوں نے بات کرتے پر اصرار کیا، مولانا نے معذرت چاہی، لیکن وہ نہ ملنے اور کہا:

”مسلمان، مسلمان کا آئینہ ہوتا ہے؟“

مولانا نے جواب دیا: ”آئینہ ہوتا ہے، سویش نہیں ہوتا۔“

پہلا مشورہ جو لیا مولانا نے مجھ سے

اب میرے اور مولانا کے درمیان خاصے مراسم پیدا ہو گئے تھے اور میل جول کافی بڑھ گیا تھا۔ بعض جماعتی امور میں بھی مولانا مجھ سے مشورہ لیتے تھے۔ ۲۹، ۲۸، ۲۷ مئی ۱۹۴۹ کو لاہور میں جمعیت اہل حدیث کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کانفرنس کی صدارت کے لیے مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مرحوم کا اسم گرامی سامنے آیا اور مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا محمد حنیف ندوی کو بنایا گیا۔ مولانا خطبہ استقبالیہ لکھنا چاہتے تھے۔ علیحدگی میں مجھ سے فرمایا:

”آپ ہماری جماعت کے مزاج کو جانتے ہیں، مجھے مشورہ دیجیے، خطبہ استقبالیہ میں کیا باتیں لکھی جائیں اور موجودہ دور کے کن کن مسائل کی طرف کس پر ایہ بیان میں اُن کو

توجہ دلائی جائے۔“

میں لفظ ”مشورہ“ سے خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ نہایت نیازمندی سے عرض کیا: ”مولانا! میں اس سلسلے میں آپ سے کیا عرض کر سکتا ہوں، آپ مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جماعت کے مزاج کو جانتے ہیں۔“

یہ مولانا کی مہربانی اور شفقت تھی کہ تعلقات کے ابتدائی دور ہی میں انھوں نے مجھے مشورے کے قابل گردانا۔ ان کے اس فرمان سے میں بہت متاثر ہوا اور میرے دل میں ان کا احترام پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔

### بیمار ہو جانا میرا

یہاں یہ واقعہ بھی لائق تذکرہ ہے کہ کانفرنس کے فوراً بعد مجھے ٹائی فائیڈ ہو گیا اور میں سخت بیمار پڑ گیا۔ مولانا کو پتا چلا تو تشریف لائے، میرا حال پوچھا اور کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں مولانا داؤد غزنوی سے میری حقیر کوششوں کو سراہا اور مجلسِ عالمہ سے منظور کرایا کہ میرا علاج اچھے ڈاکٹر سے کرایا جائے اور علاج کا خرچِ جمعیتہ ادا کرے۔ کیوں کہ بیماری کی وجہ کانفرنس کے سلسلے میں ان کی بھاگ دوڑ اور بے حد محنت ہے۔ میں مہینہ بھر چارپائی پر پڑا رہا اور مولانا کی تجویز کے مطابق علاج کا خرچِ مرکزی جمعیتہ نے برداشت کیا۔

چلے جانا مولانا کالاہور سے گوجرانوالے

اس سے کچھ عرصے بعد مولانا لاہور کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی شہر گوجرانوالہ چلے گئے۔ ”مالِ عرب پیشِ عرب“ کے محاورے کے مطابق اہل و عیال بھی ساتھ تھے۔ مولانا اپنا جدی مکان بہت پہلے اپنی غربت کی نذر کر چکے تھے۔ وہاں جا کر کُسرِ سال کے ہاں ٹھہرے۔ ان کے کُسر، ان کے کاموں تھے۔ ایک دن انھوں نے پوچھا:

”یہاں آپ کی رہائش کا کیا انتظام ہوگا۔؟“

فرمایا: ”یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔“

پوچھا: ”کیسے؟“

جواب دیا: ”میری بیوی اپنے میکے میں رہیں گی، بچے اپنے ننھیال میں رہیں گے

اور میرا قیام اپنے ماموں کے گھر ہو گا۔“

جاری ہونا اخبار ”الاعتصام“ کا اور ایڈیٹر بننا مولانا کا۔

اگست ۱۹۲۹ء میں گوجرانوالہ سے ہفت روزہ ”الاعتصام“ جاری ہوا۔ مولانا کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ یہ اخبار چھپتا لاہور میں تھا اور خوالہ ڈاک گوجرانوالہ سے کیا جاتا تھا۔ مولانا اس کی طباعت کے لیے ہر منگل کو لاہور آتے تھے اور بدھ کو اخبار بورلوں میں ڈال کر گوجرانوالہ لے جاتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ لاہور آتے ہی بس سے اتر کر سیدھے میرے پاس شیش محل روڈ آتے، یہاں آکر چائے پیتے، باتیں کرتے اور پھر ہم دونوں پریس جا کر اخبار چھپنے کے لیے دے دیتے۔ ابتدا میں اخبار اردو بازار کے باہر حجازی پریس میں چھپتا تھا، اس کے بعد ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس میں چھپوانا شروع کر دیا گیا تھا۔ یہ پریس حافظ عبدالقادر روپڑی کے بڑے بھائی مولوی محمد احمد کا تھا اور موہن لال روڈ پر تھا۔ موہن لال روڈ کا نام بعد کو اردو بازار رکھا گیا اور اب یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

جانا میرا گوجرانوالہ میں

”الاعتصام“ کے اجراء کے بعد میں بھی اس میں لکھنے لگا تھا، لیکن میرا قیام لاہور ہی میں تھا۔ تھوڑے عرصے بعد مولانا داد غزنوی سے کہہ کر مولانا ندوی نے مجھے بھی گوجرانوالہ بلا لیا۔ میں اخبار میں مولانا کا چہرہ اسی بھی تھا، خاکروب بھی تھا، کلرک بھی تھا، منبر بھی تھا اور معاون ایڈیٹر بھی۔ چوبیس پچیس برس کی عمر تھی، جوانی کا زمانہ تھا، نہ دن کا پتا تھا نہ رات کا، ہر وقت کام میں مجتار رہتا۔ میری یہ کوشش ہوتی کہ مولانا کو کوئی تکلیف نہ ہو، تمام کام خود ہی کر لوں۔

”کنا مجھ کو“ ”آپ“ یا ”تسیں“

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا سے تعلقات کے آغاز ہی میں بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ میرے استاد بھی ہیں، رہنما بھی ہیں، بزرگ بھی ہیں، بہی خواہ بھی ہیں، گھر سے دوست بھی ہیں۔ ان کی ذاتی یا گھر کی کوئی بات ایسی نہیں جس کا مجھے علم نہ ہو۔ بچوں کی ملازمت اور کاروبار کے سلسلے میں بھی مجھ سے مشورہ لیتے ہیں، اور ان کی تنگی اور شادی بیاہ کے بارے میں بھی ازراہ کم

مجھ سے بات کرتے ہیں۔ کسی رشتے دار سے کوئی جھگڑا ہو جائے اس کا بھی مجھے علم ہے اور کسی علمی مسئلے میں کسی سے بحث و مباحثہ چل پڑے اس سے بھی میں آگاہ ہوں۔ یعنی اُن کی کوئی بات مجھ سے چھٹی یا پنجابی میں کھتا چلائیے کہ ”گجھی“ نہیں ہے۔ اگر کوئی بات کبھی مجھ سے چھپانا بھی چاہی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، چند روز بعد ہتھیار ڈال دیے اور ساری بات یہ کہہ کر بتا دی کہ کچھ عرصے سے یہ بات آپ سے چھپا رکھی تھی، اب کر رہا ہوں۔ یعنی گھر کی یا باہر کی کوئی اہم بات ہضم نہیں کر سکے، جلد یا بدیر اگل ہی دی۔ لیکن اس بے پناہ تعلق اور بے تکلفی کے باوجود مجھے کبھی ”تو“، ”یا“ تم“ کہہ کر خطاب نہیں کیا۔ اردو میں بات کی تو ہمیشہ ”آپ“ کہا اور پنجابی میں کچھ ارشاد فرمایا تو ”تسیں“ کہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے گزشتہ سطور میں بھی اپنے لیے مولانا کے یہی الفاظ ”آپ کریں“ اور ”کیجیے“ وغیرہ استعمال کیے ہیں، آئندہ سطور میں بھی اس کا التزام کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ”تو“، ”یا“ تم“ وغیرہ کے جو الفاظ مولانا نے میرے لیے نہیں استعمال کیے، ان کی زبان پر لاؤں۔

”تمباکو دی ہٹی“

مولانا گوجرانوالہ میں ”الاعتصام“ کے ایڈیٹر تھے، میں بھی ان کے ساتھ بحیثیت خادم کے کام کرتا تھا، لیکن مولانا کے بعض طے والوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ مولانا کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ ایک دن ہم دونوں کہیں جا رہے تھے کہ ایک صاحب مولانا کو دیکھ کر دوڑتے ہوئے آئے، بڑے احترام سے مصافحہ کیا اور پوچھا:

”مولوی جی، خیر نال اج کل کتھے او؟“

فرمایا ”ہیں گوجرانوالہ میں۔“

”ایتھے کی کر دے او؟“

فرمایا: ”تمباکو دی ہٹی پانی اے، بڑا دھیا تمباکو دی پچراں۔“

انھوں نے دعا دی اور کہا: ”اچھا جی! اللہ برکت دے، بہار بڑی چنگی

شے اے۔“

## تنگ دستی اور غربت

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں آنے سے پہلے مولانا کا اور غربت کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ”الاعتصام“ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس زمانے میں ان کی سو روپے تنخواہ تھی۔ نوے روپے مجھے ملتے تھے۔ مولانا سو میں سے سولہ روپے مکان کا کرایہ دیتے تھے۔ اس مکان میں بجلی نہ تھی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے پہلی کتاب ”مسئلہ اجتہاد“ انھوں نے اسی مکان میں شدید گرمی کے موسم میں لالٹین کی روشنی میں لکھی تھی۔ یہ ان کی انتہائی تنگ دستی کا دور تھا۔ لیکن ان کی شگفتگی، بذلہ سخی اور لطیفہ بازی اس حالت میں بھی پورے جو بن پر تھی۔ قلم بھی خوب جولانیاں دکھاتا تھا اور فکر و اسلوب کی دنیا بھی نرالی تھی۔ پھر مہمان نواز بھی تھے۔ گوجرانوالہ لسی اور دودھ کا شہر تھا۔ چائے اس زمانے میں وہاں بہت مشکل سے ملتی تھی۔ چار بجے سہ پہر کی چائے ہم مولانا کے گھر باجماعت پیتے تھے۔ جو شخص ان سے ملاقات کے لیے آتا اس کو بھی حسبِ توفیق کھانے پینے کو پیش کیا جاتا۔

ایک دفعہ کسی دوست نے ان کو شان دار چُغہ تحفہ دیا۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم کسی علمی کام کے سلسلے میں ان کے گھر گئے تو مولانا وہ چُغہ پہنے ہوئے تھے۔ صدیقی صاحب کو چائے پیش کی۔ انھوں نے کہا۔ مولانا! معلوم ہوتا ہے آج کل آپ امیر ہو گئے ہیں، بہت عمدہ چُغہ پہن رکھا ہے۔ مولانا نے چُغہ اتارا اور مہنس کر کھٹی ہوئی قمیص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اس کو چھپانے کے لیے ایک دوست کی طرف سے تحفے میں دیا ہوا یہ چُغہ پہن لیا ہے۔“

یہ الفاظ سن کر اور قمیص کو دیکھ کر عبدالحمید صدیقی مرحوم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر صدیقی صاحب نے مجھ سے کہا: ”دیکھیے یہ کتنے بڑے عالم ہیں اور تنگ دستی کی گرفت میں ہیں۔ کبھی ہماری قوم اہل علم کی طرف بھی توجہ کرے گی؟“

مولانا کا ایک ہی جوڑا تھا جو ایک پا جامے اور ایک قمیص پر مشتمل تھا۔ اسی کو دوسرے تیسرے دن اُتار کر دھلا لیتے تھے۔

گوجرانوالہ میں ایک بزرگ سیٹھ نظام الدین مرحوم تھے جو بہت نیک اور مخیر آدمی



تھے اور بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ انھوں نے ایک دن دیکھا کہ مولانا کا پا جامہ پھٹا ہوا ہے۔ وہ اسی وقت اٹھ کر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد کورے لٹھے کا ایک تھان بخل میں دبائے ہوئے آئے۔ مولانا اس وقت گھر جا چکے تھے۔ سید صاحب مرحوم نے مجھے علیحدہ کر کے وہ تھان دیا اور آہستہ سے کہا: ”یہ تھان مولوی حنیف کے گھر سے آؤ، کسی کو بتانا نہیں کہ کس نے دیا ہے۔“

گوجرانوالہ میں ان دنوں ایک صاحب صوفی نذیر حسین مرحوم تھے جو کشمیری تھے اور اگست ۱۹۴۷ء میں امرتسر سے نقل مکانی کر کے گوجرانوالہ میں اقامت گزین ہو گئے تھے۔ مرحوم بہت خوش مزاج اور شگفتہ طبیعت آدمی تھے۔ مولانا سے ان کا دوستانہ تھا، مجھ سے بھی محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ہم دونوں عصر کے بعد بعض اوقات ان کے گھر جاتے تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ مولانا کے وہ خاص معارف تھے۔ جب ضرورت پڑتی مولانا ان کے نام رقعہ لکھ کر مجھے بھیج دیتے اور وہ مولانا کے حکم کی تعمیل کرنے میں ذرا دیر نہ لگاتے صوفی صاحب مرحوم نے ۲۷ فروری ۱۹۵۴ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک وفات پائی بڑھالینا داڑھی کا اور رکھ لینا پٹوں کا

اخبار ”الاعتصام“ کی ادارت کے تین چار مہینے بعد مولانا نے داڑھی بڑھالی تھی اور پہنے بھی رکھ لیے تھے۔ عجیب سی وضع قطع ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں یہ اخبار لاہور میں چھپتا تھا۔ میں اس کی طباعت کے لیے سوموار کو گوجرانوالہ سے لاہور آتا اور دو دن کے بعد بدھ کی شام کو واپس جاتا، جمعرات کو اخبار حوالہ ڈاک کیا جاتا تھا۔ ایک دن مولانا نے فرمایا اب کی ہم دونوں لاہور جائیں گے اور میں اپنے بعض دوستوں سے آپ کو ملاؤں گا۔

ہم بذریعہ بس گوجرانوالہ سے لاہور آ رہے تھے کہ کالا شاہ کاکہ کے قریب سیلاب آگیا اور آناٹا ناسرک پانی سے بھر گئی۔ لیکن ہم لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں ایک کمرہ میرے قیضے میں تھا اور میں اس سے پیشتر لاہور کے زمانہ قیام میں اسی کمرے میں رہتا تھا۔ ہم نے اس کمرے میں سامان رکھا اور چلے پئی کہ کشمیری بازار کو روانہ ہوئے۔ سنہری مسجد کے قریب پہنچے تو سامنے سے مشہور شاعر اور ادیب عبدالمجید بھٹی مرحوم آ رہے تھے۔ میں نے دور سے دیکھا کہ ان کی

نظریں مولانا کے چہرے پر گر گئی ہوئی ہیں اور ایسے معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ مولانا کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ مولانا کے قریب آکر رکے اور نہایت ادب سے مصافحہ کیا۔ مولانا کی وضع قطع پہلے سے بالکل مختلف تھی۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ دو تین منٹ خاموش کھڑے مولانا کی داڑھی اور سر کے بالوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ پھر مسکرائے اور اجازت لے کر چلے گئے۔ ان کی خاموشی میں بہت سی باتیں چھپی ہوئی تھیں۔

سیلاب کی وجہ سے لاہور اور گوجرانوالہ کے راستہ بند ہو گیا تھا اور یہیں چھ سات دن یہاں ٹھہرنا پڑا۔ دوسرے دن ہم ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کے ہاں گئے۔ وہ مولانا کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے اور میرے مہربان تھے۔ اس زمانے میں وہ سہ روزہ ”کوثر“ نکالتے تھے اور گوال منڈی میں ان کا دفتر تھا، سکونت بھی وہیں تھی۔ وہ مولانا کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا۔ ”آپ تو دیوندر سیتا تھی معلوم ہو رہے ہیں“ مولانا کی داڑھی اور پٹوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات انھوں نے اپنے اخبار ”کوثر“ کے فکاہی کالم ”سیر و سفر“ میں لکھ بھی دی۔

دیوندر سیتا تھی لاہور کے مشہور ادیب و شاعر اور افسانہ نگار تھے اور ان کی داڑھی اور سر کے بال بہت لمبے لمبے تھے۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز نے مولانا کی ان کے چہرے اور سر کے بالوں سے تشبیہ دی تھی، ورنہ ان کا باطن کچھ اور ہی قسم کا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ادیبوں کے حلقے میں دیوندر سیتا تھی فراڈ مشہور تھے۔ یوں سمجھئے کہ ”فراڈ“ کے لفظ نے ان کے تخلص کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جناب احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب اور دوسرے ادیب و شاعر حضرات جن کو دیوندر سیتا تھی سے تعلق رہا ہے، ان کی بہت سی باتیں بیان کرتے ہیں، پچھلے دنوں معلوم ہوا تھا کہ دیوندر سیتا تھی دہلی میں مقیم ہیں۔

ملک نصر اللہ خاں عزیز سے ملنے اور چائے پینے کے بعد ہم مولانا عبد المجید سالک مرحوم کے پاس پہنچے۔ اس وقت ان کا اخبار ”انقلاب“ بند ہو چکا تھا اور اس کا دفتر میکاٹو روڈ پر ہفت روزہ ”چٹان“ کی بلڈنگ میں تھا۔ وہ بھی بہت تنگ سے ملے۔ سالک صاحب مرحوم کی میز پر اتفاق سے اس وقت ”الاعتصام“ پڑا تھا۔ انھوں نے اخبار ہاتھ

میں پکڑ کر کہا: ”یہ تو ہوا الاعتصام“ اور پھر مولانا کی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بصورتِ سوال فرمایا: ”یہ جبل اللہ ہے؟“ — یہ الفاظ نہایت بر محل تھے اور جو لوگ وہاں بیٹھے تھے، وہ اس سے بہت محفوظ ہوئے۔

الاعتصام ان دنوں ویسٹ پنجاب پر ننگ پریس لاہور میں چھپتا تھا۔ اُس کے مالک مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی کے بڑے بھائی مولوی محمد احمد تھے۔ اس زمانے میں ان کی داڑھی بھی چھوٹی چھوٹی تھی۔ (زندگی کے آخری دور میں کافی بڑھالی تھی) انھوں نے مولانا کو اتنی لمبی داڑھی میں دیکھا تو فریادی کی سی شکل بنا کر اور وہی لب و لہجہ اختیار کر کے کہا: ”مولانا اب ہمارا کیا بنے گا، آپ ہمارا سہارا تھے۔ جو شخص ہماری چھوٹی داڑھی پر اعتراض کرتا، ہم آپ کو بطور سند پیش کر دیتے تھے۔ اب کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور ہمارا والی وارث کون ہوگا؟“

مولانا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

”ہم بہت دیر تک آپ کا سہارا بنے رہے۔ اب آپ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ جتنی مدد ممکن تھی، ہم نے کی۔ اب اللہ پر بھروسہ کریں، وہی آپ کا حامی و ناصر ہو۔“

مولوی محمد احمد بھی دلچسپ آدمی تھے۔ لمبے تڑنگے، سرخ و سفید رنگ اور خوش لباس، سواری کے لیے موٹر کار جسے وہ خود چلاتے تھے۔ ان کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنا نام ”محمد احمد خان“ لکھتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا: ”آپ ارائیں ہیں اور اپنے نام کے ساتھ لفظ ”خان“ لکھتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟“ بولے: ”کیا ارائیں کے لیے اپنے نام کے ساتھ لفظ ”خان“ لکھنا خلافتِ شرع ہے؟ یہ لگتی شریعت کا حکم ہے کہ ارائیں، خان نہ کہلائیں؟ میں ارائیں برادری میں یہ جرات پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ جس برادری یا جس قوم میں جو اچھا وصف پایا جاتا ہے یا جو اچھا لفظ وہ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں، اسے اپنائیں۔ لفظ ”خان“ مجھے پسند آیا اور میں نے اپنا لیا۔“ پھر ہنسنے لگے، ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ میں نے کہا: ”بالکل ٹھیک۔“

لیکن اب معاملہ ”خان“ سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ حافظ عبد القادر روپڑی کے صاحب زادوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہاشمی سید کہلاتے ہیں اور جو ان کو ارائیں کہے، اس پر خفا ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا نے داڑھی کیوں بڑھائی؟ یہ عجیب بات ہے کہ مولانا نے مسجد مبارک کے زمانہ مخاطبات میں تو داڑھی نہ بڑھائی حالانکہ خطیب کے لیے اکثر اوقات ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے، لیکن ”الاعتصام“ کے زمانہ ادارت میں داڑھی بڑھائی، جب کہ میرے خیال میں اس کے بغیر بھی گزارہ ہو سکتا تھا۔ اس

کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گوجرانوالہ مذہبی شہر ہے اور وہاں اہل حدیث بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں اور ان کی اکثریت ”اصحاب اللہ“ یعنی داڑھی والوں کی ہے۔ کسی عالم دین کی پھوٹی داڑھی وہاں کے ذہنی مزاج اور ماحول سے واقعی مطابقت نہیں رکھتی۔ پھر وہاں مولانا کے استاد محترم مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم قیام فرماتے اور وہ تدبیر و تقویٰ اور ضیق میں خالص سلفی تھے، ان سے مولانا کا ہر وقت کا رابطہ تھا، وہ مولانا سے کہتے تو کچھ نہ تھے لیکن خود مولانا کو اپنی اس ”کمزوری“ کا احساس تھا۔ علاوہ ازیں الاعتصام میں داڑھی کی مقدار پر مضامین بھی شائع ہونے لگے تھے اور خود مولانا اسماعیل مرحوم نے بھی اس موضوع پر ایک مضمون اشاعت کے لیے دیا تھا جو مولانا ندوی نے روک لیا تھا اور وہ اس وقت شائع کیا جب انھوں نے خود اپنی داڑھی مضمون سے ہم آہنگ کر لی۔ صحیح لفظوں میں کہنا چاہیے کہ یہ ”تغییر احکام، تغیر احوال“ کا نتیجہ تھا۔

مولانا ندوی کی داڑھی کی یہ کیفیت تھی کہ مولانا اسماعیل صاحب سے بھی بڑھ گئی تھی، داڑھی بھی بکھری ہوئی سی تھی اور بٹھیل کا بھی یہی معاملہ تھا۔ پھر داڑھی سفید اور سر کے بال سیاہ کالے۔ ان کی داڑھی اور سر کے بکھرے ہوتے بال دیکھ کر میں نے ایک دن بے لگتی سے کہا:

زلفیں بکھیر دے کہ زمانے کو علم ہو

ظلمتِ حسین تر ہے شبِ ماہتاب سے

مولانا نے شعر سن کر فرمایا، اب کیا زلفیں ہیں اور کیا ان کا بکھیرنا ہے۔ جو ہے سو

ٹھیک ہے۔

## ملاقات کرنا ہمارا سید سلیمان ندوی مرحوم سے

۱۹۵۱ میں مولانا محمد اسماعیل مرحوم حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم بھی یہ فریضہ انجام دینے کی غرض سے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ مولانا اسماعیل مرحوم کی ملاقات ارضِ حجاز میں سید صاحب سے ہوئی۔ سید صاحب اس زمانے میں اعظم گڑھ (ہندوستان) کی سکونت ترک کر کے کراچی تشریف لے آئے تھے اور ”الاعتصام“ ان کی خدمت میں پہنچتا تھا۔ حج سے واپسی پر مولانا اسماعیل مرحوم نے بتایا کہ سید صاحب الاعتصام کے مضامین کی تحسین فرماتے تھے اور پوچھتے تھے کہ ”حنیف صاحب مولوی ہوئے یا نہیں ہوئے؟“ اسی زمانے میں لاہور میں جامعہ اشرفیہ کا جلسہ ہوا، جس میں سید صاحب بھی مدعو تھے۔ مولانا حنیف ندوی نے سید صاحب سے ملاقات کے لیے لاہور آنے کا پروگرام بنایا تو مجھے بھی ساتھ لے آئے۔ جامعہ اشرفیہ ان دنوں نیلہ گنبد میں قائم تھا۔ ہم سید صاحب کی قیام گاہ پر گئے تو وہ مولانا سے بغل گیر ہو کر ملے۔ مولانا نے میرا تعارف بھی ان سے کر لیا۔ انھوں نے خیر خیریت پوچھی اور الاعتصام کی تعریف فرمائی۔ مولانا کی داڑھی کافی بڑھی ہوئی تھی، سید صاحب دیکھ کر خوش ہوئے اور فرمایا :

”آپ تو مآثر اللہ بالکل بدل گئے ہیں۔“

مولانا نے جواب دیا: ”جی ہاں، ظواہر کی حد تک“

فرمایا: ”ظاہر کی تبدیلی سے باطن بھی متاثر ہوتا ہے۔“

مولانا نے کہا: ”خدا کرے ایسا ہو۔“

میں سب باتیں بیٹھا سنتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ نہ سید صاحب کو مولانا سے کوئی تکلف تھا اور نہ مولانا کو سید صاحب سے۔! دونوں حضرات صاف صاف لفظوں میں بغیر کسی ذہنی تحفظ کے بات کرتے تھے۔ ندوی حضرت کی یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے برابر کی سطح پر ملتے اور گفتگو کرتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں تکلف سے کام نہیں لیتے۔ نہ کوئی کسی کو حضرت صاحب کہتا ہے اور نہ مولانا صاحب، نہ علامہ اور

فہامہ صاحب کہہ کر مخاطب ہوتا ہے۔ بس حنیف صاحب، رئیس صاحب، مسعود صاحب، شاہ صاحب، علی میاں صاحب کہہ کر بدلانے کے عادی ہیں۔ سید سلیمان ندوی صاحب کو بھی سب ندوی ”سید صاحب“ کہہ کر پکارتے تھے۔ مولانا حنیف ندوی بھی ان کو سید صاحب کہتے تھے اور بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔

سید صاحب دنیا نے اسلام کے بہت بڑے عالم اور محقق تھے۔ ان پر ایک دور آیا کہ وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے۔ اس سے دبستانِ ندوہ کے بعض حضرات کو اتفاق نہ تھا۔ وہ دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ ندوہ اور دارالمصنفین کی ایک خاص روایت ہے کہ اس کے ارکان علم و تحقیق کے میدان میں ہمیشہ غیر جانب دار رہے ہیں۔ بیعت و ارادت سے انسان ایک خاص حلقے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ مولانا حنیف ندوی کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔ چنانچہ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد مولانا نے سید صاحب سے اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ اس وقت ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مولانا نے سید صاحب سے کہا:

”آپ نے سیرۃ النبی کو بہشتی زیور کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔“

سید صاحب نیچے درمی پر گاؤں تک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے ان کو پہلی دفعہ دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ سر پر عمامہ اور پوری داڑھی۔ مولانا کا یہ بہت بڑا طنز انھوں نے نہایت فراخ دلی سے برداشت کیا۔ وہ ذرا ساناک میں بولتے تھے۔ جسم کو تھوڑی سی حرکت دی اور مسکراتے ہوئے فرمایا:

”آپ ہماری عمر کو پنچیں گے تو آپ بھی یہی کریں گے۔“

مولانا نے جواب دیا: ”میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ پر عمر کا اثر ہے۔“

سید صاحب یہ وار بھی سہہ گئے۔ ان کے چہرے پر اور مسکراہٹ پھیل گئی اور خاموشی اختیار فرمائی۔

اسی کمرے کی دیوار پر جس میں سید صاحب کا قیام تھا، جامعہ اشرفیہ کے اُس جلسے کا اشتہار لٹک رہا تھا۔ مولانا کی اس پر نگاہ پڑی تو دیکھا کہ ہر عالم کے نام کے ساتھ ”حضرت“

کالغظ مرقوم ہے، لیکن سید صاحب مرحوم کو ”مورخ اسلام سید سلیمان ندوی“ کھا گیا ہے۔ مولانا نے کہا: ”یہ اشتہار دیکھیے، اس حلقے میں آپ ہمیشہ ”مورخ اسلام“ ہی رہیں گے۔“ حضرت ”بننے کی خواہش پوری نہ ہوگی۔“ حضرت ”وہی لوگ ہوں گے جو اس حلقے سے پہلے سے وابستہ ہیں، یہ اعزاز آپ کو نہیں ملے گا۔“

سید صاحب نے ہلکے سے دلائلِ تبسم کے سوا اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ سید صاحب مرحوم اس وقت کے وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے بہت قریب تھے اور بعض سرکاری کمیٹیوں کے رکن بھی تھے۔ مولانا نے کہا:

”آپ کا ارکانِ حکومت سے قریبی تعلق ہے، ان سے کہیے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مخلصانہ قدم اٹھائیں اور اچھے لوگوں کو آگے لائیں۔“

سید صاحب بولے: ”کس سے کہوں؟“

کہا: ”لیاقت علی سے!“

فرمایا: ”اچھے لوگ آپ کے خیال میں مثلاً کون ہیں؟“

جواب دیا: ”مثلاً آپ ہیں۔!“

فرمایا: ”میں تو نہیں ہوں۔“

مولانا نے زور دے کر کہا: ”اگر آپ نہیں ہیں تو میں ہوں۔ آپ انکسار سے کام لیتے ہیں، میں تو اس کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔“

سید صاحب نے فرمایا: ”میں بہت سے لوگوں سے مل کر اور ان سے بات چیت کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومتوں کی مصلحتیں کچھ اور ہوتی ہیں اور بات کرنے کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔“

مولانا نے کہا: ”اگر معاملہ یہی ہے تو آپ ان کی کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں میں شامل ہو کر کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟“

سید صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور گفتگو کا یہ سلسلہ یہیں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سید صاحب نے مولانا سے پوچھا:

”پاکستان کے دینی مدارس کا کیا حال ہے؟“

مولانا نے جواب دیا: ”یہاں ندوۃ العلماء کی طرح کا ایک دارالعلوم قائم کرنا چاہیے جس میں ایسے اہل علم تیار کیے جائیں جو صاف ذہن اور بلند فکر ہوں۔ آزادی کے بعد علماء کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ انہیں نئے حالات میں نئے عوارض کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لیں اور علماء کی رہنمائی کریں۔“

یہ دلچسپ گفتگو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔

ہم سید صاحب مرحوم سے اجازت لے کر رخصت ہونے لگے تو انھوں نے اذرا و کرم شکریہ ادا کیا، دعائی اور مولانا کی بڑھی ہوئی داڑھی پر دوبارہ اظہارِ مسرت فرمایا:

پھر چھوٹا کرالینا داڑھی کا اور ناکام ہو جانا تجربے کا

تقریباً ایک سال بعد مولانا نے پھر بے چاری بے زبان داڑھی کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی اور اسے دوبارہ پہلی حالت پر لے آئے، جسے وہ ”مسکبِ اعتدال“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسی نے پوچھا:

”آپ نے داڑھی بڑھالی تھی، اب پھر چھوٹی کر لی ہے۔“

فرمایا ”وہ ایک تجربہ تھا جو کامیاب نہ ہو سکا۔“

واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے داڑھی پر دوبارہ ”عملِ مقرر“ کا سلسلہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں آنے کے بعد شروع کیا تھا۔ یعنی یہاں کے ماحول کے مطابق پھر ”تغییرِ احوال“ ہوا اور اس کے ساتھ ہی ”تغییرِ احکام“ بھی ہو گیا۔

جاننا ہمارا اوڈاں والا ضلع لائل پور میں

فروری ۱۹۵۰ء میں مجھے اور مولانا ندوی کو ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) کی تحصیل سمندری کے ایک گاؤں چک ۱۹۳ گ ب اوڈاں والا سے دعوت نامہ آیا۔ اس گاؤں میں ایک اچھا خاصہ دارالعلوم تھا جو جماعتِ مجاہدین کے ایک رکن صوفی عبداللہ مرحوم نے ۱۹۳۳ء میں قائم کیا تھا۔ وفات سے کئی سال قبل انھوں نے یہ دارالعلوم اوڈاں والا سے



تین میل کے فاصلے پر ماموں کا بچن میں منتقل کر لیا تھا۔ تاہم یہ مدرسہ اوڈاں والا میں بھی بدستور قائم ہے۔ صوفی صاحب کا انتقال ۲۸ - اپریل ۱۹۷۵ (۱۳ - بیج الاول ۱۳۹۵ھ) کو ہوا۔ وہ اپنے قائم کردہ دارالعلوم (ماموں کا بچن) کے احاطے میں مدفون ہیں۔

صوفی صاحب مرحوم علوم قرآن میں مولانا کی مہارت اور وسعت نظر کے بہت مداح تھے۔ ان کی آخر دم تک یہ خواہش رہی کہ مولانا ان کے دارالعلوم میں تشریف لے آئیں اور طلباء کو صرف تفسیر قرآن کا درس دیں، ان کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے زیادہ مراعات دی جائیں گی۔

اس دارالعلوم کے ناظم ہمارے دوست مولانا عبدالقادر ندوی ہیں جو اپنا کاروبار کرتے ہیں، اور بہت زندہ دل اور خوش مزاج آدمی ہیں۔ دارالعلوم کا شاندار کتب خانہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی کو جب میں نے بتایا کہ اوڈاں والا میں بھی ایک ندوی عالم ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ وہاں پہنچے تو مولانا کو کچھ پتہ نہ چلا کہ یہاں ندوی کون صاحب ہیں۔ سب دیہاتی لباس میں اور تہمند باندھے ہوئے۔ مولانا اپنے ذہن میں پاجاموں اور شیر وانیوں کا تصور کیے بیٹھے تھے۔ فرمایا:

”مولانا عبدالقادر ندوی کہاں ہیں؟“

عرض کیا ”یہی تو میں جو آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں اور جن کا میں نے آپ سے ابھی تعارف کرایا ہے“

انھیں غور سے دیکھا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”آپ ندوی کم ہیں اور عبدالقادر زیادہ ہیں۔“

وہ بھی دلچسپ آدمی ہیں فوراً بولے

”ندوے سے فارغ ہو کر یہاں پہنچا تو، ب سے بدل گیا اور ماحول نے ندوی سے

بدوی بنادیا“

میں نے عرض کیا، ”ندویت کا ایک مطلب زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی بھی ہے اور

ناشر اللہ یہ جوہر مولانا عبد القادر میں موجود ہے۔

عبد القادر ندوی ہمارے ان دوستوں میں ہیں جو صرف باتیں ہی نہیں کرتے، ملنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لاہور آئیں تو ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بھی تشریف لاتے ہیں، ادارے کی کتابیں باقاعدہ خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ دارالعلوم ماموں کانسجن کی لائبریری کے لیے بھی ہماری تمام مطبوعات خرید کر لے گئے ہیں۔

### جانا گاؤں کی سیر کو

ایک مرتبہ مولانا اپنے عزیزوں سے ملنے ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں گئے۔ خیال یہ تھا کہ ملاقات کے بہانے گاؤں کی سیر بھی ہو جائے گی۔ چارپانچ دن کا کہہ کر گئے تھے، لیکن دوسرے دن واپس آ گئے۔ پوچھا، اتنی جلدی واپس آ گئے، خیریت تو رہی؟ فرمایا غروب آفتاب کے تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچا۔ گاؤں کے حساب سے اس وقت رات ہو چکی تھی۔ جس گھر میں مجھے جانا تھا، وہ اندر سے دروازے کو تالا لگا کر سو چکے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ دوسری دفعہ کھٹکھٹایا، پھر بھی کوئی نہیں بولا۔ تیسری مرتبہ پہلے سے زیادہ زور سے کھٹکھٹایا تو گھر کے سربراہ نے اپنے جھان بیٹوں کو جگایا اور کہا، ”جاؤ کیڈلو، ایس ویلے ادھی رات باہر کون لے“ ساتھ ہی آواز لگئی :

”کون اے؟“

جواب دیا: ”محمد حنیف!“

لیکن میری کمزور آواز کون سنتا تھا۔

اتنے میں ایک شخص نے اندر سے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا :

”کون اے؟“

نام بتایا تو اس نے دروازہ کھولا، اندر لے گیا، خیر خیریت پوچھی اور کھانا کھلایا۔

کھانا کھا چکے تو چائے کی طلب ہوئی۔ میزبان نے پوچھا :

”خیر تو ہے آپ چائے مانگ رہے ہیں، چائے تو بخار وغیرہ کی حالت میں پی

جاتی ہے، آپ تو اِشارۃ اللہ تندرست معلوم ہوتے ہیں۔ پھر اس وقت چائے پیئیں گے تو رات کو نیند کیسے آئے گی؟

بہر حال ایک آدمی نے ہاتھ میں لاٹھی پکڑی اور دکان پر چائے کی پتی لینے گیا، لیکن دکان بند۔ بڑی مشکل سے دکان دار کو جگا کر چائے کی پٹی لائی گئی۔ چائے پک کر تیار ہوئی تو دودھ ہی دودھ۔!

صبح اُٹھے تو میزبان حوائج ضروریہ کے لیے کھیتوں میں لے گئے۔ چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا تو اس کام میں آنے جانے والوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ مولانا نے بتایا کہ میرے رہنما نے مکا کے ایک کھیت کی طرف اشارہ کر کے کہا:

”اُس میں چلے جائیے، یہ باپ مردہ جگہ ہے۔“

اگست کا مہینہ تھا اور مکا میں تھوڑا تھوڑا پانی کھڑا تھا۔ ذرا آگے قدم رکھا تو جو تازمین میں دھنس گیا۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کیا کریں اور کس طرح اس اہم مسئلے سے فراغت حاصل ہو۔

باہر نکلے تو سر سے پاؤں تک پیسنے سے شرابور اور گھٹنوں تک کچھڑے لت پت۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچے اور ہاتھ پاؤں صاف کیے۔ پھر چائے کی پیالی پی، ناشتہ کیا اور صاحب خانہ سے اجازت لے کر وہاں سے بھاگے اور گوجرانوالہ آ کر دم لیا۔

فرمایا گاؤں جانے اور اس قسم کے حالات سے دوچار ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ سوچتا ہوں گاؤں کے لوگ بڑے ہی دل گردے کے مالک ہیں جو ہر روز اس آزمائش سے گزرتے ہیں۔

## مطب قریب قبرستان کے

مولانا کے ایک عزیز عبد المجید مرحوم تھے۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے اور اکثر خود ہی لطیف بن جاتے تھے۔ مولانا کو ازراہِ ادب ”بھابھی“ کہتے تھے۔ انھوں نے طب کے چند نسخے یاد کر لیے اور اپنا مطب کھول لیا۔ ان کا مطب گوجرانوالہ میں قبرستان کے بالکل قریب تھا۔ مولانا ان سے ملنے گئے تو حدودِ اربعہ دیکھ فرمایا:

”یہ بہت اچھی جگہ ہے، ادھر مریض آیا، ادھر آپ کی دوا سے ختم ہوا، اور اٹھا کر فوراً قبرستان پہنچا دیا۔“

۱۹۵۱ کے صوبائی انتخاب

مارچ ۱۹۵۱ میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ جو جماعتیں اس دنگل میں حصہ لے رہی تھیں، ان میں مسلم لیگ، جناح عوامی لیگ، آزاد پاکستان پارٹی اور جماعت اسلامی قابل ذکر ہیں۔ گوجرانوالہ کی ان جماعتوں کے مقامی ارکان اور امیدوار اکثر ”الاعتصام“ کے دفتر نشریف لاتے اور اس موضوع پر گفتگو فرماتے جو ہمیں صبرِ شکر کر کے سُننا پڑتی۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی نے ایک پنجائیت سسٹم ایجاد فرمایا تھا اور مختلف حلقوں میں انتخاب لڑنے کے لیے اس کی پنجائیت ہی لوگوں کو چُننتی تھی۔ جس شخص کو مقامی پنجائیت انتخاب کے لیے نامزد کر دیتی، اسے ”صلاح نمائندہ“ کہا جاتا تھا۔ نہ وہ امیدوار کہلا سکتا تھا اور نہ اپنے لیے ووٹ مانگ سکتا تھا، کیوں کہ یہ طریقہ اس جماعت کے نزدیک اسلام میں ممنوع تھا۔ اس کے لیے دوسرے لوگ بھاگ دوڑ کرتے تھے۔ وہ لوگوں سے ووٹ مانگتے تھے اور اللہ سے دعا مانگتے تھے کہ وہ اس صلاح نمائندے کو کامیابی عطا فرمائے۔ ہم نے اس اندازِ سیاست کا نام ”سیاسی تصوف“ رکھا تھا۔

گوجرانوالہ کے شہری حلقے کے لیے مقامی جماعت اسلامی کی پنجائیت کی نگاہِ انتخاب وہاں کے مشہور دیوبندی عالم مولانا محمد چیلغ پر پڑی (الطہران کی عمر میں برکت عطا فرمائے، بلاشبہ وہ اس دور کے جید عالم اور ممتاز مدرس ہیں) وہ مولانا ندوی کے بے تکلف دوست اور میرے کرم فرما تھے۔ ان کے حواری ان کو ہمارے دفتر لے آتے تو وہ بے چارے معصوم پردہ دار خاتون کی طرح نگاہیں نیچی کر کے چپ چاپ بیٹھ رہتے۔ انتخاب کی باتیں کرنے اور لوگوں کے سوالات کے جواب دینے کا فریضہ وہ حضرات انجام دیتے جو انھیں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے تھے۔ یہ ایک عجیب سا منظر ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ مولانا محمد چیلغ کے رفقاء کا ران کو ہمارے دفتر بٹھا کر ووٹ مانگنے چلے جاتے۔ اس وقت مولانا ندوی ان سے کہتے، سب لوگ چلے گئے ہیں، کوئی سننے اور دیکھنے والا

نہیں، اب موقع ہے باتیں بھی کر لیجیے اور منہس بھی لیجیے۔ مولانا محمد چہراغ شگفتہ مزاج عالم ہیں، وہ اس قسم کی باتوں سے محفوظ بھی ہوتے اور جو دھندلے ان سے کرایا جاتا تھا، اس پر پریشانی کا اظہار بھی کرتے کہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انتخاب ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کو دیکھ کر ترس آتا تھا اور ایسے معلوم ہوتا تھا کہ شیر پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ایک اچھے بھلے ہنستے کھیلنے آدمی کو جبراً چپ کرادینا واقعی بہت بڑی ستم ظریفی ہے۔

اس دور میں حسین شہید سہروردی مرحوم پاکستان جناح عوامی لیگ کے صدر تھے اور پنجاب میں انتخابی دورہ کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ گوجرانوالے بھی گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کے امیدوار جناح عوامی لیگ کے امیدوار کے حق میں انتخاب سے دست بردار ہو جائیں تاکہ متحد ہو کر مسلم لیگ کے امیدوار کا مقابلہ کیا جائے۔ اس ضمن میں انھوں نے جماعت اسلامی کے مقامی ارکان سے بھی بات کی، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جماعت اسلامی کے نزدیک یہ اللہ کے دین کی خدمت تھی اور یہ خدمت صالح نمائندہ ہی انجام دے سکتا تھا اور صالح نمائندہ وہ کہلاتا تھا جسے کسی پنچایت نے نامزد کیا ہو، اور پنچایت کے نامزد نمائندے کا دست بردار ہونا ان کی شرع میں جائز نہ تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنی شرع کے مقابلے میں سہروردی یا کسی اور شخص کی بات نہیں مان سکتے تھے۔

گوجرانوالہ میں اس وقت ایک ہی اچھا ہوٹل تھا، جس کا نام تھا ویسٹ اینڈ ہوٹل۔ میں اور مولانا ندوی عام طور پر چار بجے کی چائے اسی ہوٹل میں پیتے تھے۔ ایک دن سہروردی مرحوم بھی اپنے مقامی اور غیر مقامی رفقاء کے ساتھ وہاں آگئے اور ہماری داڑھیاں دیکھ کر ہمارے پاس ہی آ بیٹھے۔ سہروردی صاحب نے ہمیں جماعت اسلامی کے آدمی سمجھا اور یہی مسئلہ چھیڑ دیا اور کہا کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے امیدوار کو ہمارے امیدوار کے حق میں بیٹھ جانا چاہیے۔ میں نے ان سے عرض کیا، معاف کیجیے گا، ایک تو ہمارے دین میں مصلحت نام کی کوئی شے نہیں ہے، دوسرے ہمارے آدمی کو امیدوار نہ کہیے، نمائندہ کہیے، اس لیے کہ اس کو اسلامی اور سیاسی اعتبار سے بہت ہی دور رس نگاہ رکھنے

والی پنچایت نامہ در کرتی ہے۔ اس پر سہروردی صاحب مُسکرائے اور بات آگے چلائی۔ مولانا کو اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن انھوں نے اس اسلوب سے جماعتِ اسلامی کے حق میں دلائل دیے کہ خود جماعتِ اسلامی کے لوگ بھی نہیں دے سکے تھے۔ سہروردی صاحب جھگڑنے کے موڈ میں نہیں تھے، وہ خاموش ہو گئے۔

بات ختم ہوئی تو مولانا کے بارے میں سہروردی مرحوم سے کسی نے کہا کہ یہ تو جماعتِ اسلامی سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ حیران ہوئے اور کہا جماعت سے تعلق نہ ہونے کے باوجود اس کے حق میں آپ نے ایسے دلائل دیے کہ خود جماعت والے بھی نہ دے سکے تھے۔

ووٹ دینے کا وقت آیا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا :

”مولانا محمد چرخ ہمارے دوست ہیں، لیکن ہماری خواہش کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔“

پھر ہنس کر کہا

”ان کو ووٹ دینا ووٹ کا جھٹکا کرنا ہے۔“

میں نے عرض کیا، ”میں اس میں ترمیم کی اجازت چاہتا ہوں۔“

فرمایا ”کیا ترمیم؟“

عرض کیا، ”مولانا محمد چرخ نیک اور عالم آدمی ہیں، ان کو ووٹ دینا، ووٹ کو شہید کرنا ہے، ہم اپنے ووٹ کو شہادت کا درجہ دیں گے۔“

مولانا نے ازراہ کرم میری ترمیم منظور فرمائی اور اس کا ذکر انتخاب کے بعد مولانا محمد چرخ

سے بھی کیا اور کہا ”ہم نے اپنا ووٹ شہید کر دیا ہے۔“

قیام کرنا ضیاء الاسلام انصاری کا گوجرانوالہ میں

اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کے حلقہ ہائے انتخابات میں کام کرنے کے لیے کراچی اور سندھ کے مختلف شہروں سے بہت سے نوجوان کارکن پنجاب آئے تھے، ان میں سے چھ سات کارکن گوجرانوالہ بھی آئے جن میں ایک ضیاء الاسلام انصاری تھے، جو اب روزنامہ ”مشرق“ کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

ان دنوں عربی کے مشہور ادیب مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم گوجرانوالہ میں اقامت گزیر تھے۔ وہاں انھوں نے عربی کی نشر و اشاعت کے لیے ”دار العروہ“ کے نام سے ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ مولانا مسعود عالم ندوی مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ میرا قیام ایک اچھی خاصی بلڈنگ میں تھا، جو چوک سری والا میں تھی اور اس میں میرے بعض مخلص دوستوں (جناب اسماعیل ضیاء اور ان کے ساتھیوں) نے ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی اور میں تنہا اس میں رہتا تھا۔ مولانا مسعود عالم ندوی کو اس کا علم تھا۔ ضیاء الاسلام انصاری اور چند اور نوجوان جماعت اسلامی کی انتخابی مہم کے سلسلے میں گوجرانوالہ لے گئے تو مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم میرے پاس الاعتصام کے دفتر تشریف لائے اور فرمایا کہ ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں ہے، اگر ہو سکے تو چند روز کے لیے تم ان کارکنوں کو اپنے ہاں ٹھہراؤ۔ چنانچہ یہ تمام نوجوان میرے پاس آ گئے۔ مجھے ان کے سیاسی رجحانات سے تو کوئی تعلق نہ تھا، لیکن پڑھنے لکھنے اور لطائفِ ظرائف میں ان سے ہم آہنگی تھی۔ انتخاب کے بعد دوسرے لوگ تو چلے گئے مگر ضیاء الاسلام انصاری اتفاق سے پورے نو مہینے میرے پاس رہے۔ نو مہینے کی اس اتفاقیہ مدتِ قیام کا اب تک ضیاء صاحب کو علم ہے اور کبھی اس کا ذکر ہو تو اس پر خوش ہوتے ہیں۔ ضیاء صاحب الاعتصام میں بھی ہمیں مدد دیتے تھے۔

اس دور میں گوجرانوالہ میں چلنے تلّاش کرنا ایک اہم کام تھا، اس لیے کہ وہاں کے باشندوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن ضیاء صاحب اس میں بہت تیز تھے۔ انھوں نے بعض ایسے ایسے مقامات میں چائے خانوں کا سراغ لگا یا کہ ہم نہیں لگا سکتے تھے۔ مگر ہم نے ضیاء صاحب کو مایوس نہیں کیا، وہ جہاں ہمیں لے گئے، ہم بلاتا مل وہاں گئے۔ اس میں اپنے مقام اور مرتبہ کی پروا نہیں کی۔

قیام گوجرانوالہ کا ذکر ضیاء الاسلام انصاری صاحب نے اپنی یادداشتوں میں بھی کیا ہے جو پروفیسر شفیق جالندھری (شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی) نے مرتب کی تھیں اور ۱۹۷۹ء کے ”بادبان“ (لاہور) میں شائع ہوئی تھیں۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ جس لائبریری میں میرا قیام تھا اس کے چیرمین اسماعیل ضیاء

تھے جو ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک پنجاب اسمبلی کے رکن رہے۔ وہ اور ان کے ساتھی (یعنی لائبریری کے منتظین) اُس وقت بھی جماعت اسلامی کے مخالف تھے، اب بھی مخالف ہیں۔ خود میرا بھی یہی حال تھا، نہ میں اس زمانے میں جماعت اسلامی کا حامی تھا، نہ اب ہوں۔ لیکن اس لائبریری کے ارباب انتظام کی عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اشارۃً یا کنایۃً مجھے کبھی یہ نہیں کہا کہ جماعت اسلامی کے کارکنوں کو یہاں کیوں ٹھہرا رکھا ہے۔ خود میرے دل میں بھی ایک لمحے کے لیے یہ خیال نہیں گزرا تھا کہ جو لوگ ہمارے ہم رائے نہیں ہیں ان کو یہاں قیام کی سہولت کیوں دی جائے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ ہوتا کہ اسماعیل ضیا صاحب اور ان کے رفقا ہمارے ہاں آتے اور کھلے دل سے ہماری مذاق کی باتیں بھی کرتے، سیاسیات کو بھی موضوع بحث ٹھہراتے اور لطائف و خرائف میں بھی حصہ لیتے۔ ضیاء الاسلام انصاری اس زمانے میں بھی جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے کارکن کی حیثیت ہی سے گوجرانوالے گئے تھے، اب بھی وہ اسی فکر و رائے کے حامل ہیں۔ اسماعیل ضیا مسدک اہل حدیث ہیں، گوجرانوالہ میں کاروبار کرتے ہیں اور شرافت و متانت کے اعتبار سے اپنے شہر میں بہت اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ ضیاء الاسلام انصاری اور ان کے رفقا انتخابات میں جن حضرات کی حمایت کے لیے آئے تھے، یہ ان کے مخالف تھے۔ اس واقعے پر چونتیس برس گزر چکے ہیں۔ آپ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کیا کسی اور جماعت یا جماعت اسلامی کے ارکان اور متعلقین بھی یہ حوصلہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مخالفوں کو کسی قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں؟ مجھے تو اب اس قسم کے نہ افراد نظر آتے ہیں، نہ جماعتیں۔

پڑھنا میرا حجتہ اللہ البالغہ مولانا سے

اسی زمانے میں میں نے مولانا سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مشہور کتاب حجتہ اللہ البالغہ پڑھی۔ اس کے لیے مولانا شام کے بعد دفتر تشریف لاتے اور نہایت اہتمام سے یہ کتاب پڑھاتے۔ اس کے مشکل مقامات کی اس انداز سے تشریح فرماتے کہ بغیر کسی دقت کے ذہن کی گرفت میں آجاتے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ دورانِ درس مجھے نیند آگئی، مولانا تقریر فرما رہے تھے اور میں سو رہا تھا۔ فرمایا:

”سنا ہے ہو، سن نہیں رہے ہو؟“



میں فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ عرض کیا

”پہلے بھی سن رہا تھا، اب بھی سن رہا ہوں، بس دورانِ سبق میں نیند آگئی تھی“  
فرمایا اس کی سزا یہ ہے کہ دوپیا لیاں چائے لاؤ، ایک خود پیو، ایک مجھے پلاؤ۔  
چنانچہ ہم نے یہ سزا بھگتی اور چائے کی دوپیا یوں پر چار آنے خرچ کیے۔

گوجرانوالہ کی محفلیں

گوجرانوالہ کے دورانِ قیام میں جن حضرات سے مولانا کے تعلقات تھے وہ میرے بھی کرم فرماتے۔ مثلاً حضراتِ علما میں مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد چراغ، مولانا ابوالبرکات احمد، مولانا محمد اسماعیل، قاضی عبدالرحیم، مولانا نور حسین گھر جاکھی، مولانا عبدالرحیم (حسین خانوالہ) اور مولانا مسعود عالم ندوی سے صحبتیں رہتیں۔ ان بزرگوں میں سے اب صرف مولانا حافظ محمد گوندلویؒ، مولانا محمد چراغ اور مولانا ابوالبرکات احمد اس دنیا میں موجود ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو تادیر سلامت رکھے اور لوگ ان سے استفادہ کرتے رہیں۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم، مولانا ندوی کے بھی استاد تھے اور میرے بھی استاد تھے۔ مولانا ندوی نے ان سے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک تحصیلِ علم کی اور اس عاجز کو اس سے تقریباً بیس سال بعد ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں ان کے حلقہٴ شاگردی میں رہنے کا خرف حاصل ہوا۔ اس طرح میں اور مولانا ندوی استاد بھائی بھی ہیں۔ مولانا حافظ محمد گوندلوی میرے استاد ہیں، مولانا نے ان سے کچھ پڑھا تو نہیں البتہ ان کے فضل و کمال اور کتابوں پر عبور و استحضار سے بہت متاثر ہیں۔

گوجرانوالہ کے دوسرے حضرات میں سے میاں غلام محمد ڈار، بابا عبد اللہ اہل حدیث، چوہدری علی احمد خاں، منشی محمد یوسف، خواجہ عبدالعزیز اور بابا فیض الدین کے نام قابلِ ذکر

۱۷ ستمبر ۱۹۸۴ء میں یہ سطور لکھی گئی تھیں۔ اس وقت حضرت حافظ صاحب زندہ تھے۔ اب

جون ۱۹۸۶ء کو مسودہ کاتب کے حوالے کر رہا ہوں تو ان کی وفات پر پورا ایک سال گزر چکا ہے۔

۴ جون ۱۹۸۵ء کو ان کی وفات ہوئی۔

## واقعات و لطائف کے آئینے میں

۲۵۳

ہیں۔ ان میں سے اب صرف بابونصر الدین (اللہ ان کو خیریت سے رکھے) زندہ ہیں نصیر الدین صاحب اس وقت گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ کوآپریٹو بینک کے منیجر تھے۔ یہ مولانا ندوی کے قریب کی رشتے داری میں چھوٹے بھائی ہیں۔ مرحوم غلام محمد ڈار، عجائب گھر (لاہور) کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر سیف الرحمن ڈار کے والد تھے۔ بہت سنجیدہ، صاف دل اور معاملہ فہم بزرگ تھے۔ ہمارے نہایت مخلص دوست تھے۔ منشی محمد یوسف سبزی منڈی میں آڑھتی تھے۔ چوہدری علی احمد خاں جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی زمانے میں پولیس آفیسر رہے تھے اور ہوشیار پور کے باشندے تھے، آزادی کے بعد گوجرانوالہ آگئے تھے۔ کمیونزم کے بارے میں ان کا اچھا خاصا مطالعہ تھا، جماعت اسلامی کے بعض پرانے حضرات نے اس موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں، وہ انہی سے معلومات حاصل کر کے لکھی ہیں۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس موضوع سے متعلق ان کی رائے مستند ہے۔ لیکن جب مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے مکان پر اس سلسلے میں ان کی گفتگو مولانا حنیف ندوی سے ہوئی تو جماعت اسلامی کے رکن ہونے کے باوجود وہ اپنے اس خیال سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ اس موضوع کے مختلف پیچیدہ پہلوؤں کو سمجھنے اور مخالف و موافق لوگوں کے نقطہ نظر کو حیثیت فہم میں لانے کے لیے اکثر مولانا کے پاس آتے۔ وہ جب ہمارے دفتر تشریف لاتے تو یہی مسئلہ شروع کر دیتے، کیوں کہ ان کا اصل موضوع یہی تھا۔ وہ بعض امور میں ذہنی اعتبار سے جماعت اسلامی کے اکثر دوستوں سے مختلف تھے۔ جو بات ان کی سمجھ میں آجاتی تو اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ بات سمجھنے کے لیے کرتے تھے، ہر وقت سمجھانے کے موڈ میں نہیں رہتے تھے۔

غلام محمد ڈار، بابا عبداللہ اہل حدیث، منشی محمد یوسف اور بابونصر الدین دس پندرہ دن بعد حلوہ پوری یا کھیر، سردیوں میں سنگترے ملنے اور گرمیوں میں آم لے کر آجاتے اور ہم سب مل کر کھاتے اور صحبت بناتے۔ مولانا محمد اسماعیل بھی اس مجلس میں شریک ہوتے۔ مولانا ندوی آم اور مالٹے میں تو شرکت کرتے، لیکن حلوہ پوری، لسی اور کھیر سے انھیں رغبت نہ تھی۔ یہ فریضہ ہم لوگ انجام دیتے۔ ان دنوں کھانے پینے میں ہم سب ”آل راؤنڈر“ تھے۔ گوجرانوالہ میں ان دونوں گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ نوجوانوں کا تھا، جو میرے

ہم عمر یا تھوڑے بہت بڑے چھوٹے تھے۔ ان میں اسماعیل ضیاء، عزیز انصاری، خواجہ محمد یوسف، راسخ عرفانی، چوہدری محمد رمضان، عبدالعزیز اور پروفیسر معراج الدین تھے۔ ان میں عبدالعزیز کئی سال ہوتے ایک حادثے میں وفات پا گئے ہیں، اللہ ان کی مغفرت کرے، مرحوم نہایت زندہ دل اور دوستوں کے دوست تھے، بیحضرات متعدد مسائل میں ایک دوسرے کے ہم خیال نہ تھے، لیکن ہمارے ساتھ ان سب کے گھرے مراسم تھے جو بجد اللہ اب تک قائم ہیں۔

گوچراوالہ میں اُن دنوں مولانا اسماعیل مرحوم کے مدرسے کے دو طالب علم ہماری بڑی خدمت کرتے تھے۔ اب وہ ماشاء اللہ موج میں ہیں۔ ایک مولانا عطاء اللہ شائق جو پاکستان کے کامیاب ناشر کتب ہیں اور دوسرے پروفیسر غلام نبی عارف جو لاہور کے ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ اللہ ان کو ہمیشہ خوش رکھے۔

بیس داڑھیوں کے برابر داڑھی

یہاں ایک لطیفہ بھی سنتے جایے۔ ایک دن مولانا حنیف ندوی، عزیز انصاری اور یہ بندۂ عاجز (تینوں) الاعتصام کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں کاموں کی گئے۔ عزیز انصاری ان دنوں چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھتے تھے (اب تو ماشاء اللہ معاملہ صاف ہے) اور میری داڑھی بھی ایسی ہی تھی (یعنی بعض علما کے نزدیک نہ ہونے کے برابر) مولانا ندوی کی داڑھی خدا جھوٹ نہ بلوائے، ہم سے کوئی بیس گنا بڑی تھی۔ ہم واپس آکر مولانا اسماعیل مرحوم کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے لگے تو انھوں نے میرے اور عزیز انصاری کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے کہا:

”ایہ گھسیاں داڑھیاں والے بھی گئے سن“

عزیز انصاری نے جواب دیا:

”جناب! ہم مولانا حنیف ندوی کی قیادت میں گئے تھے، جن کی داڑھی کم از کم ہمارے جیسی بیس داڑھیوں کے برابر ہے اور پھر وہاں ہمیں ایسے حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو مولانا سے بھی بازی لے گئے تھے“

مطمئن ہمارے

گوچراوالہ میں ہمارے ایک دوست حاجی عنایت اللہ تھے جو کاروبار کرتے تھے، اور بہت نیک، مخلص اور بہادر انسان تھے۔ وہ کبھی ہمیں دودھ پلاتے اور کبھی چائے۔

جب ملتے، یہ ضرور پوچھتے کہ ”آپ کے کام کاج کا کیا حال ہے؟“ ہم جواب دیتے، ”اللہ کا فضل ہے، بہت اچھا ہے۔“ اس سے وہ خوش ہوتے اور کہتے، ”تمہاروں اپنے کم توں مطمئن اے نا؟“ (یعنی آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں) یہ الفاظ وہ انتہائی مخلصانہ انداز میں کہتے۔

مولانا جب کسی کام کے لیے مجھے فرماتے تو ہمیں کام مکمل کرنے کے بعد نعرہ لگاتا: ”دکام ٹھیک ٹھاک اور مکمل ہو گیا ہے، مجھے مطمئن ہے۔“  
مولانا جواب میں فرماتے: ”بس ٹھیک ہے، اگر آپ کو مطمئن ہے تو مجھے بھی مطمئن ہے۔ اصل شے تو مطمئن ہے۔“

اگر ہم کسی صاحب کی موجودگی میں لفظ ”مطمئن“ بولتے تو وہ حیران ہوتے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں، ”مطمئن“ آخر کیا بلا ہے۔ لیکن ہم نے کسی کو نہیں بتایا کہ یہ گوہر نایاب ہمیں کہاں سے ملا۔ ہم نے بعض طبیبوں کی طرح اس نسخہ مرفوح بخش کو اپنے سینے میں محفوظ رکھا۔ یعنی یہ ”صدری نسخہ“ تھا اور ہمارے نزدیک یہ بہت بڑی متاع تھی جو ہمیں ذہنی طور سے مطمئن رکھتی اور دل کو آرام پہنچاتی تھی۔

### قصہ ایک حقہ توڑنے کا

ایک دن ہم نے مغرب کی نماز مولانا اسماعیل مرحوم کی جامع مسجد میں پڑھی۔ گرمیوں کا موسم تھا، نماز کے بعد اچانک ایک شور مچا ہوا۔ بات یہ تھی کہ ایک دیہاتی مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ مغرب کی اذان کی آواز اس کے کان میں پڑی۔ وہ بے چارا بازار سے نیا حقہ خرید کر لایا تھا۔ حقہ بہت اچھا تھا اور اس کے تمام اجزاء الگ الگ تھے۔ اس کی قسمت نے جو چکر دیا تو اذان سن کر اس نے مسجد کا رخ کیا، حقہ ایک کونے میں رکھا جہاں جوتے رکھے جاتے ہیں اور خود دھوکہ کر کے جماعت میں شامل ہو گیا۔ نماز ختم ہوئی تو ایک نمازی کی نظر اس پر پڑی، اس نے آؤ دیکھنا تاؤ، حقہ توڑ ڈالا، اور پھر اسی پر بس نہیں کیا، اس کے ٹوٹے ہوئے اجزاء مسجد کے باہر سڑک پر پھینک دیے، اور ساتھ ہی بلند آواز سے پکارنے لگا کہ اس پلید اور ناپاک شے کو کون مسجد میں لایا ہے۔ اور بھی بہت سے

نمازی اس کے ہم نوا ہو گئے۔ حقے کا بے چارہ دیہاتی مالک یہ منظر دیکھ کر سہم گیا، وہ کانپتا ہوا اٹھا اور کہا:

”یہ حقہ میرا ہے اور بالکل نیا ہے اور مسجد کے اندر نہیں، باہر جوتوں کی جگہ پر رکھا تھا۔ بعض نمازی اس قدر عیوش میں آئے کہ اسے مارنے کو دوڑے۔

ہمیں نمازیوں کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ مولانا ندوی نے میری طرف دیکھا، میں نے کچھ کہنے کا اشارہ کیا تو مولانا اٹھے اور ان لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا: ”تم اپنے کاروبار میں دن رات غلط بیانی کرتے ہو، بھھوٹ بولتے ہو، گاہگوں کو دھوکا دیتے ہو، ماپ تول میں کمی بیشی کرتے ہو اور ہزاروں برائیوں کے مرتکب ہوتے ہو، تمہیں یہ حرکت کرنے کی کیسے جرأت ہوئی؟ حقہ نوشی کا جائز یا ناجائز ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک عادت ہے جو اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی۔ لیکن تم تو بر ملا برائیاں کرتے ہو“ مولانا نے کہا، ”جس کا حقہ توڑا ہے، اس سے معافی مانگو اور جو اس کا نقصان ہوا ہے وہ پورا کرو۔“ تم اپنے عمل و حرکت سے نمازیوں کو مسجد میں آنے سے روکتے ہو، تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے“ مرحوم غلام محمد ڈار نے بھی اپنے دھیمے مگر مؤثر لہجے میں مولانا کی تائید کی اور مولانا ہمایل مرحوم نے بھی حقہ توڑنے والے اور اس کی تائید کرنے والوں کو ڈانٹا۔ بالآخر جس کا حقہ توڑا گیا تھا، اس کو حقے کی قیمت دلائی گئی۔

میں نے مولانا کے اس کلمہ حق بلند کرنے کی تائید کی اور پھر باہر جا کر اس خوشی میں ہم نے چائے پی۔

### قصہ میری گھڑی ٹوٹنے کا ہاتھوں عزیز انصاری کے

میں ایک دن اپنے دفتر کے صحن میں چارپائی پر بیٹھا کام کر رہا تھا اور گھڑی کلائی سے اتار کر چارپائی پر رکھی تھی کہ عزیز انصاری آئے اور قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے میری گھڑی اٹھالی اور اسے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے گھمانا شروع کر دیا۔ یہ حرکت مجھے عجیب سی لگی، لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔

بولے۔

”یہ گھڑی آپ کی ہے؟“

عرض کیا، ”جی ہاں!“

کہا، ”اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے چارپائی کے پائے پر مار کر دیکھوں کہ ٹوٹتی ہے یا نہیں ٹوٹتی؟“

عرض کیا، ”اگر آپ کے نزدیک اس کا یہی مصرف ہے اور آپ کے فہم و فراست کا یہی فیصلہ ہے کہ اس کو پائے پر مارنا ضروری ہے تو ٹھیک ہے“

کہا، ”میں اسے ٹیسٹ کرنا چاہتا ہوں“

عرض کیا، ”آپ گھڑی کو اس طرح ٹیسٹ کرتے ہیں“ — ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے دایاں ہاتھ سر سے اوپر اٹھایا اور زور سے گھڑی پائے پر دے ماری اور پھر آناً فاناً

اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے

کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

ہم دونوں حیران کہ یہ کیا ہو گیا۔ وہ اپنی حرکت پر اور میں ان کی عقل پر — !

اتنے میں مولانا ندوی بھی آگئے اور مولانا اسماعیل بھی تشریف لے آئے۔ یہ حضرات ہنس بھی رہے تھے اور تعجب بھی کر رہے تھے۔ ہنسی تو مجھے اور عزیز انصاری کو بھی آرہی تھی، لیکن ہنسی ہنسی میں فرق تھا، ان کی ہنسی ندامت کی تھی اور میری افسوس کی۔

مولانا اسماعیل مرحوم نے فیصلہ دیا کہ عزیز انصاری مجھ کو نئی گھڑی لا کر دیں۔ مولانا حنیف ندوی نے فرمایا، دو گھڑیاں دی جائیں، ایک گھڑی کے بدلے میں اور ایک اس خوشی میں کہ عزیز انصاری کی پرواز فہم کتنی اونچی ہے۔

گھڑی ٹوٹنے کا قصہ اور اس فیصلے کا علم ہمارے تمام حلقہ تعارف میں پھیل گیا۔ لینے دینے کا معاملہ تو ختم ہوا لیکن اس کے بعد عزیز انصاری سے ہماری دوستی ہو گئی جواب تک قائم ہے، اور جب بھی ہماری کہیں ملاقات ہوتی ہے، میں گھڑی کی بات کروں یا نہ کروں، انصاری صاحب سب کو یہ قصہ تفصیل سے سناتے ہیں اور اس وقت ہم

دونوں پر جو کیفیت طاری تھی، اس کا بے تکلفی سے اظہار کرتے ہیں۔

دھوکا

مولانا نستعلیق عالم ہیں۔ وضع قطع اساتذہ فن سے ملتی ہوئی۔ شکل و تصویر دیکھیے تو غالب، حالی، نذیر احمد اور شبلی کے مشابہ، لباس اور رہن سہن کے اعتبار سے ایک خاص تہذیب و ثقافت کے پیکر۔ زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اور اس میں گنگ و جن کی سی روانی۔ لب و لہجہ لکھنوی، اسلوبِ کلام میٹھا اور پیارا۔ بسا اوقات لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ یوپی کے کسی علاقے اور شہر کے رہنے والے ہیں۔ بعض لوگ تو لکھنؤ کا باشندہ سمجھتے ہیں بارہا ایسا ہوا کہ مولانا کہیں بیٹھے ہیں، پنجابیوں سے اکتایا ہوا کوئی شخص آیا، جھک کر آداب بجالایا اور پنجابیوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔ مولانا مروت سے سنتے رہے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر ارشاد ہوا، ”ما شاء اللہ کس قدر مہذب ہیں آپ، یہ ہے ہماری اصل تہذیب۔ کس شہر سے تعلق ہے آپ کا؟ لکھنؤ سے ہوگا۔“

مولانا کے بعض قریبی دوستوں کو بھی عرصے تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ دراصل کہاں کے رہنے والے ہیں۔ وہ انھیں یوپی کے باشندے سمجھتے رہے۔ چنانچہ ان کے ایک پرانے دوست مرحوم محمد رفیق ملک تھے جن سے میرے بھی گہرے مراسم تھے۔ ”ادبستان“ کے نام سے لاہور میں انھوں نے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا جو اب بھی قائم ہے۔ ایک مرتبہ وہ مولانا سے ملاقات کے لیے گوجرانوالہ گئے۔ مجھ سے پوچھا،

”مولانا حنیف ندوی یوپی کے کس شہر سے تعلق رکھتے ہیں؟“

رفیق ملک مرحوم کے اس سوال سے مجھے تعجب ہوا اور کہا:

”آپ کو ان کے وطن کا علم نہیں؟“

بولے ”نہیں“

میں نے کہا، ”خالص پنجابی ہیں اور گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں“

اس پر وہ مجھ سے بھی زیادہ متعجب ہوئے اور بولے ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے،

یہ گوجرانوالہ کے نہیں ہو سکتے“

پھر پوچھا، ”یہ پنجابی جانتے اور بولتے ہیں؟“

میں نے کہا، ”ہاں! خوب جانتے ہیں اور اچھی طرح بولتے ہیں، گھر میں پنجابی بولتے ہیں۔“  
رفیق ملک نے ہنس کر کہا، ”جے پنجابی نے تو پھر سانوں اردو بول بول کے کیوں اوکھا کر دے نے۔“

اسی طرح مولانا کے استاد مکرم مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ”مولوی حنیف سانوں اردو بول کئے ڈر لیندا اے“

مولانا پنجابی بولتے تو خوب ہیں لیکن پنجابی میں زیادہ علمی باتیں کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ ایک دفعہ گوجرانوالہ کے کچھ دوستوں نے انھیں پنجابی میں قرآن مجید کا درس دینے کو کہا۔ پہلے تو معذرت کی، پھر اصرار بڑھا تو قرآن مجید کھول کر بیٹھ گئے۔ ایک آیت پڑھی، اس کا پنجابی میں ترجمہ کیا اور پھر تفسیر بیان کرنا شروع کی۔ بڑی مشکل سے پانچ منٹ تقریر کی ہوگی کہ بولے ”میرا علم مک گیا اے، جے تسیں کو تاں اردو و تقریر کراں، ورنہ اپنی بس۔“

میرالب و لہجہ خالص پنجابی ہے۔ مولانا نے کئی مرتبہ فرمایا، اپنا لب و لہجہ ٹھیک کر دو۔ لیکن کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک دن عرض کیا، ”لب،“ تو ٹھیک کر سکتا ہوں، جتنی آپ چاہیں ان پر سُرخی لگاؤں گا، لیکن ”لہجہ“ ٹھیک کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

والستہ ہونا ادارہ ثقافت اسلامیہ سے

مئی ۱۹۵۱ء کی بات ہے، دن کے دس بجے ہوں گے، میں دفتر الاعتصام میں تنہا بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک لمبے ترنگے آدمی آئے، جن کی داڑھی منڈی ہوئی تھی اور کھلے پانچے کا پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ آتے ہی کہا:

”السلام علیکم۔“

میں نے ”وعلیکم السلام“ کہا اور احتراماً کھڑا ہو گیا۔ عرض کیا:

”تشریف رکھیے۔“

وہ بیٹھے نہیں، کھڑے کھڑے پوچھا



”مولانا حنیف صاحب کہاں ہیں؟“

عرض کیا، ”وہ گھر پر ہیں، بس تشریف لانے ہی والے ہیں، آپ بیٹھیے۔“

وہ جلدی میں تھے، بولے ”میرا نام رشید اختر ندوی ہے، لاہور سے آیا ہوں، مجھے

مولانا سے ضروری کام ہے، مہربانی کر کے ان سے میرا رابطہ کرادیجیے۔“

میں نے آدمی بھیجا اور تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لے آئے۔ رشید اختر صاحب نے

مولانا کو بتایا، لاہور میں ایک ادارہ قائم ہوا ہے، جس کا نام ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم اس کے بانی اور ڈائریکٹر ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے مقاصد بیان

کیے اور بتایا کہ خلیفہ صاحب سے آپ (مولانا ندوی) کا ذکر کیا گیا تو وہ بہت متاثر ہوئے اور

اب انھوں نے آپ کو یاد فرمایا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ آپ اس ادارے میں تصنیفی خدمات

انجام دیں۔ اس کے بعد رشید اختر صاحب تو چلے گئے۔ مولانا نے مجھ سے مشورہ کیا، میں نے

عرض کیا، آپ کو ضرور لاہور جانا چاہیے۔ چنانچہ مولانا تشریف لائے اور خلیفہ صاحب

سے ابتدائی گفتگو کے بعد ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے۔ تین

سوروپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ مولانا روزانہ گوجرانوالہ سے لاہور آتے اور شام کو واپس چلے

جاتے۔ کھانا ساتھ لاتے تھے۔ اس اثنا میں آٹھ دس مہینے الاعتصام کی ادارت کے فرائض

بھی انجام دیتے رہے۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے مولانا نے پہلی کتاب ”مسئلہ اجتہاد“ لکھی جو ۱۹۵۲ء

میں شائع ہوئی۔ تصنیف کا زیادہ کام ادارے میں نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ گوجرانوالہ سے

لاہور آنے جانے میں تقریباً چار گھنٹے صرف ہو جاتے تھے اور مصنفین کے لیے دفتر کا وقت

ایک بجے تک تھا۔ تصنیفی کام رات کو گھر میں لائٹیں کی روشنی میں کرتے تھے، اس لیے کہ

گھر میں بجلی نہ تھی۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، الاعتصام سے مولانا کو سوروپے تنخواہ ملتی تھی اور یہ ان کی

عسرت کا دور تھا۔ اس سے پہلے مسجد مبارک کی خطابت اور درس کا زمانہ اس سے بھی

زیادہ تنگ دستی کا تھا۔ مسجد کی انجن کی طرف سے جو کچھ دیا جاتا تھا، وہ عام طور پر یکمشت

نہیں ملتا تھا، کبھی دو روپے، کبھی پانچ روپے اور کبھی دس روپے۔ یعنی غریب کی چھت کی طرح ہر روز تنخواہ ٹپکتی رہتی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی ضرورت پوری نہ ہوتی تھی۔  
**خریدنا بھینس کا**

اب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے مولانا کو تین سو روپے تنخواہ ملتی تھی اور وہ ”امیر“ ہو گئے تھے۔ ادھر رمضان کا مہینہ بھی آ رہا تھا۔ مولانا نے بھینس خریدنے کا فیصلہ کیا۔ گوجرانوالہ دودھ اور لسیوں کا شہر ہے، مولانا اس نعمت سے محروم کیوں رہتے؟  
 بھینس خریدنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوئی تو میں نے عرض کیا:  
 ”حضور بھینس ضرور خریدیے، لیکن گستاخی معاف، میراثی کی بھینس کا سا معاملہ نہ ہو۔“  
**فرمایا: ”وہ کیا؟“**

عرض کیا، ”میراثی نے بھینس خرید لی اور پڑوسیوں سے کہہ دیا کہ ہم نے بھینس خریدی ہے، ہمارے ہاں لسی لینے آیا کرو۔ اب لوگ لسی لینے آتے ہیں، لیکن انھیں لسی نہیں ملتی، اس لیے کہ بھینس اس انتظار میں ہے کہ میراثی چارہ ڈالے تو دودھ دوں، اور میراثی اس مہوچ میں ہے کہ بھینس دودھ دے تو اُسے چارہ ڈالوں، نہ میراثی نے چارہ ڈالا، نہ بھینس نے دودھ دیا۔“

لطیفہ سن کر مولانا ہنسنے اور فرمایا، ”ایسا نہیں ہوگا۔“  
 بہر حال ہم نے چند روز لسیاں پیں اور پھر بھینس کا وہی حال ہوا جو مولانا کے گھر میں ہونا چاہیے تھا۔

**”ایک مصرع طرح پر دو شاعروں نے گرہ لگائی“**

مولانا کے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آنے کے چند ماہ بعد ”الاعتصام“ کی ادارت جو پہلے بے قاعدہ طور پر میرے سپرد تھی، اب باقاعدہ طور پر میرے سپرد ہوئی اور اخبار گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا۔ شیش محل روڈ پر اس کا دفتر تھا۔ مولانا بھی گوجرانوالہ سے لاہور آ گئے تھے اور مستقل طور سے یہیں اقامت اختیار کر لی تھی۔ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی بھی مولانا سے صرف ایک مہینہ بعد ۵ جون ۱۹۵۱ کو ادارے سے منسلک ہو گئے تھے۔

دنوں میرے کرم فرما تھے۔ بعد ازاں شاہد حسین رزاقی صاحب اور رئیس احمد جعفری مرحوم بھی یہاں آ گئے۔ ان سب سے میرے مراسم تھے اور کبھی کبھی میں ادارے آتا بھی تھا۔ ان دنوں یہاں دس بجے سے گیارہ بجے تک ”باجامعت سرکاری“ چائے ہوتی تھی۔ اس میں لطائفِ علمیہ بھی ہوتے تھے اور لطائفِ تصوف بھی، تنقیدات بھی ہوتی تھیں اور مختلف واقعات بھی بیان کیے جاتے تھے۔ اُسے ”خلیفہ صاحب کا دربار“ کہا جاتا تھا۔ ایک دن خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے مشہور شاعر اصغر گوٹروی کے بارے میں بتایا کہ وہ جگر مراد آبادی کے اُستاد تھے جس لڑکی سے جگر صاحب شادی کرنا چاہتے تھے، اُسے اصغر گوٹروی اپنے حوالہ عقد میں لے آئے۔ ظاہر ہے اس سے جگر صاحب کو سخت ذہنی اذیت ہوئی، لیکن استاد کو کچھ نہ کہہ سکے۔ پھر جب اصغر گوٹروی کا انتقال ہو گیا تو وہ خاتون جگر صاحب کے نکاح میں آ گئیں۔ خلیفہ صاحب نے یہ واقعہ سنایا تو مولانا حنیف ندوی کی رُگِ ظرافت پھڑکی اور فرمایا :

”شاعری کی اصطلاح میں کننا چاہیے کہ دو شاعروں نے ایک ہی مصرع طرح پر گرہ لگائی؟“

معاصر علمائے کرام کے بارے میں چند لطائف

جب کوئی لطیفہ یا بر محل بات مولانا کے ذہن میں آجائے تو اُسے روک نہیں سکتے۔ کوئی گھر کا فرد ہو، بڑا ہو، چھوٹا ہو، کوئی بھی لطیفے کی زد میں آتا اور اُن کی برجستہ گوئی کا نشانہ بنتا ہو، اس کی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ بے جھجک اور بلا تامل بات کہہ دیتے ہیں۔ پھر اس کے لیے الفاظ ایسے منتخب کرتے اور انداز ایسا اختیار فرماتے ہیں کہ خود وہ شخص بھی محفوظ ہوتا ہے جو اُن کے لطیفے کی زد میں آتا ہے اور یہی بات کہنے کا کمال ہوتا ہے۔ لطیفے کو ”طنز“ نہیں سمجھنا چاہیے، طنز اور لطیفے میں بہت فرق ہے۔ طنز سے قرآن و حدیث میں سختی سے روکا گیا ہے۔ ”لطیفہ“ لطیف پیرایہ بیان میں اظہارِ واقعہ کا نام ہے اور ہلکا پھلکا مزاح بھی۔

ذیل میں مولانا کے چند لطائف ان کے معاصر علمائے کرام کے بارے میں بیان کیے

جلتے ہیں جن کا وہ بے حد احترام کرتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان حضرات کے باہمی تعلقات کتنے گہرے تھے اور یہ آپس میں کس دہجے بے تکلف تھے۔ یہوست یا عبوست ان میں نام کو نہ تھی۔

۱۔ مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا ندوی کا بہت احترام کرتے تھے اور مولانا ندوی بھی ان سے انتہائی عقیدت سے پیش آتے تھے۔ مولانا غزنوی کہا کرتے تھے کہ میں ان سے دولہانِ گفتگو یوں محسوس کرتا ہوں کہ گویا غزالی کی صحبت میں بیٹھا ہوں۔ مولانا غزنوی ایک زمانے میں داڑھی پر خضاب کرتے تھے اور مولانا ندوی ان سے بیس بائیس سال چھوٹے تھے، لیکن داڑھی سفید تھی۔ ایک دن چینیاں والی مسجد میں دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک اور صاحب آگئے اور شریکِ گفتگو ہو گئے۔ باتوں باتوں میں ان صاحب نے مولانا ندوی سے کہا:

”آپ مولانا غزنوی سے عمر میں چھوٹے ہیں اور داڑھی سفید ہو گئی ہے، آپ بھی خضاب کر لیا کریں۔“

مولانا ندوی نے جواب دیا، ”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میری بیوی کو مجھ پر اعتماد ہے۔“

اس سے خود مولانا غزنوی بھی بہت محفوظ ہوئے۔

مولانا ندوی میں یہ عجیب بات دیکھی کہ داڑھی ایک عرصے سے سفید ہے اور سر کے بال چند سال پہلے تک بالکل سیاہ تھے۔ ان کے بعض قریبی دوستوں کو بھی شبہ تھا کہ مولانا سر پر خضاب لگاتے ہیں۔ ایک دن ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے جو ان کے بہت قریبی اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے، مجھ سے کہا ”حنیف صاحب سر پر خضاب لگاتے ہیں، حالانکہ داڑھی پر خضاب کرنا چاہیے۔“

سفید داڑھی سے متعلق خود مولانا کے گھر میں کئی لطیفے پیدا ہوئے اور محلے کی ان عورتوں نے جو ان کے باہم رشتوں سے واقف نہ تھیں، بعض نازک ترین رشتوں کو بدل ڈالا اور وہ محرم کو نامحرم اور نامحرم کو محرم سمجھ بیٹھیں۔

۲۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم (گوجرانوالہ) مولانا کے استاد اور حلیل القدر عالم تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ شیروانی اور شلوار پہنے ہوئے ہیں، سر پر بہت اچھا عمامہ ہے، لیکن جوتا اس لباس کے مطابق نہیں یا جوتا اس کے مطابق ہے مگر سر پر کپڑے کی یا ناریل کی ٹوپی رکھے ہوئے ہیں، یا تہمند باندھ کر تشریف لائے ہیں۔ ایک دن مرکزی جمعیت اہل حدیث کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی کہ مولانا امجد الدین احمد قصوری نے مولانا داؤد غزنوی سے کہا، ”جناب صدر! اپنے ناظم اعلیٰ کی ٹوپی مبارک پر نظر ڈالیے اور تہمند بھی ملاحظہ فرمائیے“

مولانا غزنوی نے مولانا اسماعیل صاحب کی طرف دیکھا اور فرمایا: ”میں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ آپ تہمند باندھ کر تشریف نہ لایا کریں، شلوار پہن کر آیا کریں اور یہ کہ لباس میں یکسانی ہونی چاہیے“

مولانا ندوی بولے: ”جناب صدر! یہ ”نظر وٹو“ ہے جو قائم رہنا چاہیے۔“

اس پر دوسرے حضرات کے علاوہ خود مولانا اسماعیل مرحوم بھی ہنس پڑے اور فرمایا: ”واقعی ”نظر وٹو“ رہنا چاہیے“

۳۔ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب بہت عرصہ پیشتر مولانا سید داؤد غزنوی کے دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے۔ آپ تہمند باندھتے ہیں جو قدرے چھوٹا ہوتا ہے، اس سے ان کا مطلب دراصل یہ ہوتا ہے کہ ٹخنے سنت کے مطابق ننگے رہیں۔ ایک میٹنگ میں مولانا ندوی نے مولانا غزنوی سے فرمایا:

”اپنے شیخ الحدیث سے کہیے صحیح بخاری کا کتاب اللباس پڑھیں۔ اس جملے سے مجلس میں ایک خوش گوار قمقہ بلند ہوا۔

۴۔ ادارۃ ثقافت اسلامیہ میں محمد جعفر شاہ صاحب پھلواری بھی تھے اور رئیس احمد جعفری بھی۔ کوئی بے تکلف دوست ان سے ملاقات کو آتے تو مولانا فرماتے: ”ہم نے کبوتر اور کبوتری کی طرح جوڑا رکھا ہے، جعفر بھی اور جعفری بھی۔ آپ کو

کس کی ضرورت ہے“

۵۔ جعفر شاہ صاحب پھلواری قیص، پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے اور سر پر کالی قراقلی ٹوپی رکھتے تھے۔ لیکن شادی بیاہ کے مواقع پر میں نے دیکھا کہ انگریزی سوٹ زیب تن کر کے اور سر پر ہیٹ رکھ کر آتے۔ خلیفہ عبدالکحیم مرحوم کی صاحب زادی ڈاکٹر رفیعہ حسن کی شادی میں بھی وہ اسی لباس میں تھے۔ نکاح کا وقت ہوا تو خلیفہ صاحب نے مولانا ندوی سے کہا، ”نکاح پڑھنے کے لیے کسی مولوی صاحب کو بلا لے“ مولانا ندوی شاہ صاحب کو لے گئے۔ فرمایا :

”مولوی تو ملا نہیں، پادری لے آیا ہوں۔“

شاہ صاحب کی وضع قطع، داڑھی کی تراش خراش اور رنگ روپ ایسا تھا کہ اس لباس میں واقعی پادری معلوم ہوتے تھے۔

۶۔ جعفر شاہ صاحب مرحوم کسی وقت بعض مسائل کی تعبیر میں بہت آگے نکل جاتے تھے، اسے ہم ”شاہ صاحب کے اجتہادات“ کہا کرتے تھے اور ان ”اجتہادات“ میں انھیں ”انفرادیت“ حاصل تھی۔ خالص فقہی زبان میں کہنا چاہیے کہ بعض مسائل میں وہ متفرد تھے اور ان کے ”تفردات“ نہایت عجیب و غریب تھے۔ ایک دن انھوں نے ایک مسئلے کی تعبیر میں کچھ ایسے ہی اجتہاد سے کام لیا تو میں نے ادب سے عرض کیا ”اس پر آپ کو دوبارہ غور فرمانا چاہیے۔“

مولانا بھی تشریف فرما تھے۔ بولے، ”سید کے گھر کا دین ہے، یہ اس کے جس پہلو کی جو چاہے تعبیر کرے، ہم کون ہوتے ہیں، اس میں دخل دینے والے۔“

۷۔ ایک دن ہم ایک دینی مدرسے میں گئے۔ اس کے شیخ الحدیث صاحب نے ہمیں نہایت اعزاز کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ دورانِ درس میں انھوں نے ایک حدیث کا کچھ ایسا مطلب بیان کیا جو ہمارے نزدیک بالکل نیا تھا۔ ہم حیران کہ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ جب وہ فارغ ہوئے تو مولانا نے فرمایا :

”شیخ الحدیث وہ ہوتا ہے جو حدیث پڑھاتے پڑھاتے بوڑھا ہو جائے اور اسے

حدیث پڑھانا نہ آئے۔“

۸۔ ایک مرتبہ ایک عالمِ دین کو عید ملنے گئے۔ وہ اگرچہ بہت مسلمان نواز ہیں اور مولانا کا بالخصوص خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اس دن معلوم نہیں کیا بات ہوئی، نہ پانی پوچھنا نہ چائے پلائی اور نہ کوئی چیز پیش کی۔ بس باتیں کرتے رہے۔ مولانا کو سخت پیاس لگی تھی۔ کافی دیر تک کوئی چیز نہ آئی تو فرمایا: ”مولانا! آپ کے روزے ابھی ختم نہیں ہوئے۔“

۹۔ کئی سال پیشتر مولانا اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن تھے اور سابق چیف جسٹس مرحوم محمود الرحمن اس کے چیئرمین تھے۔ مولانا محمد بخش مسلم بھی اس کونسل کے رکن تھے۔ کوئی مسئلہ زیر بحث آیا تو مولانا محمد بخش مسلم نے اُس کے متعلق اپنی رائے دی۔ مولانا حنیف ندوی نے بھی اس پر اظہارِ رائے کیا۔ چیئرمین صاحب نے مولانا سے کہا ”مسلم صاحب کی رائے آپ کی رائے کے خلاف ہے“ مولانا نے فرمایا۔ ”یہ صحیح مسلم نہیں ہیں۔“

۱۰۔ ہمارے ایک محترم دوست پروفیسر غلام احمد حریری ہیں جو زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں شعبہ اسلامیات کے صدر تھے۔ ایک مرتبہ فیصل آباد گئے تو حریری صاحب سے ملنے کو جی چاہا۔ متعدد مقامات پر انھیں تلاش کیا گیا مگر وہ نہ ملے۔ بالآخر یونیورسٹی میں انھیں جا پکڑا۔ انھوں نے اپنی یونیورسٹی کی سیر کرائی اور اس کے مختلف مقامات دکھائے۔ مولانا نے فرمایا ”حریری کو تو ہم جانتے تھے، لیکن ”مقاماتِ حریری“ کا آج پتا چلا۔“

”مقاماتِ حریری“ عربی ادبیات کی ایک کتاب کا نام ہے جو ابو محمد قاسم بن علی بن محمد بن عثمان حریری کی تصنیف ہے۔ مولانا نے ”مقاماتِ حریری“ کہہ کر اسی کتاب کی طرف اشارہ کیا تھا، جو موقع کے عین مطابق تھا۔

۱۱۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ہمارے مخلص ترین دوستوں میں سے تھے۔ ایک دن مغرب کے بعد ہم انارکلی سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے ملک صاحب مرحوم نے ہمیں دیکھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا ”میں ایک سلسلے میں پریشان ہوں، میرے ساتھ چلیے۔“

ہم اس وقت اپنا چکر پورا کر کے نیلہ گنبد کی طرف آرہے تھے۔ پوچھا :  
 ”خدا نخواستہ کس سلسلے میں پریشان ہیں ؟“  
 بولے ! ”ساتھ چلیں گے تو بتاؤں گا۔“

ہم پیچھے کو لوٹے اور وہ ہمیں جوتوں کی ایک دکان میں لے گئے۔ کہا :  
 ”بیوی کے لیے جوتا لینا ہے۔“  
 کچھ جوتے نکلوائے اور فرمایا :  
 ”بتائیے کون سا جوتا لوں ؟“

اس کا جواب تو مجھے بھی سوچنا تھا، لیکن میں دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ فرض مولانا نے ادا کیا اور کہا :

”اپنا کاسہ سر دیکھ کر لے لیجیے، بیوی کے جوتے کا اصل ناپ یہی ہے۔“  
 ملک صاحب جوں کہ خود بھی لطیفہ گو اور مزاح نگار تھے، اس سے انتہائی محفوظ ہوئے  
 اور پھر یہ لطیفہ انھوں نے باقاعدہ حوالے کے ساتھ آگے چلایا۔

۱۲۔ آج کل ”علاموں“ کی بہت کثرت ہے۔ ہر شخص ”علامہ“ بنا ہوا ہے،  
 علامہ فلاں اور علامہ فلاں۔ اسی قسم کے ایک ”علامہ“ کی بات ہوئی جو اذیت ناک حد  
 بے باک ہیں، تو فرمایا، یہ ع سے نہیں الف سے ”الائمہ“ ہیں — یعنی بہت زیادہ تکلیف  
 پہنچانے والے۔

۱۳۔ ایک دن ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر سراج منیر صاحب نے مولانا سے  
 پوچھا ”اگر مسجد کا امام گناہ گار ہو تو مقتدی کی نماز پر اس کا اثر پڑتا ہے یا نہیں ؟“ اس  
 وقت ایک شیعہ دوست بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا نے جواب دیا، ”ائمہ موصوم ہوتے ہیں۔“  
 ۱۴۔ ۱۹۵۷ء کے مئی میں تقریباً تمام رسائل و جرائد کے ۱۸۵۷ نمبر شائع ہوئے تھے،  
 اور ان میں ملک کے مشہور اہل قلم اور اصحابِ علم نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس  
 کے مجاہدین کے حالات و سوانح تحریر کیے تھے۔ میں نے بھی اپنے اخبار ”الاعتصام“ کا  
 ۱۸۵۷ نمبر شائع کیا تھا۔ میں مولانا غلام رسول فہر اور مولانا عبدالمجید سالک سے مضامین



لینا چاہتا تھا۔ مہر صاحب سے تو دو مضمون لے آیا۔ سالک صاحب مرحوم کے لیے میں نے مولانا ندوی سے عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم ان کے ہاں گئے تو چند اور حضرات بھی موجود تھے اور سالک صاحب پلنگ پر بیٹھے لکھ رہے تھے۔ حسبِ عادت نہایت تپاک سے ملے۔ حاضرینِ مجلس میں سے کسی صاحب نے سالک صاحب مرحوم سے کہا، ”مولانا! آپ پلنگ پر بیٹھ کر لکھتے ہیں، میز کرسی پر کیوں نہیں بیٹھتے؟“ سالک صاحب تو ابھی خاموش ہی تھے لیکن مولانا ندوی نے فوراً جواب دیا۔ ”ہر کرسی ایٹھواکام پلنگ پر ہوتا ہے۔“

یہ جواب سالک صاحب کے ذوقِ مزاح کے عین مطابق تھا، فرمایا :  
میں بھی یہی جواب دینا چاہتا تھا۔

### لطفے میں محاورے کا استعمال

مولانا ندوی بعض اوقات لطفے میں محاورے کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے چند دوستوں کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ مولانا بیمار تھے، لیکن میری درخواست پر تشریف لے آئے۔ کھایا کچھ نہیں۔ بیٹھے باتیں کرتے رہے اور ہنسنے رہے۔ آخر میں میٹھی دیش آئی تو فرمایا :

”میں طبیعت پر جبر کر کے آپ کو کھاتے ہوئے دیکھتا رہا، یہ کیا ہے؟“

عرض کیا ”کھیر ہے، کھایا لیجیے۔“

بولے ”اچھا کھا لیتا ہوں بشرطیکہ ٹیڑھی نہ ہو۔“

محاورے کا یہ بر محل استعمال لطف دے گیا۔

### لطفے میں فقہی اصطلاح

۳۰۔ جولائی ۱۹۸۴ کو واٹرڈا آڈیو ریم میں مولانا کے ساتھ جو ایک شام منائی گئی، اس میں غلطی سے جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کو دعوتی کارڈ نہ پہنچ سکا، حالانکہ ان کا نام دعویٰ کی فہرست میں شامل تھا۔ تقریب سے دوسرے دن قاسمی صاحب ہمارے دفتر تشریف لائے اور دوستانہ شکوہ کیا۔ اس کے بعد میں اور مولانا ندوی قاسمی صاحب کے پاس گئے ہیں

نے عرض کیا، یہ فقہی مسئلہ ہے کہ نمازیں ترک واجب ہو جائے تو سجدہ سہولازم آتا ہے۔ آپ کو دعوت دینا واجبات میں سے تھا اور غلطی سے یہ واجب ترک ہو گیا ہے، اب ”سجدہ سہو“ کے لیے آئے ہیں۔ مولانا نے فرمایا، یہ بات تو میں کرنا چاہتا تھا، جو آپ نے کر دی۔ قاسمی صاحب بولے۔ یہ آپ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

### بیوی قسم کی بیگم

ایک عید کے موقع پر ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سابق فیلو جناب شاہد حسین رزاقی صاحب اپنی مرحومہ بیگم کے ساتھ جن کا نام افسر بیگم تھا، مولانا کو عید کی مبارک باد دینے گئے۔ مولانا نے رزاقی صاحب کی بیگم سے کہا، ”ہماری بیگم تو بیوی قسم کی ہیں۔“ وہ مسکرائیں اور مولانا کی اہلیہ کے پاس چلی گئیں۔ فرمایا ”آپ بلائیں گی تو یہ بولیں گی ورنہ گفتگو پر خاموشی کو ترجیح دیں گی۔“

### دو مسئلے

ایک دن ہمارے ایک مرحوم دوست نے مولانا سے انارکلی میں دو مسئلے پوچھے۔ ایک یہ کہ ”سینما دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟“ مولانا نے جواب دیا، ”انارکلی میں گھومنا جائز ہے؟ جب کہ حدیث میں بازار کو جری جگہ قرار دیا گیا ہے۔“

دوسرا مسئلہ ”جو ان کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا تھا، یہ تھا کہ ”فلم ختم ہونے کے بعد پاکستان کا ترانہ پڑھا جاتا اور جھنڈا لہرایا جاتا ہے، اس موقع پر احتراماً کھڑا ہونا ضروری ہے؟“ ساتھ ہی فرمایا، ”لیکن میں کبھی کھڑا نہیں ہوا، اس لیے کہ میرے نزدیک کھڑا ہونا جائز نہیں۔“

مولانا نے جواب میں فرمایا، ”آپ کے نزدیک سینما دیکھنا جائز ہے؟ اگر سینما دیکھنا جائز ہے تو ترانہ پڑھنے اور جھنڈا لہرانے کے وقت کھڑا ہونا کیوں جائز نہیں؟“

ہمارے یہ مرحوم دوست دلچسپ آدمی تھے۔ ہمارا انارکلی میں روزانہ انتظار کرتے اور ہم ان کے پاس کچھ دیر بیٹھتے۔ ایک مرتبہ چائے بھی وہاں ہوتی۔ ان کو لطیفے سننے کی عادت تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عادت بھی تھی کہ آج ایک لطیفہ ہم سے سنا اور کل وہی

لطیفہ ہمارے سامنے اپنی طرف سے دھڑلے سے بیان فرما دیا اور ہمیں ”ان کا یہ لطیفہ“ بڑے شوق سے سننا بھی پڑتا اور اس پر مہنسنا بھی پڑتا۔ وہ یہ بھی فرماتے ”کیسا لطیفہ ہے“ ہم جواب میں کہتے بہت اچھا ہے۔

وہ (مرحوم) ہمارے مخلص دوست تھے۔ سیاسیات، اسلامیات، تاریخ اور علما کے واقعات و لطائف وغیرہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے۔ وہ ممکن کو ممکن، ملتوی کو ملتوی اور مذاق کو مذاق کہا کرتے تھے۔

### ملنا ”بصیرت“ پروگرام کا

لاہور میں ٹیلی ویژن سٹیشن قائم ہونے کے چند روز بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دن عشا کے قریب ہم دونوں بھاٹی دروازے کے باہر کھڑے تانگے کا انتظار کر رہے تھے جس میں سواری ہو کر مولانا کو اپنے گھر جانا تھا۔ اتنے میں مولانا نے مجھ سے کہا، وہ دیکھو ”دارالماہی“ کی چھت پر ٹیلی ویژن چل رہا ہے اور تصویریں حرکت کر رہی ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ٹیلی ویژن نہیں دیکھا تھا، بڑا حیران ہوا کہ یہ تصویریں کیوں کر بولتی اور حرکت کرتی ہیں۔ اس سے کچھ دن بعد ٹیلی ویژن والوں کی طرف سے مولانا کو ”بصیرت“ پروگرام کرنے کی دعوت دی گئی۔ ان دنوں سوموار کو ٹیلی ویژن میں چھٹی ہوتی تھی اور باقی چھ دنوں میں دو دن مولانا نصیر اجتہادی، دو دن مولانا کوثر نیازی اور دو دن مولانا حنیف ندوی بصیرت پروگرام کرتے تھے۔ مولانا ندوی کا پروگرام ہفتے اور اتوار کو ہوتا تھا۔ ان دنوں کسی پروگرام کی ریکارڈنگ نہیں ہوتی تھی، ہر پروگرام ڈائریکٹ کیا جاتا تھا۔ بصیرت پروگرام کا معاوضہ اس زمانے میں اڑتالیس روپے ملتا تھا۔

مولانا ندوی نے مجھ سے کہا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس پروگرام کا جو معاوضہ ملے گا، اسے جمع کرتا جاؤں گا اور اپنی بیٹی وردہ کی شادی پر خرچ کروں گا۔ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے، خدا کرے آپ اس فیصلے پر قائم رہیں۔ وردہ کی شادی تک تقریباً چار ہزار روپے جمع ہوئے۔ شادی اتوار کے دن ہوئی تھی۔ اس دن شادی سے فارغ ہو کر مولانا ٹیلی ویژن سٹیشن گئے اور پروگرام کیا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہوا کہ اس کے بعد

انہیں کوئی پروگرام نہ ملا۔ دو تین ہفتے اسی طرح گزر گئے تو میں نے عرض کیا :

”آپ کا بصیرت پروگرام بند کیوں ہو گیا؟“

پنجابی میں جواب دیا، ”ہن کسے ہوئے کڑی دا دیاہ کرنا ہووے گا۔“

مولانا کی یہ صاحبِ زادی اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان رہتی ہیں اور اشارہ اللہ چار

پانچ بچوں کی ماں ہیں۔

پروگرام بند ہونے کی وجہ

جی چاہتا ہے مولانا کا یہ پروگرام بند ہونے کی وجہ بھی بیان کر دی جائے تاکہ یہ واقعہ

بھی محفوظ ہو جائے۔

پروگرام بند ہونے کے ڈیڑھ مہینے بعد میں مولانا کوثر نیازی سے ملا اور ان سے پروگرام

بند ہونے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا ”مجھے کچھ پتا نہیں، میں خود حیران ہوں کہ ایسا کیوں

ہوا؟ لاہور کے متعلقہ حلقوں سے پتا کیا ہے، لیکن کوئی واضح بات معلوم نہیں ہو سکی۔

اب اسلام آباد جاؤں گا تو اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کروں گا۔“

اس سے دس بارہ دن بعد انھوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ ”آج شام چھ بجے انڈس ہوٹل

آئیے اور میرے ساتھ چائے پیچھے۔“

میں وہاں پہنچا تو وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ چائے کے دوران مجھ سے پوچھا :

”دو تین مہینے پہلے مولانا نے جمعیت اہل حدیث کی اس کانفرنس کی صدارت کی تھی جو

موچی دروازے کے باہر منعقد ہوئی تھی؟“

میں نے جواب دیا ”کی تھی۔ اُ“

کہا : ”ان کی صدارت میں جو قراردادیں منظور ہوئی تھیں حکومت کے نزدیک وہ سیاسی

نوعیت کی قراردادیں تھیں، اسی وجہ سے ان کا بصیرت پروگرام بند کیا گیا ہے۔“

یہ صدر ایوب خاں کا دورِ حکومت تھا، مولانا کوثر نیازی نے کہا : ”یہ بات ان کو خود

صدر ایوب کے دفتر سے معلوم ہوئی ہے۔“

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا ندوی کو جب جمعیت اہل حدیث کے بعض حضرات

نے کانفرنس کی صدارت کے لیے کہا تو مولانا نے مجھ سے مشورہ کیا کہ انھیں یہ صدارت قبول کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے؟ میں نے عرض کیا،

”بالکل نہیں کرنی چاہیے۔“

فرمایا: ”کیوں؟“

عرض کیا: ”اس لیے کہ علما کا ایک طبقہ بعض امور میں صدر کا حامی نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی مقرر تقریر میں بے قابو ہو جائے اور پھر اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلے۔“ میں نے یہ بھی کہا کہ مقرر کی زبان صدر جلسہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مقرر جوش میں آتا ہے تو ہوش کھو بیٹھتا ہے اور پھر اسے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔

بہر حال مولانا وعدہ کر چکے تھے، انھوں نے کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اس کے نتیجے میں ان کا بصیرت پروردگار بند ہوا، جو لوگ اس مفید پروگرام سے مستفید ہو رہے تھے، وہ ان کے افکار سے محروم ہوئے۔ لیکن جن لوگوں کی وجہ سے یہ پروگرام بند ہوا تھا، ان کو اس کا نہ علم تھا، نہ احساس۔

پڑھی نمازِ جنازہ ہماری غیروں نے

مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

مولانا بلاشبہ عالی دماغ اور بلند فکر عالم ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ جن معاملات سے متعلق میں نے ان کی رائے کے خلاف رائے ظاہر کی اور انھوں نے نہیں مانی، اس کا نتیجہ عام طور پر وہی نکلا جو میری رائے سے ہم آہنگ تھا۔

”کھدر کی گٹھری میں ریشمی رومال“

تقریر، تنقید اور مناظرے میں مولانا خوب چمکتے ہیں، اور بولتے ہیں تو خوب صورت الفاظ اور ادب سے بھرپور حملے خاص تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مقابلے میں اگر کوئی کھلے دل کا آدمی ہو اور ذوقِ سلیم رکھتا ہو تو وہ بھی خوش ہوتا ہے۔ ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ میں ایک مرتبہ بعض موضوعات پر مختلف اہل علم کے لیکچروں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مولانا ان دنوں بیمار تھے، لیکن اس کے باوجود لیکچروں میں شامل

ہوتے اور دوائیں ساتھ لے کر آتے۔ ایک موضوع مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو بھی دیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم اپنے رفقاء جماعت کے ساتھ تشریف لائے اور تقریر کی۔ لیکن بعض حضرات نے ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا۔ اختلاف کرنے والوں میں مولانا محمد حنیف ندوی بھی تھے۔ مولانا ندوی بیمار تھے، مگر زیر بحث موضوع سے متعلق اتنی مدلل تقریر کی کہ خود مولانا مودودی مرحوم نے اس کا اعتراف کیا اور فرمایا کہ مولانا ندوی میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مجھے فلسفے کے دقیق مباحث میں الجھا رہے ہیں۔

جلسہ ختم ہوا تو مولانا مودودی واپس جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھے اور کبھی کبھی لوگ ان کے ساتھ تھے۔ اتنے میں ان کی نظر مولانا ندوی پر پڑی، جلدی سے نیچے اترے اور مولانا کے پاس آئے۔ فرمایا:

”آپ تشریف لے جانا چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ چلیے“

مولانا ندوی نے کہا: ”آپ کے ساتھ تو بہت سے لوگ ہیں، میرے لیے کہاں گنجائش ہوگی؟“

مولانا مودودی نے فرمایا: ”کھدر کی گٹھڑی میں ریشمی رومال کے لیے ہر وقت گنجائش رہتی ہے۔“

مولانا مودودی مرحوم سے مجھے بھی چند لطیفے سننے کا موقع ملا ہے۔ مثلاً کوئی پنجابی دودھ والا آیا، دھوئی آیا، یا کوئی دکان دار آیا۔ مولانا کو اس نے کس طرح خطاب کیا اور اپنی ضرورت جن الفاظ میں بیان کی ان میں پنجابی کے لفظ کون سے تھے اور اردو کے کون سے۔! پھر ان الفاظ میں اپنی ضرورت کا اظہار کس لب و لہجے اور اسلوب میں کیا۔ مولانا نے اس کو کیا جواب دیا اور اس نے کیا اثر لیا۔ اس قسم کے لطیفے مولانا مودودی مرحوم نے ایک یا دو مرتبہ بڑا لطف لے کر بیان کیے۔ بعض واقعات کے سلسلے میں خود ان کا اسلوب بیان بھی لطیفے کے قالب میں ڈھل جاتا تھا۔

یہاں ان کا ایک لطیفہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جن صاحب کے بارے میں لطیفہ بیان ہوا ہے، ان کی ذہنی کیفیت کی پوری تفصیل اس میں موجود ہے۔ کئی سال کی بات ہے

ضلع فیصل آباد کی جماعت اسلامی کے ایک کن جو میر نے دوست ہیں، تشریف لائے۔ میں نے ان سے کہا :

”لاہور کب آئے؟“

بولے ”جماعت اسلامی کی میٹنگ تھی، اس میں شرکت کے لیے کل آیا تھا اور تم سے ملے بغیر جانا ممکن نہ تھا۔“

میں نے شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے۔ ”ایک لطیفہ سنو جو تمہیں سنانا ضروری ہے۔“

میں نے کہا ”ضرور سنالیے، لطیفہ سننا اور سنانا ہمارا پیشہ ہے۔“

بولے ”کل مولانا مودودی صاحب کی صدارت میں ہماری میٹنگ ہو رہی تھی کہ میاں طفیل محمد صاحب کسی کام کے سلسلے میں چند منٹ کے لیے میٹنگ سے اُٹھ کر باہر گئے۔ مولانا نے حاضرین سے فرمایا :

”جو صاحب ہنسنا چاہتے ہیں ہنس لیں، پھر میاں صاحب آجائیں گے اور ہنسی کا دروازہ بند ہو جائے گا۔“

ماسٹر طالع محمد کا خطبہ

مولانا ندوی کے طنے والوں میں ایک صاحب ماسٹر طالع محمد تھے۔ وہ عام طور پر مسجد مبارک میں جمعہ پڑھتے تھے اور مولانا کے مقتدی تھے۔ اب عرصے سے ان کے دیدار نہیں ہوئے۔ معلوم نہیں کس حال میں ہیں۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ انہیں خوش رکھے اور سفر آخرت اختیار کر گئے ہیں تو خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

وہ کسی مجلس میں ہوں، مسلسل باتیں کرتے جاتے تھے۔ وہ شنید کے قائل نہ تھے، گفت کے عادی تھے۔ جو شخص ان کے اڑنگے میں آ جاتا، اُسے آسانی سے چھوٹتے نہیں تھے۔ ایک مرتبہ مسجد مبارک میں نماز جمعہ کے بعد سید محمد طلحہ مرحوم ان کے قابو میں آ گئے۔ سید محمد طلحہ اور نیشنل کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور نہایت متین اور کم گو تھے۔ ہندوستان کے مشہور عالم و مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اقربا میں سے تھے، غالباً ان کے خالو ہوتے تھے۔ وہ نماز جمعہ مسجد مبارک میں ادا فرماتے تھے۔

ایک دن نماز جمعہ کے بعد ماسٹر جی کی نظر جو ان پر پڑی تو انھیں جا پکڑا۔ اب ماسٹر جی لہریں آکر بول رہے ہیں اور سید طلحہ قمر درویش برجان درویش سن رہے ہیں۔ کہیں کامہ اور کہیں فل سٹاپ نہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے عصر کی اذان ہو گئی۔ عصر کے بعد سید طلحہ مرحوم جو تا پکڑ کر مسجد سے باہر نکلنے لگے تو ماسٹر جی نے پھر آگھیرا اور ان کے ساتھ ہی چل پڑے۔ سید صاحب مرحوم بھائی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ماسٹر جی نے فرمایا: ”چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں“ چلتے چلتے بھائی دروازے آگئے۔ سید صاحب وہاں آکر رُک گئے کہ یہ جائیں تو وہ گھر کا رُخ کریں۔ لیکن ماسٹر جی کی رام کمانی ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ اب ماسٹر جی نے کہا، ”چلیے میں آپ کا گھر دیکھ آؤں“ بڑی مشکل سے چھ سات بجے سید صاحب کی جان بخشی ہوئی۔

اس کے بعد سید طلحہ مرحوم جمعہ کے لیے مسجد مبارک نہیں گئے۔ کسی نے پوچھا، ”آپ مسجد مبارک کیوں نہیں جاتے؟“ فرمایا ”وہاں ماسٹر طالع محمد کا پھیرا ہے۔“ ان ہی ماسٹر طالع محمد کے ہتھے ایک دن میں اور مولانا بھی چڑھ گئے۔ ہوا یہ کہ ہم دفتر سے نکلے اور بس سٹاپ پر پہنچے۔ جمعہ کا دن تھا۔ اتفاق سے ماسٹر طالع محمد بھی وہاں آگئے۔ انھوں نے جو باتیں کرنا شروع کیں، ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ایک بس آئی اور نکل گئی، دوسری آئی وہ بھی نکل گئی۔ تیسری بھی چلتی بنی۔ مولانا بھی پریشان اور میں بھی حیران۔ لیکن ماسٹر جی کو اس کا کچھ احساس نہیں ہے، وہ اپنی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ گھر جا کر روٹی بھی کھانی تھی اور پھر جمعہ بھی پڑھنا تھا۔ میں نے مولانا سے عرض کیا:

”جمعہ کا دن ہے اور جمعہ پڑھنا ہے، اب چلنا چاہیے“

فرمایا ”خطبہ ماسٹر جی کا سن لیا ہے، اب دو رکعتیں پڑھنی ہیں، کہیں جا کر پڑھ لیں گے“ مولانا اس قسم کے لوگوں کو ”سریش“ سے تعبیر کرتے ہیں، جو انسان کو چپک جاتے ہیں۔ ان کی ”سریشیت“ اور ”چپکیت“ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس انگلی سے اتاریں تو اس سے چپک جائیں گے اور اس سے اتاریں تو اس سے چپک جائیں گے۔

### قصہ ایک ڈاکٹر صاحب کا

ایک دن لاہور کے ایک بہت بڑے کالج کے ایک پروفیسر صاحب ہمارے دفتر



تشریف لائے۔ خیر سے وہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں اور اپنے شعبے کے صدر رہ چکے ہیں۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے نیاز مندانہ انداز میں مولانا سے سلسلہ گفتگو شروع کیا اور فرمایا :

”مولانا! ماشاء اللہ آپ ندوی ہیں؟“

جواب دیا: ”جی ہاں!“

”سید سلیمان بھی ندوی تھے؟“

”جی ہاں۔!“

”جعفر شاہ پھلواروی بھی ندوی تھے؟“

”جی ہاں!“

”رئیس احمد جعفری بھی ندوی تھے؟“

”جی ہاں!“

”سید ابوالحسن علی بھی ندوی ہیں؟“

”جی ہاں، وہ بھی ندوی ہیں۔“

چند اور ندوی حضرات کے بارے میں دریافت فرمایا، مولانا نے ”جی ہاں“ کہہ کر جواب دیا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا: ”ماشاء اللہ یہ خاندان کتنا خوش قسمت ہے کہ اس کا ہر فرد پڑھا لکھا اور بے حد لائق ہے۔ برصغیر کا کوئی خاندان علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف میں اس خاندان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

ان ہی ڈاکٹر صاحب کا ایک اور لطیفہ سنیے جو مولانا سے نہیں اس بندہ عاجز سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک دن میں دیگن میں سوار تھا اور دفتر جا رہا تھا کہ ایک سٹاپ سے یہ ڈاکٹر صاحب بھی میرے پاس ہی آکر تشریف فرما ہو گئے۔ — کہا

”السلام علیکم“

عرض کیا ”وعلیکم السلام“

فرمایا، ”آپ نے ”فقہائے ہند“ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ بہت سے معلومات پر مشتمل ہے۔ اردو میں اس قسم کی کوئی کتاب نہ تھی۔ یہ ایک تحقیقی کام ہے۔“  
میں نے اس حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کیا۔

فرمایا: ”آپ کا اسم گرامی؟“

عرض کیا ”محمد اسحاق بھٹی“

”ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ فقہائے ہند کی اب تک کتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔“  
عرض کیا، ”نوجلدیں۔“

ارشاد ہوا، ”یہ سلسلہ جاری رکھیے گا، اب تک جتنے فقہائے کرام پاک و ہند میں پیدا ہوئے ہیں، سب کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ اس کا اسلوب تحریر بہت اچھا اور بہت موثر ہے۔“  
”اسم گرامی؟“

پھر اپنا نام عرض کیا۔

فرمایا۔ ”المعارف کے ایڈیٹر بھی تو آپ ہی ہیں، میں ”المعارف“ باقاعدہ پڑھتا ہوں۔ اس میں بہت علمی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ میں بھی آپ کو مضمون بھیجا کروں گا۔“  
”اسم گرامی؟“

یہ درجہ بابتیں سن کر ارد گرد بیٹھے ہوئے بعض لوگ ہنسنا لگے۔ ایک صاحب تو کھٹکھٹا کر ہنس پڑے۔ اتنے میں ان کا کالج آگیا اور وہ دیگن سے اتر گئے۔ دس منٹ کی اس رفاقت میں انھوں نے ہماری بہت تعریف کی اور ساتھ ہی ہمیں بارہارا ”اسم گرامی“ دریافت فرمایا۔  
قصہ ایک وکیل صاحب کا

اسی طرح کا قصہ ایک وکیل صاحب کا سنیے جس میں مولانا نے خاص طور پر مجھے شامل کیا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم کی وفات کے بعد ایک صاحب نے جو وکیل بھی تھے اور اردو اور انگریزی کے رسائل و جرائد میں ماہر اللہ مضامین بھی لکھتے تھے، ادارہ ثقافت اسلامیہ کی ڈائریکٹر شپ کے لیے درخواست لکھی اور مرحوم جسٹس ایس اے رحمن صاحب کو ان کے مکان پر دستی دے کر آئے۔ اس کے بعد ہمارے دفتر تشریف لائے اور فرمایا:

”میں آپ کے ادارے کا ڈائریکٹر مقرر ہو جاؤں گا، اس لیے کہ میں اردو اور انگریزی میں مضمون بھی لکھتا ہوں اور وکیل کی حیثیت سے ایس۔ اے رحمن صاحب کی عدالت میں پیش بھی ہوتا رہا ہوں۔ انھیں میری صلاحیتوں کا علم ہے اور چونکہ وہ جج ہیں، اس لیے وکیل کو دوسرے لوگوں پر ترجیح دیں گے۔“ پھر فرمایا :

دیکھیے جناب! مجھے ڈائریکٹر بننے کی نہ خواہش ہے، نہ شوق۔ میری آمدنی اللہ کے فضل سے کافی ہے، میں نے تو ”اتامِ حجت“ کے لیے درخواست دی ہے — اس موقع پر ”اتامِ حجت“ کا لفظ سن کر مولانا نے ان سے پنجابی میں کہا: ”ستے خیراں نے، تئیں ضرور ساڈے ڈائریکٹر ہو جاؤ گے۔ تہاڈی قابلیت دے آدمی دی سانوں بہت ضرورت اے —“ پھر میری طرف متوجہ ہو کر مولانا نے کہا: ”کیوں مولوی اسحاق! انھان نوں ساڈا ڈائریکٹر بن جانا چاہیدائے نا؟“ میں نے عرض کیا ”ضرور بن جانا چاہیدا اے، بورڈ سے ممبر درخواست منظور کرن یا نہ کرن، میری رائے ایہ اے کہ ایہ ایتھے آکے ڈائریکٹر بن کے بہہ جان۔“

اس کے بعد اسی مجلس میں کسی اور صاحب کے بارے میں کوئی بات ہوئی تو یہی وکیل صاحب بولے: ”ان کے کیا کئے جی، وہ بہت فارسی وان ہیں —“ مولانا ”فارسی وان“ کے لفظ پر مسکرائے اور فرمایا: ”حضور! آپ ضرور یہاں آجائیں، یہاں جائے استاد خالیست والا معاملہ ہے۔“

وکیل صاحب مولانا کی حوصلہ افزائی سے خوش ہوئے، ان کا شکریہ ادا کیا اور کئی روز متواتر تشریف لاتے اور اپنے علمی کارناموں کی تفصیلات بیان فرماتے رہے۔

**لطیفے میں توارد**

بعض دفعہ لطیفے میں ”توارد“ ہو جاتا ہے، یعنی ایک ہی لطیفہ مجھے بھی سوچا اور مولانا کو بھی۔! اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ۱۹۶۷ء میں پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم (سابق دس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے ”ارمغانِ حالی“ کے نام سے کتاب لکھ رہے تھے۔ مولانا حالی نے ”الکاسبہ حبیب اللہ“ کے الفاظ کے بارے میں لکھا ہے

ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ حمید احمد خاں مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں؟ مولانا بھی موجود تھے۔ حمید احمد خاں مرحوم کی اس کتاب کے کاتب کا نام اتفاق سے حبیب اللہ تھا۔ میں نے عرض کیا، ”الکاتب حبیب اللہ“ تو صحیح نہیں، البتہ ”الکاتب حبیب اللہ“ بالکل صحیح ہے۔

مولانا نے فرمایا: یہی لطیفہ مجھے سوچھا تھا۔ خاں صاحب نے لقمہ دیا، ”لطیفے میں تو ارد ہو گیا ہے“

### تاریخ سے عدم دلچسپی

مولانا کو علم تاریخ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ تاریخ سے متعلق ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ ہر دور میں اپنی مصلحتوں کے مطابق بنائی جاتی ہے۔ اس کی وہ مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن مولانا کا یہ نقطہ نظر تاریخ کے ہر مسئلے کے متعلق صحیح نہیں ہے۔

### قلمی کتابیں

اسی طرح پرانی قلمی کتابوں سے بھی مولانا کو رغبت نہیں ہے بلکہ ان پر کام کرنے والوں کا بعض اوقات مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ کتابیں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتیں تو اب تک چھپ جاتیں، قلمی صورت میں باقی نہ رہتیں۔

۴۱۔ ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ میں ”برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ“ کے نام سے کتاب لکھ رہا تھا۔ یہ کتاب علم فقہ کی بعض ان مشہور کتابوں کے تعارف اور تجزیے پر مشتمل ہے جو برصغیر پاک و ہند میں لکھی گئیں اور قلمی یا مطبوعہ شکل میں مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں میرا زیادہ وقت پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور لاہور کی بعض دوسری لائبریریوں میں صرف ہوتا تھا۔ میں دفتر آتا تو مولانا جعفر شاہ پھلواڑی مرحوم اور مولانا حنیف ندوی از راہ مذاق مجھ سے پوچھتے، آج کتنی قلمی کتابوں کی گرد جھاڑی؟ کتنی کتابوں کے سوراخ گئے؟ کتنی کتابوں کے پٹھے ہوئے اور بوسیدہ اوراق کا شمار کیا؟ کتنے مخطوطے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا؟ ایک دن میں نے کہا کہ یہ مخطوطات کیا ہیں، ”مخطوطات“ ہیں۔ اور پھر لفظ ”مخطوطہ“ کو ”مخبوطہ“ میں بدل دیا گیا۔ مثلاً گون کون سا ”مخبوطہ“ دیکھا اور مخبوط الحواس ہوئے۔

لفظ ”مخطوط“ میری زبان پر بھی چڑھ گیا۔ اس زمانے میں ہمارے ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام تھے۔ انہی نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا اور یہ ان کی دلچسپی کا موضوع تھا۔ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا مخطوطات کی ورق گردانی کے سلسلے میں اپنی ”فتوحات“ بیان کر رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر میرے منہ سے ”مخطوط“ کی بجائے ”مخطوطہ“ نکل گیا۔ اس غلطی کا مجھے فوراً احساس ہو گیا اور اکرام صاحب بھی چونکے۔ پھر منے اور بولے ”آپ نے بالکل صحیح کہا، یہ ”مخطوطہ“ ہی ہے اور انسان ان کو دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے واقعی مخطوط الحواس ہو جاتا ہے“ یہ لطیفہ میں نے مولانا کو اور شاہ صاحب کو سنایا اور اس کے بعد باقاعدہ ”مخطوطہ“ چل نکلا۔

جب میری یہ کتاب ”برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ“ چھپ کر آئی تو مولانا نہایت خوش ہوئے، مجھے مبارک باد سے نوازا اور کندھے پر ہاتھ پھیر کر ”اشیر باد دی“ اور فرمایا ”ہم تو آپ کا مذاق اڑاتے تھے، یہ تو بہت عمدہ کتاب ہو گئی ہے۔“ میں نے عرض کیا، پنجابی محاورے کے مطابق ”ہا سے دا منڈا سا“ ہو گیا ہے۔ فرمایا، بالکل ایسا ہی ہوا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولانا قلمی کتابوں کو اگرچہ زیادہ اہمیت نہیں دیتے، لیکن اگر سلیقے سے ان پر کام کیا جائے تو مسرت کا اظہار فرماتے ہیں۔

### ایک پادری صاحب کا واقعہ

بعض مسائل میں مولانا انتہائی متشدد ہیں اور یہ تشدد بالکل صحیح ہے۔ مثلاً مسئلہ توحید کے بارے میں ان کے احساسات نہایت نازک ہیں۔ اس موضوع پر انہوں نے اپنی بعض کتابوں میں تفصیل سے لکھا ہے اور یہ اسلوب جدید لکھا ہے۔ یہ ان کا ایسا موضوع ہے، جس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل بیان ہے۔ ۱۹۸۱ میں مولانا سخت بیمار پڑ گئے بہت علاج کرائے مگر افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر بعض دوستوں کے مشورے سے یو، سی، ایچ (یونیٹڈ کرسمین ہسپتال) لاہور میں داخل ہو گئے۔ میں دوسرے یا تیسرے دن مزاج پُرسی کو جاتا، ایک دن ہسپتال کے پادری صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے مولانا سے خیریت پوچھی تو آپ نے فرمایا، ”دعا کریں“۔ دعا کی درخواست ایک عام سی بات ہے اور رملین ہر عیادت

کرنے والے سے کرتا ہے، لیکن پادری صاحب نے اس کو واقعی ”دعوتِ است“ پر محمول کیا اور ہاتھ اٹھا کر اپنے خاص الفاظ میں دعا فرماتا شروع کر دی۔ ”اے خداوندِ یسوع مسیح اس مریض کو...“ پادری صاحب ابھی دعائیہ جملہ مکمل نہیں کر پائے تھے کہ مولانا بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا، ”بس اس سے آگے کچھ نہ کہیے گا۔ میں ایسی دعا نہیں کرانا چاہتا جس میں غیر اللہ کو پکارا جائے۔“

پادری صاحب نے جواب دیا ”خداوند اور یسوع مسیح تو ایک ہی ہیں۔“ فرمایا۔ ”آپ انھیں ایک سمجھتے رہیے، میرے لیے اُن کے دروازے پر دستک نہ دیجیے۔ میں اس زندگی پر جو غیر اللہ سے مانگی جائے، اس موت کو ترجیح دیتا ہوں جو اللہ کو پکارتے ہوئے آئے۔ تمام عمر سب کچھ اللہ سے مانگا، اس عمر میں یسوع مسیح سے مانگنے لگوں، یہ ممکن نہیں۔“

پادری صاحب نے تثلیث کے بارے میں مولانا سے کچھ کنا چا ہا تو فرمایا :  
 ”میں یہ سب باتیں جانتا ہوں اور آپ سے زیادہ جانتا ہوں، مجھے سمجھانے کی تکلیف نہ کریں، افسوس ہے بیماری کی وجہ سے زیادہ بول نہیں سکتا، ورنہ اثباتِ توحید اور تردیدِ تثلیث پر ضرور گفتگو کرتا۔“

پادری صاحب خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد وہ آتے اور سلام تو کرتے رہے لیکن اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی۔

تفسیر ”ترجمان القرآن“ کی تیسری جلد

مولانا کی فراوانی علم اور وسعت معلومات کا ان سے ملنے والے تمام اصحابِ علم کو اعتراف ہے۔ جن حضرات کو ان کے درسِ قرآن میں شرکت کے مواقع میسر آئے ہیں، وہ ان کی قرآن فہمی اور علومِ قرآن سے ان کے گہرے شغف و تعلق سے خوب آگاہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ مولانا تمام امور سے منقطع ہو کر اپنے آپ کو خدمتِ قرآن کے لیے وقف کر دیں۔ اس کا اظہار مجھ سے بھی اور خود مولانا سے بھی متعدد حضرات نے کئی مرتبہ کیا۔ مولانا کے دوستوں میں سے اکثر بزرگ میرے اور مولانا کے باہمی تعلقات سے باخبر ہیں، اس لیے زیادہ تر مجھ

ہی سے کہتے ہیں کہ میں مولانا سے تفسیر قرآن کی خدمت انجام دینے کے لیے عرض کروں۔ ہمارے ایک بزرگ اور مشفق دوست ملک حسن علی جامعی ہیں جو شرق پور میں اقامت گزیں ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ دہلی کے فارغ التحصیل ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ نئے دور کے احباب سے ان کا تعارف اس طرح کرایا جائے گا کہ وہ جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک اور میو ہسپتال (لاہور) کے مشہور ڈاکٹر پروفیسر محمود علی ملک کے والد محترم ہیں۔ پہلے بیٹوں کا تعارف باپ کے نام سے کرایا جاتا تھا، اب باپ کا تعارف بیٹوں کے نام سے کرایا جا رہا ہے۔ میں ملک صاحب سے کہا کرتا ہوں، آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے دونوں بیٹے ڈاکٹر ہیں، ایک علم کا ڈاکٹر اور ایک جسم کا۔ علم اور جسم کا آپس میں گہرا تعلق ہے جو آپ نے اپنے گھر میں قائم کر رکھا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، میں ملک صاحب سے ملاقات کے لیے شرق پور گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے، حسبِ عادت بڑی خاطر مدارت کی اور فرمایا:

”میں تمہیں کئی دنوں سے بہت یاد کر رہا تھا۔“

عرض کیا ”کوئی خاص بات تھی؟“

بولے ”ہاں، خاص بات تھی۔“

فرمایا ”ہماری علمی تاریخ میں متعدد ایسے اہل علم گزرے ہیں جنہوں نے کوئی تصنیفی کام شروع کیا، لیکن کسی وجہ سے اسے مکمل نہ کر سکے اور وفات پا گئے۔ ان کا یہ نامکمل کام ان کے کسی لائق شاگرد یا کسی اور لائق عالم نے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض حضرات کے مکمل کام پر بذیول لکھی گئیں اور اس طرح اسے آگے بڑھایا گیا۔“

اس کے بعد ملک صاحب نے کہا، یہ تمہید میں نے یہ کہنے کے لیے باندھی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے تفسیر ترجمان القرآن کے دو حصے لکھے جو سورہ مومنوں تک تقریباً ساڑھے

اٹھ چند برس پیشتر آزاد سائنس کیمڈی دہلی سے ترجمان القرآن کی جو دوسری جلد شائع ہوئی ہے، اس میں سورہ نور بھی شامل ہے۔ سورہ نور کا مسودہ مولانا کی وفات کے بعد ان کے کاغذات سے ملا ہے جو شاملِ اشاعت کر دیا گیا ہے۔

سترہ پاروں پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد کسی وجہ سے آگے کام نہ ہو سکا یا ہوا تو چھپ نہ سکا اور ضائع ہو گیا۔ اب سورۂ نور سے آخر قرآن تک تفسیر لکھنی چاہیے اور میرے نزدیک اس کے لیے موزوں ترین آدمی مولانا حنیف ندوی ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی عالم یہ کام نہیں کر سکتا۔ انھیں تمام علمی کام چھوڑ کر یہ کام کرنا چاہیے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے کرنا چاہیے۔

ملک صاحب نے کہا کہ یہ بات بہت دنوں سے میرے ذہن میں گھوم رہی ہے اور میں چاہتا تھا کہ تم سے ملاقات ہو تو اس کا ذکر کروں اور کہوں کہ مولانا کو تفسیر ترجمان القرآن کی تکمیل پر آمادہ کرو۔

ملک صاحب کے توجہ دلانے پر یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی اور آتے ہی مولانا کے گوش گزار کی اور ملک صاحب کی تجویز کی تائید بھی کی۔ اس کے بعد بعض حضرات کی معرفت ملک صاحب کے پیغام بھی آئے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اپنے طور پر مجھے یہ بات کہی لیکن مولانا نے فرمایا، ایک تو اس بہت بڑے کام کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے، دوسرے سورۂ نور اور اس کے بعد کی سورتوں کے مسائل خاص اہمیت کے حامل ہیں، معلوم نہیں مولانا آزاد کے ذہن میں کیا باتیں تھیں اور وہ کس طرح ان مسائل کی توضیح و تبیین سے عہدہ برآ ہونا چاہتے تھے۔

### قصہ میرے فلسفہ پڑھنے کا

ان سطور کے راقم عاجز کو مولانا نے بہت کچھ سکھایا اور اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ تاہم مجھے اپنی کم فہمی کا اعتراف ہے کہ بعض چیزیں بالکل نہیں سیکھ سکا، حالانکہ مولانا نے سکھانے کی انتہائی کوشش کی، مثلاً علم فلسفہ۔ افسوس ہے، میں یہ علم نہ سیکھ سکا۔ مولانا فلسفی ہیں، بار بار فرمایا کہ تھوڑا بہت فلسفہ پڑھ لو، یہ علم بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ اس سے فکر میں وسعت پیدا ہوتی ہے، ذہن میں توانائی آتی ہے، سوچ بچار کی نئی نئی راہیں انسان کے سامنے کھلتی ہیں، قول و فعل میں اعتماد پیدا ہوتا ہے، نظروں بصر کے زاویے بدلتے ہیں، فہم و فراست آسودگی سے ہم کنار ہوتے ہیں، وسوس و اوہام



کا نور ہو جاتے اور شکوک و شبہات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور انسان یقین بلکہ حق یقین کی منزل کو پالینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مولانا نے کئی بار علمِ فلسفہ کے یہ اور اس قسم کے اور بہت سے فوائد بیان فرمائے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑے فوائد ہیں اور ان کے حصول کے لیے کوشاں ہونا ہر شخص کا فرض ہے۔ چنانچہ ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ فلسفہ ضرور پڑھوں گا اور ان فوائد سے بہرہ مند ہونے کی بہر حال کوشش کروں گا۔ عرض کیا۔

”فرمائیے، فلسفہ سیکھنے کے لیے کون کون سی کتابیں پڑھی جائیں۔“

میرے اس حتمی فیصلے سے مولانا خوش ہوئے۔ مجھے خاص طور سے چلے پلائی اور ازراہ شفقت پڑھنے کے لیے کچھ کتابیں بتائیں، اور پھر میں نے اپنے طور پر وہ کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔

کچھ دنوں بعد مولانا نے پوچھا

”فلسفہ پڑھ رہے ہو؟“

عرض کیا: ”بڑی محنت سے پڑھ رہا ہوں۔“

فرمایا: ”ذہن میں کچھ تبدیلی آئی؟“

عرض کیا، ”بہت آئی۔ ماشاء اللہ ذہن روز بروز صاف ہو رہا ہے، قولِ فعل

میں اعتماد پیدا ہو گیا ہے اور بہت سی نئی باتیں سو بھنے لگی ہیں۔“

فرمایا، ”کچھ پوچھوں، بتاؤ گے؟“

پورے اعتماد سے عرض کیا: ”ضرور پوچھیے، لازماً بتاؤں گا۔“

فرمایا، ”بتاؤ مشائینِ فلسفی کون ہوتے ہیں؟“

چوں کہ قولِ فعل میں اعتماد پیدا ہو چکا تھا اور نئی نئی باتیں ذہن و فکر میں چلنے لگی

تھیں، لہذا پورے ذوق سے جواب دیا:

”علم صرف کی رو سے یہ بابِ مشیٰ میشیٰ ہے اور رمیٰ یرمیٰ کے وزن پر ہے۔ اس

کا مادہ یعنی روطِ مشیٰ (مشیٰ ی) ہے، جس کے معنی ہیں پیدل چلنا۔ مشائینِ مبالغہ کا

صیغہ ہے اور اس کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے بہت زیادہ پیدل چلنے والے۔

یعنی وہ فلسفی جو بے چارے غریب ہیں، جن کے پاس سواری نہیں ہے اور پیدل چلتے ہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے میں نے کہا، ”مثلاً آپ مشائین فلسفیوں میں سے ہیں، جن کے پاس کمیں آنے جانے کے لیے سواری نہیں ہے۔“

میں نے بتایا ”اس کے برعکس ”راکبیں فلسفی“ ہیں جو کاروں اور موٹروں پر سوار ہوتے ہیں۔ مزید عرض کیا، ”کچھ طاہرین فلسفی“ ہیں جو ہوائی جہازوں میں سفر کرتے اور فضاؤں میں اڑتے ہیں۔“

مشائین فلسفیوں کی یہ تعریف یعنی ڈیفینی نیشن سن کر مولانا نے میری طرف دیکھا اور اس طرح مُسکرائے جیسے کچھ مایوس ہو گئے ہوں۔ فرمایا ”آپ فلسفہ نہیں پڑھ سکتے، یہ آپ کا موضوع نہیں ہے۔“

مولانا کا یہ فرمان میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔ میں نے ہر لفظ کا صحیح ترجمہ کیا تھا اور ہر بات سوچ سمجھ کر بیان کی تھی، لیکن اس کے باوجود مولانا نے میری حوصلہ شکنی کی، ظاہر ہے مجھے اس سے سخت ذہنی اذیت ہوئی۔

پھر فرمایا: ”اچھا بتاؤ اشراقی فلسفی کون ہوتے ہیں؟“  
عرض کیا یہ لفظ ”اشراقی“ (نقٹوں والے قاف سے) ہے یا ”اشراقی“ (بغیر نقٹوں والے قاف سے)؟

فرمایا ”یہ بھی آپ ہی بتائیں۔“

میں نے اپنے ”علم“ کے تمام پہلوؤں کو مجتمع کر کے عرض کیا: ”اگر یہ لفظ بغیر نقٹوں والے قاف کے ہے تو اس کا مادہ ”شُرک“ ہے، یعنی وہ فلسفی جن کا شیدہ شرک کرنا اور غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ فلسفی ہوں جو دوسروں کو اپنے علم میں شریک کرتے ہیں۔ اور اگر یہ نقطوں والے قاف سے ہے تو اس کا مطلب ہے وہ فلسفی جو مشرقی جانب کے علاقوں یا شہروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی موٹی اور عام فہم مثال یہ ہے کہ جو فلسفی جھنگ کے رہنے والے ہیں ان کے نزدیک فیصل آباد کے فلسفی اشراقی قرار پائیں گے اور جو فیصل آباد میں مقیم ہیں ان کے حساب سے شیخوپورہ کے فلسفی

اشراقی ہوں گے، جو شیخ پورہ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ لاہور کے فلسفیوں کو اشراقی کہیں گے اور لاہور والے قصور کے فلاسفہ کرام کو اشراقی سے تعبیر کریں گے، علیٰ ہذا القیاس — پھر عرض کیا، اس سے وہ فلسفی بھی مراد ہو سکتے ہیں جو باقاعدہ اشراق کی نماز پڑھتے ہوں۔ افسوس ہے مولانا نے اس سے بھی اتفاق نہ کیا اور صاف لفظوں میں فرمایا کہ ”آپ سے فلسفہ پڑھنے اور سمجھنے کی بالکل توقع نہیں۔“ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ میری ساری محنت اکارت گئی اور میں یالوسی کے عالم میں سر نیچا کر کے بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کہ گرامر کے نقطہ نظر سے میرے تمام جواب صحیح ہیں، لیکن مولانا معلوم نہیں کیا چاہتے ہیں۔ یا تو میں انھیں اپنی بات سمجھا نہیں سکا یا یہ مجھے فلسفی کی حیثیت سے برداشت نہیں کرنا چاہتے۔

پھر فرمایا: ”آپ کو یاد ہے آپ نے ابھی ایک لفظ ”فلاسفہ“ بولا ہے یعنی ”فلاسفہ کرام“ کہا ہے۔“

میں نے سر اٹھا کر کہا: ”جی ہاں، میں نے ”فلاسفہ کرام“ کہا ہے۔“

فرمایا: ”اس سے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے“

میں نے چہرے پر مسرت کے آثار طاری کرتے ہوئے پوچھا ”کیا؟“

فرمایا: ”آپ کو معلوم ہے انسان پر کھانے پینے کا بھی اثر پڑتا ہے؟“

عرض کیا ”جی ہاں، میں نے حکیموں اور دانش مندوں سے سنا ہے، وہ کہتے ہیں، ثقیل چیز کھائی جائے تو معدہ بوجھل ہو جاتا ہے اور وہ جلدی مضیم نہیں ہوتی۔ نرم غذا کھانے سے معدہ ہلکا رہتا ہے اور وہ زود مضیم ہوتی ہے۔“

فرمایا: ”بالکل ٹھیک ہے۔“

میں اور خوش ہوا اور کان مولانا کے قریب کر لیے۔

فرمایا: ”میری طرف دیکھو اور غور سے سنو مجھے آپ کے لفظ ”فلاسفہ“ کہنے سے یاد آیا، آپ معجون فلاسفہ کھانا شروع کر دیں، شاید اللہ کرم کرے اور آپ فلسفی ہو جائیں۔“

میں خوشی سے اچھل پڑا، عرض کیا: ”ہمدرد و اخلائے کی کھاؤں یا دو خانہ حکیم اجمل خاں کی؟“

فرمایا: ”اس کی کوئی شرط نہیں ہو جلتی ہے کھاؤ۔ اچھی ہوگی تو جلد اتر ہوگا، اچھی نہ ہوگی تو اثر میں کچھ دیر لگے گی۔“

اس کے بعد حکم ہوا: ”اب جاؤ، اللہ کے گھر میں کیا کمی ہے، ممکن ہے اسی طرح ہماری دیرینہ خواہش پوری ہو جائے۔“

مگر یہ نسخہ بھی کارگر نہ ثابت نہ ہوا اور کیر، فلینے سے محروم ہی رہا۔ مولانا نے اس کے جو لیے چوڑے فوائد بیان فرمائے تھے، چاہتا تھا ان سے بہرہ مند ہو جاؤں مگر وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری اور اندر ہی اندر فلسفی بننے کی کوشش کرتا رہا جس کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ فلاسفہ متقدمین کا وہ گروہ جو کثرتِ ریاضت سے اپنی باطنی قوتوں کو جلا دیتا اور مراقبہ و مکاشفہ کا قائل ہے، اشراقیین کہلاتا ہے، افلاطون اور بقراط کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے، مشہور بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردی بھی اشراقی فلسفی تھے۔ اس کے برعکس جو فلسفی ارسطو کے متبع ہیں انھیں مشائیین کہا جاتا ہے۔

## قصہ ہوٹلوں کا اور زمانہ کرامتوں کے ظہور کا

۱۹۵۲ء میں مولانا گوجرانوالہ سے مستقل طور پر لاہور آ گئے۔ میں ان دنوں اخبار ”الاعتصام“ کا ایڈیٹر تھا اور الاعتصام گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ اب ہماری سہمہ وقتی ملاقاتوں کا سلسلہ تو باقی نہ رہا البتہ روزانہ شام کو ملاقات کا پروگرام طے کر لیا گیا اور پھر ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء یعنی ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے میرے منسلک ہونے تک کم و بیش تیرہ سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء سے شام کی ملاقاتیں ختم ہو گئیں، کیوں کہ روزانہ دفتر میں ملاقات بھی ہو جاتی ہے، علمی باتیں بھی ہو جاتی ہیں اور لطائف و ظرائف کا دور بھی چلتا رہتا ہے۔

لاہور میں میرا دفتر شیش محل روڈ پر تھا اور قیام بھی وہیں ایک کمرے میں تھا، جس میں میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے بعد جب بچوں کو یہاں لے آیا تو پہلے بھائی دروازے میں اور پھر دوہاری دروازے میں کرائے کا مکان لے لیا۔ مولانا کا قیام ابتدا میں کچھ دن رنگ محل رہا اور پھر رنگ

چوک بھونڈ پورہ میں منتقل ہو گئے۔ یہ بھی ایک لطیفہ ہی سمجھئے کہ شروع شروع میں لفظ ”بھونڈ پورہ“ مولانا کی زبان پر نہیں چڑھتا تھا اور یوں بھی یہ لفظ بولنے سے انھیں عجیب سا احساس ہوتا تھا اور اگر میری موجودگی میں کوئی صاحب ان سے گھر کا پتا پوچھتے تو یہ میری ڈیوٹی تھی کہ انھیں مکان کا نمبر، گلی، محلہ اور چوک وغیرہ بتاؤں یا لکھ کر دوں۔ اب ستمبر ۱۹۸۴ء میں مولانا نے کم و بیش تیس سال بعد بھونڈ پورے والا مکان چھوڑ دیا ہے اور الحمد کالونی (اقبال ٹاؤن) چلے گئے ہیں، الحمد للہ علیٰ ذلک

اس زمانے میں ہمارا یہ معمول تھا کہ مغرب کے بعد مولانا گھر سے پیدل چل پڑتے اور میں مغرب کی نماز دہلی مسلم ہوٹل کی مسجد میں پڑھتا اور پھر انارکلی سے ہوتا ہوا مال روڈ پر آجاتا اور ریگل کی طرف چل پڑتا۔ کبھی تو مولانا انارکلی میں مل جاتے اور کبھی مال روڈ پر ”ناکرا“ ہو جاتا۔ پھر ہم اکٹھے انارکلی کا چکر لگا کر کسی ہوٹل میں جا بیٹھتے۔

ان دنوں نظام ہوٹل کے دروازے سے متصل ہمارے ایک دوست حاجی محمد اححاق حنیف مرحوم کی دکان تھی۔ ان کو بھی ہمارا انتظار رہتا۔ ایک بیٹھک اور چائے وہاں بھی ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم سب مال روڈ کے کسی ہوٹل میں چلے جاتے اور پھر حاجی صاحب اپنی گاڑی میں ہمیں اپنے اپنے گھروں میں چھوڑ جاتے۔ لیکن حاجی صاحب مرحوم کے ہاں جانے اور بیٹھنے کے باوجود میرا اور مولانا کا کسی ہوٹل میں جانا، وہاں چائے پینا اور باتیں کرنا روزمرہ کے فرائض میں داخل تھا۔ ہوٹل میں کم از کم ایک گھنٹے کی نشست رہتی۔ اس دوران ہم بلا شرکت غیرے راز و نیاز کرتے۔

شرکتِ غیر کی نہیں چاہتی غیرتِ میری

مولانا کی واپسی اس طرح ہوتی کہ کبھی تو مال روڈ کی طرف سے پیدل جاتے اور میں انھیں ریگل چوک تک چھوڑ آتا۔ کبھی بھاٹی دروازے آجاتے اور وہاں سے تانگے میں سوار ہو کر جناز گاہ سے تھوڑا آگے سعدی پارک (روڑاں والا چھپر) جا اترتے اور وہاں سے گھر پہنچ جاتے۔ کبھی پرانی انارکلی یعنی لٹن روڈ اور نابھہ روڈ کے چوک سے تانگے پر بیٹھتے اور سعدی پارک جا اترتے۔

یہ ہمارا روزِ کارِ معمول تھا جو تیرہ سال بالالتزام جاری رہا۔ کسی سخت مجبوری کی بنا پر ہم میں سے کوئی نہ آسکتا تو یہ الگ بات تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی پہلے ہوٹل پہنچ جاتا تو دوسرے کا بے تابی سے انتظار کرتا۔ یوں سمجھیے کہ :

جھنناں نوں تانگھ سجتاں دی

لک بنھ پتیاں تے کھڑیاں

اس زمانے میں ہمارا ”من تو شدم، تو من شدی“ کا سا معاملہ تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی تنہا کسی دوست کو مل جاتا تو وہ حیران ہو کر پوچھتا کہ خیریت تو ہے آج آپ تنہا ہیں۔ ایک دن میں نوہاری دروازے کی طرف سے انارکلی میں داخل ہوا کہ مولانا کو خریداری مل گئے۔ کہا، ”آج آپ اکیلے جا رہے ہیں، دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟“ اتفاق سے سامنے سے مولانا آرہے تھے۔ میں نے کہا، ”وہ دیکھیے آرہے ہیں۔“ کہا ”میں آپ میں سے کسی ایک کو تنہا دیکھتا ہوں تو فوراً خیال گزرتا ہے کہ دوسرے ساتھی خدا نخواستہ کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہوں۔“

روزانہ کی کم سے کم ایک گھنٹہ کی نشست کے لیے ہم نے سب سے پہلے انارکلی میں ایک ہوٹل کا انتخاب کیا۔ یہاں سے ہماری زندگی کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوتا ہے جو ہوٹلوں کے سلسلے میں اپنے اندر کچھ ”اولیائی“ اور ”کرامات“ لیے جوتے ہے۔ ہماری یہ کوشش ہوتی کہ ہوٹل کے ہال کمرے کی درمیانی میز پر بیٹھا جائے تاکہ انارکلی سے گزرنے والوں کو آسانی سے دیکھ سکیں۔ اس میں ایک بنیادی فائدہ یہ ملحوظ خاطر تھا کہ مولانا کے پیشاب کے لیے غسل خانہ بالکل قریب تھا، دُور جانے کی رحمت نہیں اٹھانا پڑتی تھی۔ چائے سے پہلے بھی عملِ پیشاب سے گزرنا یعنی ”فارغ البول“ ہونا ضروری تھا۔ اس کو چائے پینے کا ”اجازت نامہ“ بھی کہا جاسکتا ہے۔ پھر چائے کے بعد تو اس عمل کو ”دُوب“ کا درجہ حاصل تھا، اس کو ہماری اصطلاح میں ”جواب چائے“ کہا جاتا تھا۔

ہم نے اپنے حلقہٴ احباب میں اعلانِ عام کر دیا تھا کہ ہم مغرب کے بعد اتنے بجے سے اتنے بجے تک انارکلی کے فلاں ہوٹل میں باقاعدہ بیٹھتے ہیں، ہمارے ملنے والے وہاں تشریف

لاکر بہ یک وقت تین فائدے حاصل کریں۔ ایک ہم سے ملاقات کا، دوسرا ہمارے ساتھ چائے نوش فرمانے کا اور تیسرا انارکلی کی سیر سے لطف اندوز ہونے کا۔

بارش ہو یا آندھی ہم اس ہوٹل کے مستقل گاہک تھے۔ اس کے مالک اور کارکن ہمارا بہت احترام کرتے تھے اور جب ہماری جیب ”خلیفۃ المسلمین“ کا نمونہ پیش کرتی تو اس وقت بھی ہمیں وہاں تمام سہولتیں حاصل ہوتیں، یعنی ہر حالت میں ہمارے ساتھ ”وی آئی پی“ کا سلوک کیا جاتا۔ اس سے ہمارے بعض دوست کئی قسم کے ”استغنائے“ فرمانے لگے تھے۔ وہ ہمارے ہوٹل میں آنے سے پہلے یا بعد میں تشریف لاتے، چائے پیتے یا کھانا کھاتے اور ہل ہمارے کھاتے میں ”جمع“ کرا دیتے۔ یعنی اس طرح ہمارا کھانا ”کھوہ کھانا“ بھی ہو گیا تھا۔ ہوٹل والے ہمیں بتا دیتے کہ فلاں فلاں اصحاب آئے تھے۔ ہم نے ان دوستوں کو ”مستحقین“ کے زمرے میں شامل کر رکھا تھا۔

اس ہوٹل میں کھانے پینے والے کافی لوگ آتے تھے۔ اوپر رہائشی کمرے تھے۔ کچھ عرصے بعد ہم نے دیکھا کہ ہوٹل کی رونق کا سایہ سمٹنے لگا ہے اور معاملہ روز بروز گرگوار ہوتا جا رہا ہے۔ اس زمانے میں ہم زیادہ تر مسجد مبارک میں جمعہ پڑھتے تھے، وہاں میاں محمود علی قصوری باریٹ لاکے برادرِ کبیر مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینڈب مرحوم و مغفور خطبہ دیتے اور نماز جمعہ پڑھاتے تھے۔ ایک دن جمعہ پڑھ کر ہم چائے کے لیے سیدھے اپنے ہوٹل گئے۔ دیکھا کہ وہاں پولیس کی نقل و حرکت بڑی تیز ہے۔ ہم نے چائے پی اور سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔ مولانا نے آہستہ سے کہا آئندہ ہمیں اس ہوٹل میں نہیں آنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ خواہ مخواہ دھریے جائیں۔ پھر مسکراتے ہوئے فرمایا، ”آپ کی تو کوئی ایسی بات نہیں، مجھے لوگ کہیں گے کہ اس عمر میں با بے کو کیا ہو گیا ہے“

بہر حال ہم ہوٹل میں آنے لگے تو اس کے گاہک گھٹنا شروع ہو گئے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پنجابی ضرب المثل ”حویلی میںیں باقر دی دوج جالو اگر دی“ کے مطابق اتنے بڑے ہوٹل میں ہم دونوں بیٹھے ہیں، یا ہوٹل کے کارکن ہیں، اور کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ یا پھر ہماری ”جماعتِ مستحقین“ کے کچھ لوگ آجاتے ہیں۔ ہم حیران یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ دیکھتے ہی

دیکھتے چند روز میں ایک بار رونق ہوٹل کی یہ حالت -!

اس کے بعد ہم نے وہاں جانا بند کیا اور انارکلی کے باہر کشمیری ٹی سٹال کے قریب ایک ہوٹل میں مجلس جانا شروع کی۔ کوئی دو مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن ہم نے دیکھا، ہوٹل کے ایک کونے میں مٹی جینی کے قابل فروخت برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے، ساتھ ہی بان کی بنی ہوئی ایک چارپائی پڑی ہے اور میز کرسیوں کو ایک طرف کر دیا گیا ہے۔ جو دو چار آدمی چائے کے لیے آئے ہیں وہ ان کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہم نے ہوٹل والوں سے پوچھا، یہ کیا سلسلہ ہے؟ بولے جناب کئی دنوں سے چائے کا کاروبار بہت مندا پڑ گیا ہے اور پیٹ پالنے کے لیے ہم برتن فروشی کا دھندا شروع کر رہے ہیں۔

یہ سن کر میں نے مولانا کی طرف دیکھا اور عرض کیا، معلوم ہوتا ہے یہ ہماری ہی کرامات کا نتیجہ ہے اور ہم اللہ کے فضل سے ”مرتبہ ولایت“ کو پہنچ رہے ہیں۔ پہلے ہوٹل کے بعد اس ہوٹل کا یہ انجام ہماری ولایت کی واضح دلیل ہے۔ میرے ان الفاظ سے مولانا کو بھی احساں ہوا اور بولے ”واقعی کوئی ایسی ہی بات ہے“ میں نے آہستہ سے کہا، مجھے یقین ہے ہوٹلوں کی رونق ختم کر دینے کی ولایت تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض ہو چکی ہے لیکن ابھی اس کے ظاہر کرنے کا وقت نہیں آیا، جب تک مزید تجروں بلکہ صوفیا کی اصطلاح میں ”مزبور“ (جو ہوٹلوں پر پے در پے پڑنے لگی ہیں) یا ریاضتوں کے بعد معاملہ بالکل واضح نہ ہو جائے، اہل ولایت کے نزدیک اخفا ضروری ہے۔

مولانا اس نکتے کو خوب جانتے تھے، بولے آپ نے ٹھیک کہا، میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ ابھی ”ذکر ظاہر“ کی منزل نہیں آئی، فی الحال ہم ”ذکر خفی“ کی منزل میں ہیں، یعنی توفیق الہی سے جو معاملہ درپیش ہے اس کو ظاہر کرنے کے بجائے مخفی رکھا جائے۔ ظاہر کرنے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ کوئی اور ہوٹل والا ہمیں اندر نہیں گھسنے دے گا۔

اب ہم نے وہاں سے بھی کوچ کیا اور دہلی مسلم ہوٹل میں ٹھکانہ بنایا۔ دہلی مسلم ہوٹل میں نماز کے لیے مسجد تھی اور مولانا کے لیے ماسٹرانڈ کئی بیت الخلا تھے کہ ایک رکنا ہے تو دوسرا حاضر۔ ہم ہوٹل کے بڑے دروازے کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھتے تھے، جس کا



ایک دروازہ انارکلی کی طرف تھا اور انارکلی میں سیر سپاٹا کرنے والے لوگ اس سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

اب یہ سب باتیں ماضی بعید میں منتقل ہو کر تاریخ کے حوالے ہو چکی ہیں اور جس چیز کے بارے میں اُس وقت ”ہے“ کہا جاتا تھا، اب اس پر ”تھا“ کا اطلاق ہونے لگا ہے، اور اس دنیا کے تمام چھوٹے بڑے معاملات کا یہی حال ہے۔ مستقبل تیزی کے ساتھ ماضی کے قالب میں ڈھل رہا ہے اور تاریخ کے نئے سے نئے باب کھلتے جا رہے ہیں۔ شب و روز کی گردش کا یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

دہلی مسلم ہوٹل بہت پُرانا اور جما ہوا ہوٹل ہے اور اس کے پیچھے ایک طویل تاریخ ہے۔ آزادی برصغیر سے پیشتر جب کشمیر کے سیاسی رہنماؤں کو کشمیری حکمرانوں سے نیچے آزمائی کے نتیجے میں وادی کشمیر سے نکلنا پڑھتا تھا یا وہ لاہور کے سیاست دانوں سے مشورے اور اخبار و ایلوں سے گفتگو کے لیے لاہور آتے تھے تو عام طور پر دہلی مسلم ہوٹل ہی میں قیام کرتے تھے۔ ان رہنماؤں میں شیخ عبداللہ، بخش غلام محمد، چوہدری غلام عباس اور بہت سے لوگ شامل تھے۔ متعدد کشمیری رہنماؤں کو آزادی سے قبل میں نے خود دہلی مسلم ہوٹل کے مختلف کمروں میں دیکھا ہے اور ان سے باتیں کی ہیں۔

اس ہوٹل سے مجھے دلی ہمدردی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ درمیانے درجے کے لوگوں کا ہوٹل ہے اور اس میں قیام و طعام بہت سستا ہے۔ اس ضمن میں یہ واقعہ لائقِ تذکرہ ہے کہ ۱۹۵۴ء میں سید رئیس احمد جعفری ادارہ ثقافت اسلامیہ سے انسلاک کے سلسلے میں لاہور آئے تو ریالوے اسٹیشن کے قریب برگنزا ہوٹل میں ٹھہرے۔ ایک دن میں نے اُن سے پوچھا، ”آپ کمرے کا روزانہ کیا کرایہ دیتے ہیں؟“ جواب دیا، ”دس روپے“۔ اُن دن روپے اس زمانے میں بہت زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ازراہ ہمدردی ان سے کہا، ”آپ دہلی مسلم ہوٹل میں آجائیے، اس کے کمرے کا کرایہ برگنزا سے بہت کم ہے۔ پھر یہ لاہور کے مرکز میں ہے اور جن پبلشروں سے آپ کا تعلق ہے، وہ سب اسی علاقے میں رہتے ہیں اور ان سے ملنا آسان ہوگا۔“

رئیس صاحب مرحوم کی عادت تھی کہ کوئی بات ان سے کسی جاتی تو انکار نہیں کرتے تھے، ”ہاں ہاں، ٹھیک ہے“ کہتے رہتے تھے۔ مشورہ دینے والے کا دل نہیں ٹوڑتے تھے۔ مولانا حنیف ندوی بھی اس وقت موجود تھے، یہ رئیس صاحب کی نفسیات کو خوب جانتے تھے۔ مولانا میر ”صائب“ مشورہ سن کر بولے، رئیس صاحب کا روبرو آدمی ہیں، ہینگے ہوٹل میں رہنا ان کے کاروبار کا حصہ ہے۔ جب یہ ایک بڑے ہوٹل سے سالم تلنگے پر آتے اور پبلشر کے سامنے تلنگے سے اترتے ہیں تو اس پر ان کے معیار زندگی کا رعب پڑتا ہے اور پھر اس کی نہیں ان کی مرضی کے مطابق معاملہ طے ہوتا ہے۔ اگر کہ کسی سستے ہوٹل میں رہیں گے تو پبلشر انھیں ایک معمولی مصنف سمجھے گا اور اپنی مرضی سے معاملہ طے کرے گا۔

اس پر رئیس صاحب اس انداز سے مسکرائے جیسے مولانا کی تائید کر رہے ہوں، اور بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس کے بعد میں نے رئیس صاحب کو اس قسم کا کبھی کوئی مشورہ نہیں دیا۔ بہر حال ہم باقاعدہ دہلی مسلم ہوٹل میں آنے، چائے پینے اور بیٹھنے لگے۔ ہم نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے بھی کہہ دیا، انھوں نے بھی وہاں تشریف لانا اور ہمیں نوازنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ دو سال کے لگ بھگ جاری رہا ہو گا کہ ہوٹل والوں کی محکمہ اوقاف سے گڑ بڑ ہو گئی، پھر انتظامیہ میں جھگڑا پیدا ہو گیا، کچھ عرصے بعد ہوٹل کے کچھ کمروں کو ڈھانا شروع کر دیا گیا۔ بالآخر جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے، اس کی باری آگئی اور پھر اس میں کوئی اور کاروبار شروع کر دیا گیا۔ اب کئی سال سے اس کمرے میں حبیب بینک کی شاخ کھول دی گئی ہے۔ ہوٹل قائم ہے اور اللہ اسے قائم رکھے، لیکن اس کے کمروں میں تھوڑا بہت رد و بدل بہر حال ہوا ہے۔

اب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب ہماری ہی ”کرامات“ کے کرشمے اور ہماری ہی ”ولایت“ کے مظاہر ہیں۔ اس زمانے میں اللہ کے فضل و کرم سے ہم ولایت کے اونچے مرتبے پر فائز تھے اور اپنے ملنے والوں سے بر ملا اس کا اظہار کرتے تھے، کیوں کہ ”کرامات“ دھڑا دھڑا ظاہر ہو رہی تھیں اور بات شک و شبہ کے دائرے سے نکل کر مقام یقین تک جا پہنچی تھی۔ اب انفا کی ضرورت نہ تھی، اظہار کی ضرورت تھی۔ اگر اس موقع پر اظہار سے کام نہ لیا جاتا تو ”مقام ولایت“ پر ایسے اثرات مرتب ہونے کا قوی اندیشہ تھا کہ جن سے ”اولیائی“ معرض خطر میں پڑ سکتی تھی۔

اس زمانے کے سات اٹھ ہوٹل تو مجھے اچھی طرح یاد ہیں جو انارکلی اور اس کے گرد و نواح میں پہلے سے قائم تھے یا نئے نئے کھلے تھے، مگر ہماری چند ”چائیں“ بھی برداشت نہ کر سکے۔ میں یہ بات کسی قسم کے فخر یا تعلیٰ سے نہیں، ”نحدیثِ نعمت“ کے طور پر اللہ سے لاکھ لاکھ مرتبہ ڈرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ اُس دور میں ”زورِ کرامات“ کا یہ عالم تھا کہ ادھر کسی ہوٹل میں ہمارے ”سبز قدم“ پڑے اور ادھر بیڑا پار۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی ”نعمت“ تھی جو ہمیں عطا فرمائی گئی تھی، ہر ایک کو یہ کہاں ملتی ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

کوئی تینیس چوبیس برس کی بات ہے کہ انارکلی میں بہت امیر لوگوں نے ایک ہوٹل کھولا۔ اس ہوٹل کی اٹھان بہت اچھی تھی اور بہت لوگ اس میں آتے تھے۔ ہم نے بھی اس میں جانا اور چائے پینا شروع کر دیا۔ بعض اذیب اور شاعر حضرات بھی وہاں آتے جو اپنی عادتِ مستمرہ اور روایتِ متواترہ کے مطابق ایک دوسرے کو اپنا کلام سناتے اور چائے پیتے پلاتے تھے۔

ایک دن میں اور مولانا ندوی اس ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ میرزا اذیب بھی تشریف لے آئے اور مولانا سے ملے۔ میں نے اُٹھ کر ان سے مصافحہ کیا، کافی دیر باتیں ہوتی رہیں اور انھوں نے ہمارے ساتھ چائے پی۔ اس سے پہلے میں نے میرزا اذیب کو دیکھا تو تھا اور ان کی کتاب ”صحرا نور د کے خطوط“ بھی پڑی تھی، لیکن ان سے پہلی ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی اور میں ان سے باتیں سننے کا اتفاق ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ اب وہ میرے دل کے ساتھی بھی ہیں اور محلّے کے بھی۔ اگر ہفتے میں ایک دو مرتبہ ملاقات نہ ہو تو وہ بھی شکوہ فرماتے ہیں اور میں بھی خلا سا محسوس کرتا ہوں۔

ہمیں انتہائی تعجب ہوا کہ امیر لوگوں کا یہ ہوٹل، شان دار فرنیچر اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ، لیکن ہماری ولایت کی ”جھال نہ جھل“ سکا اور جلد ہی اللہ کو پیا۔ اہو گیا۔

حسرت ان غینچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اسی طرح ایک اور ہوٹل مال روڈ پر تھا۔ بہت اچھی جگہ تھی، مال۔ دوڑ کی رونق ادھل پھل

سامنے نظر آتی تھی۔ مولانا کے لیے پیشاب خانہ بھی تھا، لیکن ہماری آمد و رفت کے تین چار مہینے بعد اس کا انجام بھی وہی ہوا جو پہلے دن سے اس کے مقدر میں تھا۔

وائی ایم سی اے کے کونے میں ایک بہت بڑی عمارت ہے۔ سید رئیس احمد جعفری مرحوم نے مجھے بتایا کہ چند روز ہوئے اس میں ایک عمدہ ہوٹل کھولا گیا ہے۔ چنانچہ مغرب کے بعد میں اور رئیس صاحب اس میں گئے، کھانا کھایا اور چائے پی۔ باطن کا علم تو اللہ کو ہے، لیکن ہم ظاہر بینوں کے نزدیک بلاشبہ بہت اچھا ہوٹل تھا۔ دوسرے دن مولانا کو بتایا، فرمایا :  
”دیکھ آئے ہو۔“

عرض کیا ”جی ہاں دیکھ آیا ہوں“  
بولے ”پہلے کیوں نہیں بتایا، مخفی کیوں رکھا؟“  
ادب سے عرض کیا، ”کل ہی پتا چلا ہے۔“  
فرمایا : ”اب دیر نہ لگاؤ، جلدی چلو۔“

مولانا کے لب و لہجے سے مجھے ایسے لگا جیسے ان کو میرے بارے میں یہ شبہ ہوا ہے کہ میں ”اندر خانے“ ہوٹل والوں سے ”ملا ہوا ہوں“ اور مولانا کو وہاں نہیں لے جانا چاہتا، اور یہ ہمارے ”قانون“ کی رو سے ”سنگین جرم“ تھا۔ بہر حال میں نے مولانا کو ہوٹل کے دروازے پر لے جا کھڑ کیا۔ فرمایا :  
”اندر چلو“

عرض کیا ”پہلے آپ“

ہم اندر پہنچے، بیٹھنے کے لیے اپنے ڈھب کی جگہ تلاش کی۔ مولانا غسل خانے میں گئے اور ایک ضرب پیشاب سے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ برہ آیا اور ہم نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی اور ہم نے پینا شروع کی اور ساتھ ہی وسیع ہال کے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد مولانا نے ”جواب آں چائے“ کے لیے دوبارہ غسل خانے کا عزم فرمایا۔ ہر چیز ہماری پسند کے مطابق تھی، غسل خانہ بھی، چائے بھی اور فرنیچر بھی۔ فیصلہ ہوا کہ کل سے یہاں باقاعدہ ڈیرہ لگا یا جائے گا۔ چنانچہ اس فیصلے پر عمل ہونے لگا۔ اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا

بھی وہی حشر ہوا جو تقدیر میں لکھا تھا۔ وارث شاہ نے ہستی کی زبان میں بالکل ٹھیک کہا ہے:

تقدیر اللہ دی نول کون موڑے تقدیر پہاڑاں نول پٹ دی وے

اس کے قریب ہی میکلیگن روڈ پر ایک ہوٹل تھا جس کا نام تھا، ”گرین ہوٹل“۔ اس کے مالک لاہور کے ایک مشہور ٹھیکیدار اور امیر آدمی تھے، وفات پا گئے ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، بہت شریف انسان تھے۔ ان سے میرا تعارف حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم نے کرایا تھا جو ان کی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور وہی سب سے پہلے ہیں اس ہوٹل میں لے کر گئے تھے۔ اب ہماری اس پر نگاہ انتخاب پڑی تو اس میں آمدورفت شروع ہوئی۔ وہ ”کرامتوں“ کے ظہور کا زمانہ تھا، ہمارا اس میں کوئی بس نہ چلتا تھا۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ ہوٹل کا سامان سمیٹ لیا گیا ہے اور عمارت کا کوئی اور مصرف تلاش کر لیا گیا ہے۔

نیلہ گنبد میں جامع مسجد کے قریب کئی سال سے ایک ہوٹل تھا۔ ہمارے ”قدم رنجہ فرمانے“ کے بعد وہ بھی ”مرحومین“ کے زمرے میں شامل ہو گیا۔

ایک ہوٹل بھائی دروازے کے باہر سینما ہال کے سامنے کھولا گیا تھا جو اپنے علاقے کا ایک ”پہننے خان“ ہوٹل تھا۔ اس میں تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ وہ بھی بے چارہ ہماری ”کرامت“ کی نذر ہو گیا اور اب اس کا صرف بورڈ باقی رہ گیا ہے۔ میں کبھی ادھر سے گزرتا ہوں تو اس ”مقامِ عبرت“ کو ضرور دیکھتا ہوں۔

اسی اثنا میں لوہاری دروازے کے باہر جہاں دہلی دروازہ اور ریلوے اسٹیشن کی طرف سے آنے والی وگینوں کا سٹاپ ہے اور جہاں فروٹ والے سڑک پر دکانیں سجائے بیٹھے ہیں، میں وہاں سے ایک دن گزر رہا تھا کہ دیکھا بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مشہور ادیب اور صحافی شورش کاشمیری (مرحوم) نے یہاں اپنے ایک دوست کے ہوٹل کا افتتاح کیا ہے اور یہ لوگ ہوٹل والے کی دعوت پر آئے ہیں۔ اس ہوٹل کا کچھ ادبی قسم کا نام تھا جواب ذہن سے نکل گیا ہے۔ تیسرے دن یہ واقعہ مولانا کو بتایا تو فرمایا:

”پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اب جلدی جلدی اس ہوٹل میں پہنچنا چاہیے۔“

عرض کیا، ”اس کا افتتاح ایک بہت مستقل مزاج آدمی نے کیا ہے، کوئی قدم اٹھانے

سے پہلے یہ سوچ لیجیے کہ اس میں کامیابی کی کہاں تک امید ہے۔  
فرمایا، ”آپ کو خدا پر بھروسہ سنا نہیں رہا، جن کرامتوں سے اُس نے ہمیں نوازا اور ولایت کے جس ”ذروۃ علیا“ پر فائز فرمایا ہے، اس کے پیش نظر ہمیں اللہ کے گھر سے یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ضرور کامیابی سے ہم کنار کرے گا۔“

پھر نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، ”مولوی اسحاق، مردِ مومن کو اللہ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“ آخر میں میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے پنجابی میں کہا۔  
”گھبراؤ نہیں، ابہ ہوٹل ان شاء اللہ ساڈی دو چاواں دی ماروی نہیں۔ چلو اللہ داناں لے کے اٹھو۔“

مولانا جب پنجابی میں میری حوصلہ افزائی کرتے اور مجھے ”ہلا شیریں“ دیتے ہیں تو میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ کامیابی قدم چومنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہے بلکہ ”اُسل وٹے“ لے رہی ہے، اور اگر اردو میں حوصلہ افزائی کریں تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کامیابی دُور ہے اور مولانا کی طرح ”کھونڈی“ ہاتھ میں پکڑے خراماں خراماں آ رہی ہے۔ اس میں حوصلہ افزائی کے آخری الفاظ چوں کہ مولانا نے پنجابی میں ارشاد فرمائے تھے، اس لیے میں کامیابی کو بالکل سامنے اور اپنی طرف دوڑ کر آتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔

ہم ہوٹل میں گئے اور چائے پی، مولانا نے دو مرتبہ ”جواب چائے عرض کیا۔“ جو ہمارے نزدیک بہترین شگون تھا۔ ہوٹل اچھا تھا، سروس بھی ٹھیک تھی۔ مولانا کا ارشاد گرامی سولہ آنے سے بھی بڑھ کر اٹھارہ آنے صحیح ثابت ہوا۔ ہم نے اس ہوٹل میں چند ہی روز چائے پی تھی کہ اس کے لیے اللہ کا آخری حکم نازل ہو گیا۔ سچ ہے۔ ”جو اوپر سے آئے، اُسے کون ٹالے۔“ نیلی چھت والے کو یہی منظور تھا۔

انارکلی میں مکی مسجد کے قریب ایک صاحب رہتے تھے، ان کا نام میں بھول رہا ہوں، وہ ”ندوی“ تھے۔ بہت معقول اور مخلص آدمی تھے۔ ایک دن ہم وہاں سے گزر رہے تھے کہ دوڑ کر آئے اور ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ جہاں وہ لے کر گئے تھے وہ اُن کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ بہت صاف ستھرا اور نہایت عمدہ۔ وہ خود تو مطالعہ کتب میں مشغول رہتے،

دو تین ملازم ہوٹل چلاتے تھے۔ انتہائی احترام سے چائے پیش کی اور مختلف موضوعات سے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ہم اجازت لے کر اٹھنے لگے تو بہ اندازِ درخواست کہا: ”آپ یہاں روزانہ تشریف لایا کریں، دوسری جگہ بھی بیٹھتے ہیں، یہاں آجا یا کریں، آپ کی نوازش ہوگی۔“ ہم باہر نکلے تو میں نے مولانا سے عرض کیا، اس معصوم کو تو کسی بات کا علم نہیں، لیکن ہمیں آئندہ یہاں نہیں آنا چاہیے، یہ غریب مار ہوگی۔ جب تک یہ مفت میں چائے پلاتے ہیں گے، معاملہ ٹھیک رہے گا، کیوں کہ ہماری کرامتوں کے دائرہ اثر میں وہ لوگ نہیں آتے جو مفت میں چائے پلاتے ہیں، وہ اپنے گھر میں پلائیں یا ہوٹل میں۔ لیکن یہ کب تک مفت میں پلاتے رہیں گے، دو تین مرتبہ پلا دیں گے۔ میں نے مولانا کو سچائی ضرب المثل سنائی کہ ”دس گھر دین بھی چھڈ دندی اے“ یہ تو آپ کے ”پیٹی بند“ یعنی ندوی بھائی ہیں۔ یہ مجھو لے پیچھی بے شک ہماری خصوصیاتِ روحانیہ سے واقف نہیں، لیکن ہمیں تو ان پر رحم کرنا چاہیے۔ سبیلنے کہ گئے ہیں کہ جس برتن میں کھاؤ اس میں سوراخ نہ کرو۔

مولانا نے فرمایا، ”یہ سب ٹھیک ہے، مجھے بھی اس کا احساس ہے، لیکن کریں کیا؟ یہ ہمارے یہاں آنے کے لیے مہر ہیں۔“

کچھ دن تو ہم ان سے بچتے رہے، مگر جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً جانا پڑا۔ بس پھر کیا تھا، جو ہونا تھا، ہو کر رہا۔ ہوٹل بند ہو گیا اور اس پیکرِ خلوص کا آج تک پتا نہیں چلا کہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

ہمارے اس عہد کے ملنے والوں میں ایک صاحب کا نام شیخ عبدالملک اور دوسرے کا صالحین تھا۔ شیخ عبدالملک کو ہمارے حلقہٴ احباب میں ”حاجی صاحب“ کہا جاتا تھا۔ یہ اصلاً دہلی کے رہنے والے تھے۔ لاہور میں چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے اور مطمئن تھے۔ انہوں نے کمرشل بلڈنگ میں ”کیفے ڈی لائنٹ“ کے نام سے جدید انتظامات کے ساتھ ایک چائے خانہ کھول لیا۔ پھر قسمت نے جو چکر دیا تو ہمیں کہنا بلکہ اصرار کرنا شروع کر دیا کہ یہاں ضرور آیا کریں۔ وہ بدقسمتی سے ہمارے ”کراماتی رازوں“ سے آگاہ نہیں تھے، حالانکہ ان سے خاصی بے تکلفی تھی۔ ہم ان کی بھلائی چاہتے تھے، اس لیے عرصے تک اُن کے ہاں جانے سے گریزاں رہے،

لیکن جب انھوں نے بار بار اور زور دے کر کہنا شروع کیا تو مجبوراً جانا پڑا۔ اس ہوٹل میں قدم رکھتے ہی میری کیفیت کہانیوں کے اس روایتی دیو کی سی تھی جو آدم زاد کو دیکھ کر پہلے ہنستا اور پھر روتا تھا۔ میں بھی پہلے ہوٹل کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر خوش ہوا، اور پھر افسوس کے ساتھ اس کے انجام پر غور کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ ان بے چاروں نے جو یہ اتنا سامان جمع کر رکھا ہے اس کا کیا کریں گے اور اسے کس مصرف میں لائیں گے۔

میں نے ایک مخلص دوست کی طرح ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیریت پوچھی، پھر چائے خانے کے خرچ اور آمدنی کے بارے میں دریافت کیا اور پھر گھر کے اخراجات سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ مولانا خاموش بیٹھے تمام صورت حال دیکھتے اور سنتے رہے۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ ہمارا آنا مشکل ہے۔ مولانا کا ”کچھ تیرے آنے سے پہلے اور کچھ تیرے جانے کے بعد“ کی طرح چائے سے پہلے ”اجازت چائے“ اور پھر چائے کے بعد ”جواب آں چائے“ کا دور چلتا ہے اور اس کا یہاں انتظام نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا سب ہے۔ بس آپ آیا کریں، آپ کو دیکھ کر آپ کے اور دوست بھی آئیں گے۔ اگر آپ ہی ہمارے ساتھ تعاون نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ بات بظاہر ان کی بھی صحیح تھی۔

مولانا نے میرے کان میں کہا، انھیں پھر سمجھاؤ کہ ہمارے یہاں آنے پر اصرار نہ کریں۔ میں نے عرض کیا، میں ہر طرح سمجھا چکا، اب یہ خود ہی اپنی ”موت“ کو دعوت دے رہے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں تو بے بس ہوں اور وہی الفاظ کہتا ہوں جو وارث شاہ کے بقول ہیر نے رانجھ سے کہے تھے :

لے وے رانجھیا واہ میں لا تمھکی، میرے دس تھیں گل بے دس ہوئی

قصہ مختصر یہ کہ ہم نے ان کے مستقبل کو خدا کے حوالے کر کے روزانہ چار بجے کے بعد کیفے ڈی لائٹ میں جانا، بیٹھنا اور چائے پینا شروع کر دیا۔ رئیس احمد جعفری مرحوم بھی وہاں آتے تھے اور مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کو پتا چلا تو وہ بھی تشریف لانے لگے۔ حسرت مرحوم مولانا کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ وہ مولانا سے بعض مسائل بھی دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مسئلہ انھوں نے ایک دن بیسے کے بارے میں پوچھا۔ مولانا کے جواب میں بیسے کے جواز کا پہلو نکلتا تھا،



لیکن حسرت مرحوم کے بعض افکار میں اس زمانے میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ انھوں نے مولانا سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ اس کی کوئی توجیہ کر لیجیے، بیسے کی رقم بہر حال سود کے ذیل میں آئے گی اور سود کی تمام شکلیں شرعاً حرام ہیں۔

قادیانی حضرات کا اخبار ”الفضل“ اس وقت لاہور سے شائع ہوتا تھا اور اس کا دفتر کیفے ڈی لائٹ کے قریب میکلیگن روڈ پر تھا۔ اس کے ایڈیٹر روشن دین تنویر بھی وہاں آتے تھے۔ وہ الگ جاکر بیٹھ جاتے۔ ایک کپ چائے اور ایک شامی کباب منگواتے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ مولانا ندوی اور حسرت صاحب کے اصرار کے باوجود وہ ہمارے پاس بیٹھنے سے گریز کرتے۔ یہ میری ڈیوٹی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس ”سامان تفریح“ کو ان کے پاس لاؤں۔ وہ میرے کہنے سے آجاتے لیکن چائے اور شامی کباب سے فارغ ہونے کے بعد۔!

ایک دن حسرت مرحوم نے ان سے پوچھا ”مولانا! آپ چائے کے ساتھ شامی کباب ضرور کھاتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟“ میں نے ان کی طرف سے جواب دیا: شامی کباب وہ ہوتا ہے جو شام کے وقت کھایا جائے، اسی لیے روشن دین تنویر اسے شام کو کھاتے ہیں۔

مشہور دیوبندی عالم مولانا ابوالقاسم دلاوری مرحوم بھی ہماری وجہ سے کبھی کبھی وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ مولانا ندوی اور حسرت مرحوم سے ان کے پرانے تعلقات تھے، رئیس صاحب سے نیا نیا تعارف ہوا تھا اور میرے مشفق تھے۔ قادیانیوں کے وہ شدید مخالف تھے، لیکن اتفاق سے جب بھی آئے روشن دین تنویر کی آمد سے پہلے یا ان کے جانے کے بعد آئے، ورنہ ہوٹل میدان مناظرہ بن جاتا۔ حسرت مرحوم کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتے اور مولانا ابوالقاسم دلاوری کی گفتگو شروع ہو جاتی۔ وہ حیات مسیح کے سختی سے قائل تھے اور اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دن عجیب لطیفہ ہوا، وہ تشریف لائے اور دروازے میں داخل ہوئے تو حسرت صاحب نے اپنے خاص انداز میں کہا: ”مولانا آئیے، آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا، ابھی ابھی رائٹر نے یہ افسوس ناک خبر دی ہے کہ حضرت مسیح چرخ چہارم پر انتقال فرما گئے“ مولانا عالم تجیر میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور کہا، ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ اس پر ایک قمقمہ بلند ہوا، اور مولانا بیٹھ گئے۔

مولانا ابوالقاسم دلاوری بعض مسائل میں متشدد تو تھے لیکن خشک نہیں تھے، زندہ دل اور دوستوں کے دوست تھے۔ لطیف پر خوش ہوتے تھے۔ وہ کہا کرتے کہ زمین نہیں گھومتی، سورج گھومتا ہے، اس پر وہ سختی سے قائم تھے اور اس کے دلائل دیتے تھے۔

ایک دن کسی دوست نے بہت سی کتابوں کے ایک مشہور مصنف کے بارے میں (جو کئی سال ہوئے وفات پا گئے ہیں) کہا کہ ”وہ بہت پڑھے لکھے ہیں“ حسرت مرحوم نے جواب دیا، ”پڑھے“ کا تو پتا نہیں، ”لکھے“، البتہ بہت ہیں۔

کیفے ڈی لائٹ کی محفلیں بہت دلچسپ تھیں۔ رئیس احمد جعفری مرحوم ان دنوں کراچی سے ماہ نامہ ”ریاض“ نکالتے تھے۔ یہ نام انھوں نے اپنے نانا ریاض خیر آبادی مرحوم کے نام پر رکھا تھا۔ کراچی جا کر انھوں نے ”ریاض“ میں کیفے ڈی لائٹ کی ان محفلوں سے متعلق بھی لکھا تھا، جن میں وہ خود شریک ہوتے رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد رئیس صاحب کراچی سے لاہور آگئے تھے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔

اس زمانے میں لاہور میں پاکستانی اور ہندوستانی کھلاڑیوں کے درمیان کرکٹ میچ کھیلا گیا تھا، جس کو دیکھنے کے لیے پچاس ہزار کے لگ بھگ ہندوستانی باشندے لاہور آئے تھے اور ان میں زیادہ تعداد مشرقی پنجاب کے سکھوں کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں پاکستان کے سفیر راجا غنفر علی خاں تھے اور انھوں نے دل کھول کر ہندوستانیوں کو پاکستان کے دیرے دیے تھے۔ وہ خود بھی کرکٹ میچ دیکھنے لاہور آئے تھے۔ گول باغ میں راجا صاحب مرحوم کی صدارت میں شام کے بعد مشاعرہ بھی ہوا تھا، جس میں پاکستان اور ہندوستان کے شاعروں نے پنجابی میں اپنا کلام سنایا تھا۔ اس کو ”محصارہ“ بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس میں سکھ شاعر یعنی ”موچھوں والے“ زیادہ تھے۔ ایک سکھ شاعر نے کوہ پیمان سنگھ (یا تن سنگ) کے بارے میں نظم پڑھی تھی، جس نے کچھ عرصہ پیشتر کوہ پیمان کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا تھا۔

اس مشاعرے میں لاہور کے بے شمار لوگ شامل ہوئے۔ ایک بوڑھے سکھ نے نظم پڑھنے سے پہلے پنجابی میں بتایا کہ وہ پاکستان آنے کے لیے تیار ہوا تو اس کی ”سنگھنی“ نے اُسے روکا اور کہا کہ پاکستان کے مسلمان تمہیں مار ڈالیں گے، تم وہاں نہ جاؤ۔ جو تھوڑی بہت زندگی باقی

ہے، اسے گھر میں بیٹھ کر گزارو اور آرام کی موت مرو۔ سنگھنی نے اسے غصے میں یہ بھی کہا: ”ٹھٹھ پینیا نہ جا، مُسلیاں دے ہتھوں مرجائیں گا، کیوں موت نوں ماسی آکھدا میں؟“ مگر وہ نہیں مانا۔ (بقول اس کے) جب سنگھنی نے بہت ڈرایا اور پاکستان نہ جانے کے لیے رو رو کے منّت سماجّت کی تو وہ سچّ چُڑ گیا۔ رات بھر سوچتا رہا، بالآخر لاہور آنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اس کو ضلع امرت سر کے کسی گاؤں سے سائیکل پر لاہور آنا تھا۔ صبح صبح بقول اس کے ”میںیں دی بانگ ویلے اٹھیا“ اور سنگھنی سے کہا تم میرے لیے پریم کے ساتھ اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے مویوں والے موٹے موٹے چار پر اٹھے یکادو اور اوپر پاؤ بھر مکھن رکھ دو۔ شاید تیرے ہاتھ کے پکے ہوئے میرے لیے یہ آخری پر اٹھے ہوں۔ میں انھیں واگہ کی سرحد پر جا کر کھاؤں گا اور تمھیں دعا دوں گا۔ اس کے بعد پاکستان پہنچتے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں مار دیا جاؤں گا۔ اس نے بتایا کہ سنگھنی نے رو رو کر میرے لیے اپنے خیال میں آخری پر اٹھے اسی طرح پکائے جس طرح میں نے کہا تھا اور ”نویں نکور پونے“ میں باندھ دیے۔ پھر اس نے آخری بار میرے ”چرن چھوئے“ اور ”نبجو بھری“ آنکھوں سے ہاتھ جوڑ کر مجھے رخصت کیا اور دباگر دسے دعا مانگی کہ میں سکھ چین سے واپس آؤں اور اگر وہاں مار دیا جاؤں تو ”شہیدی مرا تبہ“ پاؤں اور سیدھا مُرگ کو جاؤں۔ اس نے بتایا کہ لاہور میں میرا ایک سبھن ہے جو پاکستان بننے سے پہلے میرے گاؤں میں رہتا تھا، اس کا نام ہے ملا عبد العزیز۔ چھوٹی عمر سے ہمارا یار نہ تھا۔ اب ہم آپس میں ایک دوسرے کو چھٹیاں بھیجتے رہتے ہیں۔ کچھ دن پہلے میں نے اس کو چھٹی لکھی کہ میں فلاں تاریخ کو لاہور آ رہا ہوں، تم مجھے لینے کے لیے واگہ سرحد پر پہنچ جاؤ۔ چنانچہ میں وہاں آیا تو وہ موجود تھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے اور کئی سال کے ”وچھڑے“ ملے تو اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ وہ بھی میرے لیے گھر سے روٹیاں لے کر آیا تھا۔ پہلے تو ہم دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر روٹیاں کھائیں اور میں نے اس سے کہا، تم یہ پر اٹھے کھاؤ، ان میں مویاں ڈالی ہوئی ہیں اور تیری ”بھر جائی“ کے ہاتھ کے پکے ہوئے ہیں۔ دو میرے لیے ہیں اور دو تیرے لیے۔ پھر یہ ہوا کہ اس نے میرے پر اٹھے کھائے اور میں نے اس کا پھلکا چھکا۔ اس کے بعد ہم نے ایک ایک ”ڈکار“ مارا اور سائیکل پر سوار ہو کر لاہور کو روانہ ہو گئے۔ میں سائیکل چلا رہا تھا، ملا عبد العزیز

میرے پیچھے بیٹھا تھا، لوگ ارد گرد سڑک پر کھڑے ہیں خوش ہو ہو کر دیکھ رہے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ مال روڈ پر صرف ایک آدمی سائیکل پر بیٹھ سکتا ہے دو بیٹھیں تو سپاہی پکڑ لیتے ہیں، لیکن میں سپاہی دیکھتے رہے، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ پھر راستے میں سائیکل چلا تے چلا تے یہ ”کوٹا“ ہو گئی۔ اب سنو ”کوٹا“

وہ کوٹا (نظم) جو اس سکھ شاعر نے پڑھی، بہت دلچسپ تھی، اس پر اس کو خوب داد ملی۔ میں نے وہ یاد کر لی تھی، لیکن افسوس ہے اب بھول گیا ہوں، صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے :

ملاں سنگھ دی پچھاڑی بیٹھا  
دیکھے جگت کھڑا

اس کے بعد اس نے اپنے خاص لب و لہجے میں کہا کہ ہم راجا غضنفر علی خاں کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمارے لیے لاہور آنے اور مسلمان بھائیوں سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے غ کا گ، ض کا ج، ف کا پھ، ع کا الف اور خ کا کھ تلفظ کیا اور ”غضنفر علی خاں“ کو ”گجنپھر الی کھاں“ بنا دیا۔

اس مشاعرے میں مولانا محمد حنیف ندوی بھی موجود تھے۔ اس قسم کے اجتماعات میں ہم دونوں اکٹھے جاتے اور نہایت اہتمام اور شوق سے جاتے۔ اس سکھ کی تقریر بھی بہت ”ہنسی آور“ تھی اور نظم بھی ”تہمتہ آفرین“ تھی۔

سکھ کئی دن یہاں رہے تھے اور تمام شہر میں آزادی سے گھومتے پھرتے تھے۔ چوں کہ اتنی بڑی تعداد میں آزادی کے بعد یہ پہلی دفعہ لاہور آئے تھے، اس لیے لوگ انھیں تعجب سے دیکھتے اور ملتے تھے۔ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک دن معمول کے مطابق میں کیفے ڈی لائٹ پہنچا، لیکن میرے ساتھیوں میں سے ابھی تک کوئی صاحب بھی نہیں آئے تھے میرا چھوٹا بھائی سعید احمد میرے ساتھ تھا، جس کی عمر اس وقت چھ سات برس کی تھی اور وہ سکھوں کو دیکھنا چاہتا تھا کہ کس قسم کے ہوتے ہیں۔

ہوٹل کے ایک کیمپن کے دروازے پر نیلے رنگ کے کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔ مجھے

جو شرارت سوچھی، میں نے وہ کپڑا اتارا اور آئینے کے سامنے بیٹھ کر سکھوں کی طرح پگڑی باندھی، جبیب سے رومال نکال کر اس کا جوڑا بنایا اور سنجیدہ صورت بنا کر بیٹھ گیا۔ سعید مجھے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا اٹھا اور رونے لگا۔ میں نے اس کو چپ کرایا اور ہوٹل والوں کے سپرد کیا۔ میں ان دنوں مونچھیں چڑھا کر رکھتا تھا اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے چند طالب علم آئے اور مجھے سکھ نوجوان سمجھ کر میرے پاس آ بیٹھے۔ انھوں نے مجھ سے پنجابی میں کچھ سوالات کیے، میں نے اردو میں جواب دینا شروع کیے۔ وہ سمجھ پڑھا لکھا اور اردو بولنے والا ”سکھ“ ہے۔ اس سے انھیں خوشی ہوئی اور اردو میں گفتگو کرنے لگے۔ اتنے مولانا بھی آگئے اور جس مین برہم روزانہ بیٹھتے تھے، وہاں جا بیٹھے۔ انھوں نے چائے نہیں منگوائی اس لیے کہ میرا انتظار تھا۔

طالب علموں نے چائے اور پیسٹریوں کا آرڈر دیا، ہم باتیں بھی کر رہے تھے اور کھانے پینے کا شغل بھی جاری تھا۔ مولانا ہمیں دیکھ رہے تھے لیکن کچھ دور ہونے کی وجہ سے ہماری آواز ان تک نہیں پہنچ رہی تھی — کچھ دیر بعد طالب علم یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ کل اسی وقت یہاں آئیں گے اور مجھے لاہور کی سیر کرائیں گے۔ دوسرے دن وعدے کے مطابق وہ آئے، میں موجود تھا، انھوں نے بار بار ادھر ادھر دیکھا مگر اپنے مطلوب ”سکھ“ کو نہ پا کر مایوسی کے عالم میں واپس چلے گئے۔

مولانا نے مجھے بالکل نہیں پہچانا، ہوٹل والوں نے بھی ان پر یہ راز ظاہر نہیں کیا۔ جب میں اکیلارہ گیا تو مولانا کے پاس آیا اور آداب عرض کیا۔ مولانا کھڑے ہوئے اور فرمایا :

”تشریف رکھیے“ — ہم نے ”تشریف رکھی“ اور پوچھا

”مزاج اچھے ہیں؟“

فرمایا ”اللہ کا فضل ہے“

عرض کیا، ”اللہ کا فضل ہے یا واہگرو دی کرپا اے؟“

ساتھ ہی سوال کیا، ”آپ کہاں تشریف رکھتے ہیں اور کیا شغل ہے؟“

اب انھیں شبہ پڑا، میں بھی مہنسی مضبوط نہ کر سکا، ہوٹل والے بھی ہنسنے لگے۔ فرمایا

”میں بالکل نہیں پہچان سکا، یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“

میں نے پکڑی اتاری اور لطیفے بازی شروع ہو گئی۔

دوسرے دن یہ واقعہ مولانا نے اپنے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ میں) مولانا جعفر شاہ پھلوار کی سے بیان کیا، ان کو اس قسم کی باتیں خدا سے، وہ میرے مہربان تھے۔ انھوں نے ”امروز“ میں ایک مضمون لکھ مارا، جس میں میرے جعلی سکھیتے کا دلچسپ مزاحیہ انداز میں ذکر کیا۔ مضمون میں میرا نام نہیں لیا، صرف یہ لکھا کہ ہمارے ایک دوست جو قیام پاکستان سے قبل ریاست فریدکوٹ سے تعلق رکھتے تھے، ”سکھ“ بن کر ایک ہوٹل میں لاہور کے طلباء سے پیسے پٹیاں اڑاتے رہے۔

جی چاہتا ہے اس موقع پر سکھوں کے تین چار لطیفے بیان کر دیے جائیں جو اس زمانے میں میرے سامنے ”سرزد“ ہوئے۔ میں ان لطیفوں کا چشم دید اور گوش شنید گواہ ہوں۔

ان دنوں بے شمار سکھ انارکلی، مال روڈ اور لاہور کے دوسرے علاقوں میں گھوم پھر رہے تھے اور لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ میں اپنے پرانے وطن فریدکوٹ کے سکھوں کی تلاش میں تھا۔ بہت لوگوں سے پوچھا مگر فریدکوٹ کا کوئی خالص نہ ملا۔ ایک دن رات کو دس بجے انارکلی سے گزر رہا تھا کہ ایک سکھ سے پوچھا۔

”سردار جی! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟“

جواب دیا، ”امرتر کے“

ساتھ ہی مجھ سے کہا، ”تیس کتھوں دا خالصہ بعدے او؟“

میں نے کہا ”فریدکوٹ دا۔“

ذرا سوچ کر بولے : فریدکوٹ دا اک خالصہ ہے، صبح نوبے ایس ”نیامت اللہ“ دے

ہوٹل چ کھانا چکھیا سی، تیس او تھے جاؤ۔“

عرض کیا، ”تیس کھانا نوبے چکھیا، ہن رات دے دس بج رہے نے، اوہ ہن تک

او تھے بیٹھے نے۔“

بولے ”شاید بارہ گھنٹے بعد پھر آگئے ہوں، وکیمن چ کی ہرج اے۔“

میں نے سردار جی کو ان کی اس سوچ کی داد دی اور شاباش کہہ کر آگے نکل گیا۔

”نیامت اللہ دے ہوٹل“ سے مراد نعمت کدہ ہوٹل ہے جو لوہاری دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر واقع ہے۔

اسی طرح ایک اور سردار جی سے جو پڑھے لکھے معلوم ہو رہے تھے، میں نے پوچھا:  
 ”سردار جی کتھوں تشریف لیائے؟“  
 فوراً بولے ”دینوں لیائے آں۔“

دہلی مسلم ہوٹل میں دو سکھ چائے پی رہے تھے۔ ان سے پوچھا  
 ”آپ کو معلوم ہے، فرید کوٹ سے بھی لوگ آتے ہیں یا نہیں؟“  
 انھوں نے جواب دیا ”سانوں پتا نہیں، پر گل ایہ اے کہ کچھ خالصہ حسن ابدال چلے  
 گئے نے، کچھ ننکانہ صاحب گئے نے۔ اج اوہ لہور واپس آجان گے، تیس ٹیشن  
 تے جان کے پتا کرو۔“

عرض کیا، ”کوئیں پتا کراں؟“  
 کہا، ”بالکل سوکھا کم اے، جدوں ریل آوے، ہوکا دیو، فرید کوٹ داکوئی خالصہ؟  
 جھیڑا ہو یا، آپے بول لیو۔“

میں لگلا پکڑنے کا یہ استاد ی طریقہ سن کر خاموش ہو گیا۔  
 یہ سکھ صاحبان سردیوں کے موسم میں لاہور آئے تھے۔ ایک دن میں بھاٹی دروازے  
 کے باہر ایک ہوٹل میں چائے پی رہا تھا کہ ایک سکھ نوجوان آیا، جس نے شان دار سوٹ پہن  
 رکھا تھا اور ہاتھ میں انگریزی کی تین چار کتابیں تھیں اور ”پاکستان ٹائمز“ اور ”ڈان“ دو  
 اخبار تھے۔ میں نے اس کو چائے کی دعوت دی تو پنجابی میں جواب دیا۔

”اج ٹھنڈ بڑی پے رہی اے، میں کوکا کو لادی ٹھنڈی بوتل پیواں گا۔“

میں نے کہا ”ٹھنڈوچ ٹھنڈی بوتل، ایہا کی مطلب؟“

بولے، ”جوئیں گرمی نوں گرمی کڈی اے، ایویں ٹھنڈ نوں ٹھنڈ کڈی اے۔“

میں ہوٹلوں کے بارے میں بات کرتا کرتا بہت دور نکل گیا اور بعض علمائے کرام کی طرح ”ذیل“  
 بیان کرنا شروع کر دیے۔ علمی زبان میں آپ شاید مجھے ”طول الذیل“ قرار دے دیں۔ دراصل

کہنا یہ چاہتا تھا کہ ہمارے ”وجودِ مسعود“ سے بے چارے کیفے ڈی لائٹ کا انجام بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے بعض ہوٹلوں کا ہو چکا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم جب بھی اس ہوٹل میں جاتے، اُس کے مالکوں کے مستقبل کا خیال ہمیں بری طرح ستانے لگتا۔ آخر سال سوا سال کے بعد جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ — رہے نام اللہ کا۔

۱۱- ستمبر ۱۹۸۴ء کو میں مولانا معین الدین لکھوی کی اہلیہ کے جنازے میں شرکت کے لیے ادا کاڑے گیا تو وہاں میرے پرانے دوست محمد محمود مبین سے ملاقات ہوئی جو مولانا لکھوی کی اہلیہ مرحومہ کے بھائی ہیں۔ ان سے یہ معلوم کر کے نہایت افسوس ہوا کہ کیفے ڈی لائٹ کے اس وقت کے مالکوں میں سے کچھ عرصہ پیشتر شیخ عبدالملک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے کراچی میں انتقال کر گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم اُس زمانے میں بہت خوب صورت، جوان رعنا اور شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ مگر اب جوانی کی منزل سے آگے نکل گئے تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ ہم انھیں اس موضوع کی طرف لانا چاہتے تو طرح دے جاتے۔

ان کے دوسرے ساتھی کا نام صالحین تھا۔ تقریباً پندرہ برس قبل ہال روڈ پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب معلوم نہیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

ہم نے ”ان کرامتوں“ کا نام ”کراماتِ ہوٹلیہ“ رکھا تھا، اور یہ وضاحت بھی کر دی کہ ہمارا یہ تجربہ یا اثر کرامات چھوٹے ہوٹلوں تک محدود رہا۔ بڑے ہوٹلوں کو ہم ”افورڈ“ نہیں کر سکتے تھے اور بڑے ہوٹلوں میں بیٹھنے والے بڑے لوگ ہمارے اس ”کراماتی سلسلے“ کو برداشت بھی نہیں کر سکتے تھے، اور ہم ”طبقاتی جنگ“ کے قائل نہیں تھے، لہذا ہم نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ بعض دوستوں اور مہربانوں نے ازراہ ”افلاس“ یہ رائے دی تھی کہ جن بڑے بڑے ہوٹلوں میں کاروباری رقابت چل رہی ہے، ان میں سے کسی ایک ہوٹل کے منتظمین سے بات کی جائے کہ وہ آپ کی خدمات حاصل کریں۔ انھوں نے مالی منفعتوں کا بھی لالچ دیا اور کہا کہ کم از کم ”لکھپتی“ ہو جاؤ گے۔ لیکن ہم نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس ”نعمتِ عظمیٰ“ سے نوازا ہے، اس کو ہم کاروباری رقابتوں سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔



یہ عقدہ البتہ پوری طرح نہیں کھل سکا کہ یہ جو کچھ ہوتا رہا، اس میں اصل کرامت کس کی تھی، اس بندۂ عاجز کی یا حضرت مولانا کی؟ یا مشترکہ طور پر دونوں کی؟ یا یہ کہ ایک کا حصہ زیادہ تھا اور ایک کا کم۔ پھر زیادہ کس کا تھا اور کم کس کا؟ اس باب میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

ہماری ہوٹل بازی اور شام کو روزانہ ملاقات کا سلسلہ ۱۹۵۲ء سے اکتوبر ۱۹۶۵ء تک جاری رہا۔ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہو گیا اور پھر یہاں کی دفتری ملاقات نے شام کی ملاقات بند کر دی۔

اس زمانے میں حالت یہ تھی کہ اگر کسی دن ملاقات نہ ہو سکتی اور مولانا انارکلی تشریف نہ لاسکتے یا میں حاضر نہ ہو سکتا تو دل پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ۱۹۶۰ء میں مولانا سخت بیمار پڑ گئے اور کہیں آنے جانے کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ میں ہر روز زیادہ دوسرے روز مزاج پُرسی کے لیے گھر جاتا۔ ان کی بیماری یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ نہ بولنے کی سکت رہی اور نہ کوئی بات سننے کو جی چاہتا، حتیٰ کہ کسی کو دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔

ایک دن میں گیا تو ملنے یا بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے انتہائی ذہنی کوفت ہوئی۔ پیغام بھجوایا کہ ”میں نیچے گلی میں کھڑا ہوں، کھڑکی سے چہرہ باہر نکال کر زیارت کرادیں۔“ اندراہِ کرم یہ گزارش مان لی گئی۔ منغل بادشاہوں کی طرح جھروکے سے چہرہ نکالا اور ہاتھ سے سلام کا اشارہ کر کے فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ اتنا خوش طبیعت، شگفتہ مزاج اور ہنس کھڑا آدمی جو چند لمحے بھی دوستوں کے بغیر نہیں گزار سکتا تھا، اب کسی کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ رنگ سیاہ پڑ گیا تھا اور سوکھ کر کاٹا ہو گئے تھے۔ چھ سات ہفتے یہی حالت رہی۔ پھر اللہ نے فضل کیا اور صحت عطا فرمائی۔ اُس کے بعد پھر وہی ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی! —

چائے اور ہوٹلیات کا موضوع ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ چائے کے سلسلے میں مولانا صرف چائے دیکھنے ہیں کہ کیسی ہے، ان کے ذوق کے مطابق ہے یا نہیں، جگہ اور برتن دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ اگر چائے ان کی پسند کے مطابق ہے

تو کہیں لے جایے، چلے غائیں گے اور کسی قسم کے برتنوں میں پلا دیجیے پی لیں گے، چھوٹے سے چھوٹے چلے خانے میں بھی اور بڑے سے بڑے ہوٹل میں بھی۔ میں نے کئی دفعہ کہا، آپ اتنے بڑے عالم اور محقق ہو مصنف ہیں اور ہمارے ساتھ معمولی سے چائے خانے میں چائے پینے بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ اس باب میں تکلف کے قائل نہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ علم سادگی، لوگوں سے میل جول اور بے تکلفی کا درس دیتا ہے۔ غرور، تکبر، نخوت اور عوام سے الگ تھلک رہنے کی تلقین نہیں کرتا۔ علم کا مطلب ہٹو بچو کے نعرے لگانا نہیں بلکہ لوگوں کو آؤ، ملو، بیٹھو اور سنو سناؤ کا جو گرجانا ہے

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ بعض دفعہ ہمیں کئی کئی دن ہوٹل میں چائے پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہایت عزت و تکریم سے چائے ملتی تھی بلکہ کبھی کبھی جبراً پلائی جاتی تھی — اس کی دو مثالیں دیتا ہوں۔

ہمارے ایک دوست محمد محمود مبین ہیں جو مشہور عالم دین اور معروف مقرر و مصنف مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی مرحوم کے فرزند گرامی ہیں اور آج کل روزنامہ ”وفاق“ (لاہور) کے نمائندے کی حیثیت سے کراچی میں مقیم ہیں۔ میرے ”الاعتصام“ کے زمانہ ادارت میں کچھ عرصہ وہ ”الاعتصام“ کے منیجر بھی رہے۔ ہمارے دورِ ہوٹل بازی میں یہ لاہور میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ لیکن ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اس کے لیے بہت پریشان تھے۔ شام کو چلتے پھرتے انارکلی میں کہیں نہ کہیں ہمیں آپکھڑتے۔ ان کے پاس سوائے شادی کے کوئی موضوع نہ تھا۔ ہم ان کی دل جوئی کرتے، ان کو تسلی دیتے اور پورے خلوص سے اس اہم مسئلے میں ان کی مدد کا وعدہ کرتے، لیکن کامیابی اللہ کے ہاتھ میں تھی، ہمارے بس میں نہ تھی۔ محمود صاحب شادی کے لالچ میں ہمیں چائے پلاتے اور بسکٹ کھلاتے۔ پھر دوسرے دن کی تاریخ پڑ جاتی اور مولانا فرماتے، باقی باتیں کل اسی وقت اسی ہوٹل میں ہوں گی۔ جب میں کہتا ”محمود صاحب! ہم نے اپنی سہی کوشش کی مگر کوئی شریف آدمی آپ کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے کو تیار نہیں۔“ تو محمود صاحب بگڑا جاتے اور کہتے ”کیوں تیار نہیں؟ مجھ میں کیا نقص ہے؟“ مولانا ایسی باتیں کہنے سے مجھے روکتے اور فرماتے شادی کے

معاملے میں ایسی بد شکوئی کی باتیں نہیں کی جاتیں۔ نہ اس سلسلے میں حوصلہ شکن گفتگو کرنا مناسب ہے۔ بہر حال چائے کے بعد ہاتھ اٹھا کر ہم ”دختم شریف“ کی دعا پڑھتے اور محمود صاحب سے کہتے کہ اللہ بھلی کرے گا، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ قادرِ مطلق اور مقلب القلوب ہے۔ اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی کا دل پھیر دے گا اور آپ کی شادی ہو جائے گی۔ اس پر محمود صاحب ہم سے پھر دعا کی درخواست کرتے اور ہم زبان سے دعائیہ کلمات کہتے اور آمین آمین پکارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتے۔

بالآخر ہماری ”دعا برکت“ سے محمود صاحب کی شادی ہو گئی، اس میں مولانا نے بھی شرکت فرمائی اور میں بھی شامل ہوا۔ نکاح مولانا سید داؤد غزنوی نے پڑھایا۔ شادی کے بعد میں نے محمود صاحب اور ان کی بیگم کو گھر بلایا اور ان کو دعوت کھلائی۔ مولانا بھی اس میں شریک ہوئے۔

اب محمود صاحب کراچی میں اقامت گزیرے ہیں اور امثالہ اللہ اتنے بچوں کے باپ ہیں کہ خود ہی بتائیں تو صحیح تعداد کا پتا چلتا ہے۔ چار سال قبل انھوں نے اپنے بیٹے کی شادی لاہور میں کی، مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی اور کئی معزز دوستوں کی ڈیوٹی لگائی کہ مجھے پکڑ کر لے جائیں، لیکن میں ان دنوں لاہور میں نہیں تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد کراچی میں بیٹی کی شادی کی، اس کا دعوت نامہ بھی آیا مگر میں بد قسمتی سے اس میں بھی شریک نہیں ہو سکا۔ پچھلے دنوں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا، یہ سب مولانا حنیف ندوی اور میری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ہم ”پچھھے پیر“ ہیں۔

اسی طرح ہمارے ایک اور دوست عبدالعلیم خاں صاحب چونیاں (ضلع قصور) میں فروکش ہیں، ان کا مسئلہ بھی اسی قسم کا تھا۔ وہ ان دنوں رائے ونڈ رہتے تھے اور روزانہ رائے ونڈ سے لاہور آکر اپنے درپیش مسئلے کی تفصیلات بیان کرتے اور پراگرس بتاتے۔ ہم ان کے ساتھ بھی اظہارِ ہمدردی کرتے۔ جب وہ ہم سے بصورتِ درخواست کہتے کہ ”دعا فرمائیں“ تو ہمارے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی۔ وہ بھی ہمیں چائے پلاتے، اگر ہم بل ادا کرنا چاہتے تو ازراہِ اخلاص ہمیں روک دیتے۔ اللہ نے ان کا بھی ہاتھ پکڑا اور کامیابی عطا فرمائی۔ اب وہ

بھی خیر سے صاحبِ اولاد ہیں اور ہمیں چائے پلانے اور ہم سے دعا کرنے کی وجہ سے موصول ہیں۔ اُس زمانے میں ہماری بزم چائے نوشی میں کبھی کبھی عبدالقادر حسن بھی شریک ہوتے تھے بقول ان کے یہ ان کی ”غربت“ کا دور تھا۔ اگرچہ مسندِ امارت پر ہم بھی فائز نہ تھے، تاہم وہ جن حالات سے دوچار تھے، اس اعتبار سے ہمارے نزدیک اور خود اپنے نزدیک بھی ”زمرہ مستحقین“ میں آتے تھے۔ وہ بعض دفعہ تو مجھے گھر میں آپکڑتے اور بعض اوقات حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم کی دکان پر تشریف لے آتے اور پھر ہم باجماعت کسی ہوٹل میں جا ڈیرہ لگاتے — میں نے ایک دن ان سے کہا، گاؤں میں ایک مسجد بناؤ اور اس میں مدرسہ قائم کرو، وہ مدرسہ بے شک ناظرہ قرآن شریف پڑھنے والے دس لڑکوں پر مشتمل ہو، لیکن اس کا نام ”جامعہ قادریہ حسنیہ“ رکھو۔ لفظ ”جامعہ“ جس کے معنی یونیورسٹی کے ہیں، بورڈ پر لکھنا نہایت ضروری ہے۔ دھڑا دھڑ چندہ آئے گا اور پاؤ بارہ ہو جائے گی۔ غربت کے سب دکھ دل دھڑ دھڑ جائیں گے، بشرطیکہ اس ”عظیم الشان جامعہ“ میں زیادہ لڑکے داخل نہ کیے جائیں اور نصابِ تعلیم ناظرہ قرآن سے آگے نہ بڑھے۔ پھر وارث شاہ کے الفاظ میں یہ ہو گا کہ :

نالے متگناں تے نالے گھور ناجی دینے دار نہ کسے دا ہونا ہے

مست لشکرے جنگلاں وچ پھرنا تے غم نوں کھوہ ڈبوونا ہے

مولانا نے میری اس معقول تجویز سے جزدی نہیں، کئی اتفاق فرمایا۔ مگر بد قسمتی سے

عبدالقادر حسن سے خدمتِ اسلام کا یہ سلسلہ شروع نہ ہو سکا۔ اب ماشار اللہ وہ موج میں ہیں اور موجودہ سیاسی دور کی برکت سے ”امروز“ کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تمام ارکان چائے نوشاں میں سے کسی کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، لیکن چائے بہر حال پینی ہے۔ اس بزم کا جو رکن بالکل خالی جیب ہوتا وہ ہماری اصطلاح میں ”خلیفۃ المسلمین“ کہلاتا۔ بعض دفعہ ہم آپس میں چندہ بھی کر لیتے تھے۔ لیکن مولانا کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ ایک دفعہ ہم ایک ہوٹل میں گئے، چائے پی، لیکن بل ادا کرنے کا دقت آیا تو معلوم ہوا کہ سب ”خلیفۃ المسلمین“ ہیں۔ میرے ایک دوست حاجی محمد رفیق زبیری بھی موجود تھے، انھوں نے مشورہ دیا کہ چندہ کر لیا جائے اور ہر رکن

اس کا رخسار میں حسبِ توفیق چندہ دے۔ لیکن سچی بات ہے میں تو خلیفۃ المسلمین تھا، لہذا خاموش بیٹھا رہا۔ سوچا ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت، جو ان کے ساتھ گزرے گی، وہی ہمارے ساتھ گزرے گی، گھیرائے گی کیا ضرورت ہے۔ مگر مولانا نے ازراہِ کرم مسئلہ حل کر دیا فرمایا ”چندے کی عادت بڑی ہے“ اور چائے کے بالہ آنے اپنی جیب خاص سے ادا کر دیے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ میں لاہوری دروازے کی طرف سے انارکلی میں داخل ہوا اور مولانا کو دیکھتے دیکھتے بخشی مارکیٹ کے قریب پہنچا تو مولانا پر نظر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ مولانا شلوار قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو اس لباس میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پاجامہ کرتا یا پاجامہ قمیص ان کا لباس تھا۔ اب تو کبھی کبھی قومی لباس یعنی شلوار قمیص بھی پہن لیتے ہیں، لیکن اس زمانے میں نہیں پہنتے تھے۔ اس لباس میں مولانا مجھے عجیب سے محظوم ہوئے اور میری نظروں میں ان کا یہ لباس چبا نہیں۔ مگر میں نے اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا خود ہی فرمایا:

”ہمارا لباس آپ نے دیکھا؟“

عرض کیا، ”دیکھا۔“

فرمایا ”کیسا ہے؟“

نہایت ادب سے عرض کیا، ”بس ایک کسر ہے۔“

بولے ”کیا؟“

عرض کیا ”شلوار کے پانچوں پر گوٹہ لگوا لیجیے“

کہا ”گوٹہ؟“

عرض کیا ”جی ہاں گوٹہ“

میری گھگھری نوں لوادے گوٹہ

جے توں میری چال دیکھنی

بلاشبہ مولانا کی شان میں یہ ”گستاخانہ“ لفظ تھے، لیکن مولانا نے نہ صرف اسے

برداشت کیا، بلکہ خوش ہوئے۔ پھر میں نے معذرت چاہتے ہوئے عرض کیا:

کرم ہائے تو مارا کر دگستاخ

مولانا نے فرمایا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ روزانہ ملنے والوں اور ہر قسم کی گفتگو کرنے والوں کے درمیان تکلف کی دیوار حائل نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے، میں اس قسم کی باتوں سے خوش ہوتا ہوں۔

## جواب چائے یا ”سلسلہ بولیہ“

مولانا کی زندگی کا ایک اہم اور بنیادی موضوع ”پیشا بیات“ ہے۔ اس کا ذکر بے شک پہلے بھی ہوٹلوں کے ضمن میں کئی بار آچکا ہے، تاہم اس کی ”اہمیت“ کے پیش نظر مستقل عنوان کے تحت اس کو بیان کرنا ضروری ہے۔ مولانا کسی کے گھر جائیں، کسی دفتر تشریف لے جائیں، کسی میٹنگ میں شرکت فرمائیں، ہوٹل میں چائے یا کھانے کے لیے جائیں، مسجد میں نماز کے لیے حاضری دیں، کسی جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیں، ریڈیو یا ٹیلی ویژن میں تقریر کے لیے مدعو کیے جائیں، شادی بیاہ کی تقریبات میں شریک ہوں، ہوائی جہاز پر فضا میں اڑ رہے ہوں، ریل یا بس میں سوار ہوں، حتیٰ کہ عدالتِ عالیہ کی دعوت پر کسی خاص مسئلے کی وضاحت کے لیے گئے ہوں، دو تین مرتبہ پیشاب کرنا ان کے واجبات میں شامل ہے۔ جس مقام پر بھی ان کا ورودِ مسعود ہوتا ہے، عام طور پر بیٹھنے سے پہلے دریافت فرمایا جاتا ہے کہ غسل خانہ کدھر ہے۔ پھر ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسی جگہ بیٹھیں جہاں سے غسل خانہ قریب ہو۔ ایک مرتبہ ایوانِ صدر گئے تو وہاں بھی منتظمین سے غسل خانے کا محل وقوع دریافت فرمایا۔ میں نے کئی مرتبہ ان کو یہ ”ہمائتِ مشورہ“ دیا ہے کہ جس طرح کوٹھڑیوں میں کمرے کے ساتھ ”ایجنڈا تھ“ ہوتا ہے، اسی طرح آپ بھی اپنے ساتھ ”ایجنڈا پیشاب خانہ“ بنالیں، جہاں ضرورت محسوس ہو، فارغ ہو گئے۔ یا گشتی شفا خانے کی طرح ”گشتی پیشاب خانہ“ بنالیں۔ وہ آپ کے ساتھ ساتھ ”نشت“ کرتا رہے گا۔ جبکہ تلاش کرنے کی دقت ختم ہو جائے گی۔

لیکن انھوں نے میری اس تجویز پر عمل نہیں فرمایا۔

مولانا کے عملِ پیشاب کے کچھ لوازم ہیں۔ پہلے تو گھر سے اس فرض سے سبکدوش ہو کر چلیں گے۔ پھر منزلِ مقصود پر پہنچ کر کم سے کم تین مرتبہ پیشاب کرنا ضروری ہے۔ اول پینے کے

فورا بعد، دوم درمیان میں، سوم بوقتِ رخصت۔ اگر مقامِ ورد پر چائے کا اہتمام ہو تو ایک بار چائے سے پہلے اور دوبار چائے کے بعد۔ ہم ان کے اس عملِ مسلسل کو ”علمی زبان“ میں ”بولو قبل ان تبولوا“ سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی پیشاب سے پہلے پیشاب کرو، بالفاظِ دیگر یہ کام کرتے ہی رہو۔

مولانا کے پیشاب کی ہم نے دو قسمیں کی ہیں۔ اگر چائے کے بعد یعنی نتیجہ چائے ہو، تو اس کا نام ہے ”جواب چائے“۔ اگر نتیجہ چائے نہ ہو، بلکہ سردی کی وجہ سے ہو یا کسی خاص واقعہ سے اثر پذیر یا غم گین ہونے کے باعث ہو، تو اس کا نام نامی ہوگا ”سلسلہ لولیہ“۔ مولانا علمِ جغرافیہ، علمِ تاریخ اور کسی مقام کے محل وقوع وغیرہ سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ بلکہ اگر کوئی اس موضوع کی بات کرے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن عملِ پیشاب نے غیر شعوری طور پر ان علوم کا بھی ان کو کسی نہ کسی سطح پر عالم بنا دیا ہے۔ یعنی جس طرح بعض معاملات کا تعلق تاریخ کی مجبوری سے ہوتا ہے، اسی طرح ان کا تعلق عمل کی مجبوری سے ہے۔ مثلاً انھیں معلوم ہے کہ ان کے سکونتی شہر لاہور اور آبائی شہر گوجرانوالہ کے کس علاقے اور کس گلی میں مسجد کہاں ہے اور کس زمانے اور کس دور کی تعمیر شدہ ہے اور وہ ”فارغ البول“ ہونے کی غرض سے اس میں کتنی مرتبہ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ”وسعتِ علم“ کا یہ عالم ہے کہ انھیں یہ بھی پتا ہے کہ ان مسجدوں کے پیشاب خانے کس طرف ہیں اور کتنے ہیں؟ ایک دن ہم نے مغرب کی نماز مسجد مبارک میں پڑھی۔ نماز کے بعد موچی دروازے پہنچے اور اس کے سامنے کی گھاٹی سے اتر کر چیمبر لین روڈ پر آئے۔ سردیوں کے دن تھے۔ گوال منڈی کے چوک میں پرانی سبزی منڈی پہنچے تو ارشاد ہوا۔

”مولوی اسحاق، پیشاب لگ رہا ہے“

عرض کیا، ”اب صبر کیجیے، پیشاب کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔“

فرمایا ”یہاں ایک مسجد ہے“

میں نے کہا ”مسجد یہاں نہیں ہے“

زور دے کر فرمایا، ”بے اور اس گلی میں ہے، پیشاب خانہ مسجد کے دروازے

کے باہر ہے اور بغیر کوڑے کے ہے۔ میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہوں۔ آئیے دکھاؤں۔“  
ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوئے اور سیدھے پیشاب خانے پر جا کھڑے ہوئے اور فرمایا  
”یہ ہے وہ مقام جس کا میں محل وقوع اور حدود و اربعہ بیان کر رہا تھا۔“  
سچی بات ہے کہ اس موضوع سے متعلق میں اُن کی ہمہ گیری علم اور فراوانی معلومات  
سے نہایت متاثر بلکہ مرعوب ہوا، اور اس کی دل کھول کر داد دی۔

مولانا اگر کسی خاص واقعہ سے متاثر ہوں یا کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہوں تو پیشاب  
گھٹا باندھ کر آجاتا ہے اور پھر یہ ”سیل رواں“ تھخنے کا نام نہیں لیتا۔ ۱۹۵۶ کی بات ہے  
کہ فلسفہ کانگریس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ کے تشریف لے جانے کا پروگرام بنا۔ یہ ان کا پہلا  
ہوائی سفر تھا، اس سے قبل ہوائی جہاز پر سوار ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ روانگی سے  
ایک دن پہلے حسب معمول شام کے بعد انارکلی کے ایک ہوٹل میں ملاقات ہوئی اور فرمایا:  
”آج خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے ہوائی سفر کے بارے میں فارسی کا ایک محاورہ بیان کیا ”ہرچہ  
برباد است، برباد است“ یہ محاورہ ذہن میں تیزی سے گھوم رہا ہے اور ہزار گوشش کے باوجود  
ذہن سے نکلنے کا نام نہیں لیتا۔ اب میں اس سفر سے ڈر رہا ہوں۔“ بولے ”مکٹ لے لیا  
ہے اور جانا ضروری ہے، کیا کروں، یہ محاورہ سننے کے بعد پیشاب بھی کثرت سے آنے لگا ہے۔“  
دوسرے دن ہوائی اڈے پہنچے تو پھر وہی بات۔ عرض کیا ”فکر نہ کریں، بے شمار لوگ ہوائی  
جہاز میں سفر کرتے ہیں، یہ دیکھیے یہاں کتنے لوگ کھڑے اور بیٹھے ہیں، جو مختلف مقامات  
کو جانے کے لیے ہوائی جہازوں میں سوار ہوں گے۔ ان شاء اللہ آپ خیریت سے واپس  
آئیں گے۔“ لیکن کچھ اثر نہیں ہوا، وہاں بھی دو تین دفعہ غسل خانے گئے۔

ان کے ایک ساتھی فیصل آباد کے ایک صاحب تھے جو وہاں کے ایک کالج میں فلسفہ  
کے پروفیسر تھے۔ وہ بھی فلسفہ کانگریس میں جا رہے تھے اور دلچسپ آدمی تھے۔ ان کی بیوی  
ان کو رخصت کرنے آئی تھیں۔ وہ بھی پریشان سی تھیں، شوہر سے کہنے لگیں۔

”ڈھاکہ جا کر ٹیلی فون یا تار کے ذریعے اپنی خیریت کی اطلاع دیجیے گا۔“

پروفیسر صاحب بولے، ”اللہ کی بندی! ٹیلی فون یا تار کی کیا ضرورت ہے، رات کو ریڈیو



”سن لینا اور صبح کو اخبار دیکھ لینا، اگر اس ہوائی جہاز کے حادثے کی خبر نہ ہو تو سمجھ لینا خیریت سے پہنچ گئے ہیں“

فلسفہ کانگریس سے فارغ ہو کر واپس آئے تو مولانا نے بتایا، ”جاتے ہوئے مارے ڈر کے، ہوائی جہاز میں پیشاب کرتے کرتے برا حال ہو گیا۔ واپسی پر البتہ ذہن میں کچھ سکون تھا، اس لیے پیشاب بھی کم آیا۔“ ساتھ ہی بتایا کہ ہم ڈھاکے جا کر کانگریس ہال میں پہنچے تو پہلا اجلاس ختم ہو چکا تھا اور لوگ ہال سے باہر نکل رہے تھے۔ کہا آپ دیر سے آئے ہیں۔ میں نے کہا، آپ بتا دیجیے، کیا کاروائی ہوئی۔ ہم آمین کہنے والوں میں سے ہیں۔ آمین کہہ دیں گے۔

فلسفہ کانگریس کے سلسلے میں ایک اور لطیفہ سنئے۔

ہر شخص کوئی نہ کوئی نفقی مسک رکھتا ہے اور ظاہر ہے اس مسک سے اسے محبت ہوتی ہے اور اس کے ماننے والوں سے بھی اسے انس ہوتا ہے۔ وہ کسی جگہ ہو اور کسی مجلس میں ہو، اپنے نفقی مسک سے وابستگی رکھنے والے لوگوں سے ملاقات کی خواہش لازماً اس کے دل میں کروٹ لے گی۔ ایک مرتبہ کراچی میں فلسفہ کانگریس کا اجلاس ہوا۔ مولانا رکن کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔ کئی دن اجلاس جاری رہا۔ اس اثنا میں مولانا کا جی اہل حدیث حضرات سے ملنے کو چاہا۔ ان دنوں اتفاق سے لاہور کے ہمارے ایک دوست میجر محمد حسین بابری بھی کراچی گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اخبار میں فلسفہ کانگریس کا ذکر پڑھا اور دیکھا کہ مولانا حلیف ندوی بھی اس میں مقالہ پڑھیں گے تو وہ پوچھتے پچھاتے وہاں جا پہنچے جہاں فلسفہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا اور مولانا سے ملے۔ مولانا نے ان سے کہا، یہاں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا ہوں، اہل حدیث کی کوئی مسجد قریب ہو تو وہاں جا کر اہل حدیث حضرات سے ملنا چاہیے۔ میجر صاحب نے انھیں بتایا کہ میں نے یہاں آتے ہوئے ایک مسجد دیکھی ہے، جس پر ”غزبانے اہل حدیث“ کا بورڈ آویزاں ہے۔ چنانچہ وہ مولانا کو اس مسجد میں لے گئے۔ ان میں سے بعض حضرات مولانا کو جانتے تھے، بہت اچھی طرح ملے اور چائے وغیرہ پلائی۔ ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا۔

”مولانا! آپ یہاں کب آئے اور کس سلسلے میں تشریف آوری ہوئی؟“

فرمایا ”یہاں فلسفہ کا نگہ لیں کا اجلاس ہو رہا ہے، اس میں شرکت کے لیے آیا ہوں۔“  
پوچھا، ”وہ کیا ہوتی ہے؟“

مولانا نے اس کی تھوڑی بہت وضاحت کی اور فرمایا ”اس میں مختلف ملکوں کے مشہور فلسفی شامل ہوتے ہیں اور مقالے پڑھتے ہیں۔“

پوچھا ”کن کن ملکوں کے فلسفی شامل ہوتے ہیں؟“

بتایا ”امریکہ، برطانیہ، فرانس، چین، روس، پاکستان اور ہندوستان وغیرہ ملکوں کے۔“

اس پر ایک صاحب نہایت مخلصانہ لہجے میں بولے: ”مولانا! اللہ تعالیٰ نے ماشاء اللہ

آپ کو تبلیغ کا بہت اچھا موقع دیا ہے۔ سب کو اہل حدیث بنا دیجیے۔“

یہ لطیفہ لاہور آکر مجھے خود مولانا نے بھی سنایا اور میر صاحب نے بھی سنایا۔

دسمبر ۱۹۸۱ء کے آخری ہفتے میں کچھ دوستوں کی دعوت پر ہم اسلام آباد گئے۔ مجھے وہاں

کیونٹی سنٹر میں ”حدیث اور فقہ کے باہمی ربط“ کے عنوان سے مقالہ پڑھنا تھا اور مولانا کی صدارت تھی۔

ہم ریل کار سے گئے تھے اور ریل کار ہی سے واپس آئے۔ پانچ گھنٹے کے اس سفر میں

مولانا کے لیے کم سے کم چار مرتبہ چلے پینا اور آٹھ مرتبہ اس کے ”جواب عرض کرنا“ ضروری

تھا۔ واپسی پر ہمیں چائے خانے کے قریب سیٹیں ملیں، اس سے دوسری جانب آخر میں

سیت الخلا تھا، اس کے قریب چند خوانین بیٹھی تھیں۔ مولانا پانچ چھ مرتبہ تو گئے، پھر پنجابی

میں کہا۔ ”بار بار جان دیاں شرم آؤندی اے، عورتاں کن گیاں بابے نوں کی آخر آئی اے۔“

ایک دفعہ ہمیں ایک میٹنگ میں ماموں کا نجن (ضلع فیصل آباد) جانا تھا۔ فرمایا ”ٹرین

کا کتنے گھنٹے کا سفر ہے؟“

عرض کیا ”تقریباً چار گھنٹے کا۔“

بولے ”سدا کھو چھ پیشاباں دا۔“ پھر کہا، چاول کھانے والے علاقے کے لوگ

رات کو کئی بار پیشاب کے لیے اٹھتے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ کتنی رات باقی ہے تو

”پیشابوں“ کے حساب سے بتاتے ہیں کہ دو پیشابوں یا تین پیشابوں کی رات ابھی باقی ہے۔

یہی حساب ہمارے سفر کا ہے۔

میں اس زعم میں تھا کہ مسئلہ پیشابیات اور سلسلہ بولیہ میں مولانا کا کوئی حریف نہیں۔ جب ایک چائے کا ”جواب چائے“ دو مرتبہ ظہور پذیر ہو تو بہ ظاہر معاملہ تسلی بخش ہے اور ہم غالب کی زبان میں دھڑلے سے کہہ سکتے ہیں :

کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مردِ افکنِ عشق

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

لیکن میرے مہربان دوست جناب میرزا ادیب کا فرمانِ واجب الاذعان ہے کہ وہ اس میدان میں مولانا سے آگے ہیں۔ وہ ایک چائے نوش فرمائیں تو کم سے کم تین مرتبہ جواب چائے عرض فرماتے ہیں مگر وہ مولانا کی رفتار سے بھی مایوس نہیں ہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ مطمئن ہیں ————— جب سے میرزا صاحب کو مولانا کے اس وصف کا علم ہوا ہے، ان کے دل میں مولانا کی وقعت بہت بڑھ گئی ہے۔ تاہم بقول ان کے ان کا نمبر مولانا سے بہر حال پہلے آتا ہے۔ اب ہم مولانا کی خدمتِ اقدس میں عرض کریں گے۔

سنبھل کے رکھیو قدمِ دشتِ خار میں مچنوں

کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

### تعبیرِ رویا

تعبیرِ رویا یعنی خواب کی تعبیر کو قرآن نے ”تاویل الاحادیث“ قرار دیا ہے۔ یہ اللہ کا ایک عظیم عطیہ ہے۔ اس سے اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خاص طور سے نوازا تھا، جس کا ذکر سورۃ یوسف میں تفصیل سے فرمایا گیا ہے۔ صحابہ و تابعین اور ہمارے اسلاف کرام میں متعدد حضرات تعبیرِ رویا میں مہارت رکھتے تھے اور اس کا ذکر مختلف کتابوں میں موجود ہے اور اس کی مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ مولانا حنیف ندوی بھی اس علم سے بہرہ ور ہیں اور مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری مرحوم کو بھی اللہ نے تعبیرِ رویا کا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ مثال کے طور پر ہمیں یہاں اپنا ایک خواب بیان کرتا ہوں۔ خواب سے پہلے اصل واقعہ سنئے۔

۱۹۵۴، ۱۹۵۵ اور ۱۹۵۶ میں مولانا غلام رسول مرحوم کی تین کتابیں شائع ہوئیں۔ اول

”سید احمد شہید“ دوم ”جماعت مجاہدین“ اور ”سوم“ سرگزشت مجاہدین“ میں اس زمانے میں ہفت روزہ ”الاغتصام“ کا ایڈیٹر تھا۔ مہر صاحب مرحوم نے یکے بعد دیگرے یہ تینوں کتابیں مجھے تبصرے کے لیے بھجوائیں۔ میں نے ان پر تفصیل سے تبصرہ کیا۔ ”سرگزشت مجاہدین“ کے لیے مہر صاحب نے مجھ سے کچھ معلومات بھی حاصل کیں جو اس کتاب میں میرے نام کے حوالے سے درج ہیں۔ اب خواب شروع ہوتا ہے جو میں نے اکتوبر ۱۹۵۶ میں دیکھا۔

خواب یہ ہے کہ میں نماز عصر کے بعد اپنے دفتر واقع شیش محل روڈ سے بھاٹی دروازے کی طرف بائیں جانب فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں۔ ابھی چند قدم چلا تھا کہ دیکھتا ہوں سامنے اسی طرف سے ایک بزرگ آرہے ہیں، جن کی سفید داڑھی ہے۔ وہ سفید عمامہ، پاجامہ نما سفید شلوار اور لمبا سفید کرتہ پہنے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں عصا ہے، سرخ و سفید رنگ اور بائیں شخصیت۔ میں نے ان کو دیکھتے ہی دل میں کہا یہ تو سید احمد شہید بریلوی ہیں جو میرے پاس تشریف لائے ہیں اور میں باہر جا رہا ہوں۔ میں چل بھی رہا ہوں اور یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ یہ فارسی بولیں گے اور مجھے فارسی بولنے کی مشق نہیں۔ پھر فوراً خیال آتا ہے، یہ پرانے زمانے کی فارسی میں بات کریں گے، اس میں کام چلاؤں گا۔ اتنے میں میں سید صاحب کے قریب ہو جاتا ہوں اور سید صاحب میرے قریب آجاتے ہیں اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”السلام علیکم“

میں جواب میں ”وعلیکم السلام“ کہتا ہوں اور دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیتا ہوں۔ پھر گردن جھکا کر نیازمندی سے ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ سید صاحب نہایت شفقت سے مسکراتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”آپ نے مہر صاحب کی کتابوں پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ مجھے بہت پسند آیا، آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے“

سید صاحب نے یہ بات مختلف الفاظ میں کئی دفعہ ارشاد فرمائی۔ میں نیازمندانہ انداز میں عرض کرتا ہوں۔

”آپ کا شکریہ، بہت بہت شکریہ، آپ نے میرا تبصرہ پسند فرمایا، میں آپ کا

انسانی شکر گزار ہوں۔“ خواب ختم۔!

اتنے میں آنکھ کھل گئی اور میں اُٹھ گیا۔ یہ میرے لیے ایک عجیب و غریب خواب تھا۔ یوں  
یہ خواب تعبیر طلب ہے۔ مولانا ندوی سے اس کی تعبیر لینی چاہیے۔ شام کو معمول کے مطابق  
مولانا سے ملاقات ہوئی تو خواب بیان کیا۔ فرمایا، بہت اچھا خواب ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے  
کہ آپ اردو میں رجال پر کام کریں گے، جس طرح مہر صاحب نے برصغیر پاک و ہند کے  
مجاہدین کی ایک بہت بڑی جماعت اور اس سے تعلق رکھنے والے رجال کے حالات لکھے  
ہیں، اسی طرح آپ بھی ایک خاص طبقے کے رجال کا تذکرہ ضبطِ تحریر میں لائیں گے جو اہل علم میں  
مقبول ہوگا۔

اس تعبیر سے قدرتی بات ہے میں بہت خوش ہوا، لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ مجھے اس  
کا موقع کیوں کر ملے گا اور ایسے حالات کہاں میسر آئیں گے کہ میں اتنا بڑا کام کر سکوں۔

اس سے چند روز بعد مولانا جعفر شاہ پھلواری مرحوم سے ملاقات ہوئی تو ان سے بھی  
یہ خواب بیان کیا۔ انھوں نے بھی وہی تعبیر دی جو مولانا نے دی تھی، لیکن اس پر مزید یہ فرمایا  
کہ ”پرانی فارسی کے بارے میں جو آپ کے ذہن میں خیال آیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ  
رجال کا تذکرہ لکھتے وقت فارسی کی قدیم اور پرانی کتابوں سے مدد لیں گے اور یہ کتابیں آپ  
کا ماخذ ہوں گی، جن کے آپ حوالے دیں گے۔“

یہ خواب حرف بحرف مجھے یاد رہا اور اس کی تعبیر بھی ذہن میں گردش کرتی رہی۔ اس  
سے ٹھیک نو سال بعد ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ کو میرا ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے تعلق پیدا ہوا۔ یہاں  
آکر میں نے پہلے محمد بن اسحاق ابن ندیم و ژاق کی مشہور عربی کتاب ”الفہرست“ کا اردو ترجمہ  
کیا اور حل طلب مقامات پر حواشی لکھے۔ ترجمہ اور حواشی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔  
اس کے بعد ایک اور کتاب ”برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ“ لکھی۔ پھر ”فقہائے ہند“ کے  
نام سے برصغیر پاک و ہند کے اصحابِ علم اور اربابِ فقہ کے حالات و سوانح اور علمی و فقہی  
کارنامے معرضِ کتابت میں لانا شروع کیے۔ حوالوں کے لیے عربی کتابوں سے بھی مدد ملی لیکن  
زیادہ تر قدیم فارسی ماخذ و مصادر میرے سامنے رہے۔ اب تک ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

کی طرف سے پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک اس کی نو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے — دعا ہے اللہ تعالیٰ تکمیل کے سامان فراہم فرمائے۔ آمین یہ میرے خواب کی وہ تعبیر ہے جو آج سے اٹھائیس برس پہلے مولانا محمد حنیف ندوی نے دی تھی۔

## ایک عجیب و غریب واقعہ

مولانا کے واقعات میں سے ایک اور واقعہ جو یہاں بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ ایک دن میں مولانا کے گھر گیا، ان کے بچوں نے جو مجھے ”چاچا جی“ کہتے ہیں، کہا:

”چاچا جی آپ پندرہ منٹ لیٹ آتے ہیں۔“

پوچھا ”کیا مطلب؟“

مولانا بھی موجود تھے اور خاموش بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ بچوں نے بتایا۔

آج ابی پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی جو ایک گھنٹے تک رہی اور آپ کے آنے سے پندرہ منٹ پہلے ختم ہو گئی۔

میں اس کیفیت کے بارے میں سمجھ گیا تھا، کیوں کہ اس سے قبل خود مولانا مجھے بتا چکے تھے، تاہم میں نے پوچھا۔

”کیا کیفیت؟“

اب سینے مولانا پر کیا کیفیت طاری ہوتی تھی۔ مولانا نے ایک دفعہ بتایا کہ بعض اوقات ان کو سوتے میں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شے ایک نوجوان لڑکی کی شکل میں ان کے پاس آتی اور ان سے ہم کلام ہوتی ہے اور اپنا نام کلتوم بتاتی ہے۔ وہ باتیں کرتی ہے تو گھر کے لوگ اس کی نہیں مولانا کی باتیں سنتے ہیں اور پھر اسی عالم میں ان سے کچھ پوچھتے ہیں تو وہ جو جواب دیتے ہیں بالکل صحیح ہوتا ہے — اس کو ہم ”ہوائی کیفیت“ سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن یہ ایسی ”ہوائی“ نہیں تھی جو ”کسی دشمن نے اڑائی“ ہو۔ فی الواقع ان پر یہ کیفیت طاری ہوتی تھی جو گھنٹے آدھ گھنٹے یا اس سے کم یا زیادہ وقت تک رہتی تھی۔ اس سے کسی قسم کی ذہنی یا جسمانی

تکلیف کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن ہم شام کے بعد انارکلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے، دوسرے دن عید تھی۔ مولانا نے مہنس کر کہا:

”کل عید ہے، لیکن جیب میں کوئی پیسہ نہیں ہے۔“ بات ختم ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم ہوٹل سے نکلے اور بھائی دروازے آئے۔ مولانا اپنے گھر جانے کے لیے تانگے پر سوار ہوئے اور میں اپنے گھر لوہاری دروازے چلا گیا۔ میں ان دنوں لوہاری دروازے کے اندر گمٹی بازار کے قریب رہتا تھا۔

اس زمانے میں ہم عید کی نماز منٹو پارک میں پڑھتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر پہلے میرے گھر آتے اور چائے پیتے۔ پھر مولانا اپنے گھر (بھونڈ پورہ چوک) چلے جاتے۔ کئی سال اسی طرح ہوتا رہا۔ اب تقریباً بائیس تیس برس سے (جب سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی فوت ہوئے ہیں) نہ میں منٹو پارک عید پڑھنے گیا ہوں، نہ مولانا حنیف ندوی گئے ہیں۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ عید کی نماز پڑھ کر ہم منٹو پارک سے روانہ ہوئے تو راستے میں مولانا نے ایک عجیب و غریب بات سنائی۔ فرمایا، رات میں نے ہوٹل میں آپ سے کہا تھا کہ ”کل عید ہے لیکن جیب میں کوئی پیسہ نہیں ہے۔“ یہ صحیح بات تھی، واقعی کوئی پیسہ نہیں تھا۔ میں جنازہ گاہ سے آگے سعدی پارک جا کر بائیں جانب تانگے سے اتر آیا تو یکایک ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوئی۔ بولی

”میں کلنٹوم ہوں، میرے ساتھ آئیے۔“

وہ سڑک پار کر کے دائیں جانب کو قبرستان (میانی صاحب) کی طرف مڑی اور میں اُس کے پیچھے پیچھے — سڑک پر بے شمار لوگ چل پھر رہے تھے اور مجھے شرم آتی تھی کہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ اتنے میں وہ قبرستان میں داخل ہوئی اور ایک پرانی قبر پر مجھے جا کھڑا کیا۔ اس نے مجھے پانچ پانچ روپے کے پانچ نوٹ یعنی پچیس روپے دیے اور اس کے بعد وہیں غائب ہو گئی۔ مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ پھر وہاں سے چلا اور گھر آ گیا۔ مولانا نے یہ واقعہ سنانے کے بعد وہ پانچ نوٹ نکالے اور مجھے دکھائے، بالکل نئے تھے۔ اس کے بعد ان پر یہ کیفیت کبھی طاری

نہیں ہوئی۔ یہ کم و بیش پچیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔

## قرآن مجید سے رہنمائی

مولانا کو اگر کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو یا کسی پریشانی میں مبتلا ہوں تو عام طور پر قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرتے اور بارگاہِ خداوندی میں پریشانی سے نجات پانے کی دعا کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضو کر کے قرآن مجید پکڑتے اور قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر درود شریف کے بعد آعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھتے ہیں۔ بعد ازاں سورہ فاتحہ تلاوت کرتے ہیں اور اھدنا الصراط المستقیم بار بار پڑھتے اور دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ قرآن مجید انسانوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ میں جس کام کے بارے میں فریاد کر رہا ہوں، اس میں میری رہنمائی فرما۔ اس کے بعد قرآن مجید کھولتے ہیں اور آمنے سامنے کے دونوں صفحوں کی آیات غور سے پڑھتے ہیں اور ان کے الفاظ سے درپیش مسئلے کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ان کے ایک عزیز کا لڑکا بغیر اطلاع دیے گھر سے نکل گیا، کئی دن پتہ نہ چلا کہ کہاں ہے۔ وہ سخت پریشانی کی حالت میں مولانا کے پاس آئے۔ مولانا نے یہی عمل کیا اور فرمایا، لڑکا مری یا کسی اور پہاڑی مقام پر گیا ہے اور خیریت سے ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں، جلد واپس آجائے گا۔ چنانچہ وہ اسی دن شام کو بخیر و عافیت واپس آگیا، اس نے بتایا کہ وہ دوستوں کے ساتھ سیر کے لیے مری گیا تھا۔

میں نے بھی ایک دفعہ تجربہ کیا۔ ۱۹۷۶ء کی بات ہے، میرے بعض دوستوں نے چونیاں (ضلع قصور) کے ایک شخص کو (جس کو اس سے پہلے میں نہیں جانتا تھا اور بعد میں بھی وہ مجھے نہیں ملا) خط دے کر میرے پاس بھیجا۔ قصہ یہ تھا کہ ان دونوں میاں بیوی نے حج بیت اللہ کے لیے درخواست دی تھی جو منظور ہو گئی تھی۔ لیکن ان کا ایک ہی لڑکا تھا جس کی عمر چھ سات سال کی تھی اور قانون کے مطابق وہ اس کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے۔ مگر وہ لڑکے کو گھر بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے، اس لیے کہ ان کے بعد اس کو کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔ اس زمانے میں امور حج کے وزیر مولانا کوثر نیاز سی تھے۔ وہ شخص چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ



اسلام آباد جاؤں اور مولانا کو ثر نیازی سے کہوں کہ بچے کو والدین کے ساتھ حج پر جانے کی اجازت دی جائے۔ میرے دوستوں کا جو خط لے کر وہ آیا تھا، اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ میں اس کام کے لیے اس کے ساتھ اسلام آباد جاؤں۔ لیکن میں اس کام کے لیے اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہر چند معذرت کی، مگر اس کے سخت مجبور کرنے پر مجھے اس کے ساتھ اسلام آباد جانا پڑا۔ راستے بھریہ پریشانی لاحق رہی کہ معلوم نہیں وزیر صاحب کس طرح پیش آتے ہیں اور کام ہوتا بھی ہے یا نہیں ہوتا۔ صبح کو راولپنڈی پہنچے اور اخبار لیا تو دیکھا کہ دوبارہ اعلان کیا گیا تھا کہ سولہ سال سے کم عمر بچے والدین کے ساتھ حج پر نہیں جاسکتے۔ اب میری گھبراہٹ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ساتھی نے کہا کسی ہوٹل میں جا کر ناشتہ کریں، لیکن میں کھانا پینا سب بھول چکا تھا۔ نماز کے لیے مسجد میں گیا، نماز پڑھی اور معمول کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کی۔ طبیعت بے حد پریشان۔ تلاوت کے بعد مولانا ندوی والا عمل کیا تو سورہ کہف کی اس آیت پر نظر پڑی۔

رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۖ وَهِيَ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا مُشَدَّاه

یعنی اے پروردگار ہم پر اپنی بارگاہ سے رحمت نازل فرما اور ہمارے اس کام کے لیے کامیابی کا سامان مہیا کر دے۔

قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ان شاء اللہ ہم اپنے اس نیک مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ وزیر موصوف کے دفتر پہنچے تو استقبال میں بہت سے لوگ ملاقات کے لیے بیٹھے تھے، بعض لاہور کے لوگ بھی تھے جو میرے ملنے والے تھے۔

میں نے متعلقہ آدمی کو اپنا نام بتایا تو اس نے پوچھا:

”مولانا کو ثر نیازی آپ کو جانتے ہیں؟“

میں نے کہا ”جب وزیر نہیں تھے تو جانتے تھے، وزیر بننے کے بعد آج پتا چلے گا،

جانتے ہیں یا نہیں جانتے“

میرے نام کی چٹ وزیر صاحب کی خدمت میں پہنچی تو فوراً بلا لیا اور پہلے لوگ بیٹھے کے بیٹھے ہی رہے۔ میں نے صاحب معاملہ کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔ مولانا کو ثر نیازی

نہایت احترام سے ملے، خیر خیریت کے مبادلے کے بعد آمد کا مقصد پوچھا۔ مدعا بیان کیا تو کہا: ”آج کا اخبار پڑھا ہے؟“

جواب دیا، ”روزانہ صبح کو اخبار پڑھتا ہوں، آج بھی پڑھا ہے اور میرے پاس موجود ہے، حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے۔“

فرمایا ”درخواست لکھی ہے؟“

عرض کیا ”نہیں!“

سیکرٹری سے کاغذ منگوا یا اور خود ہی درخواست لکھوائی۔ وہ بولتے گئے، میں لکھتا گیا۔ صاحب معاملہ تحصیل چونیاں کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، ان سے پوچھا: ”بچے کے کرائے وغیرہ کے روپے چونیاں کے بینک میں جمع کرائیں گے یا توکی میں؟“ جواب دیا ”پہلے توکی میں جمع کر لائے ہیں، یہ بھی وہیں جمع ہوں گے۔“ مولانا نیازی نے لکھ کر دستخط کر دیے۔ ہم نہایت خوش ہوئے اور اجازت لے کر باہر آ گئے۔ لاہور کے ایک صاحب کو جو ایک مشہور ماہانہ رسالے کے ایڈیٹر اور مالک ہیں اور میرے ملنے والے ہیں اور ہم سے پہلے سے استقبالیہ میں بیٹھے تھے، دوسرے دن کی تاریخ ملی۔ انھوں نے مجھ سے کہا ”میرے پاس گاڑی ہے، جہاں آپ جانا چاہتے ہیں، چھوڑ آؤں۔“

اسلام آباد میں مختلف محکموں کے دوستوں سے مل کر ہم رات کو لاہور آ گئے۔

### مولوی علامہ الدین مرحوم کا وعظ اور زلزلہ

گو جبرائیل کے ایک پرانے بزرگ مولوی علاؤ الدین مرحوم تھے۔ بہت نیک اور متقی بزرگ تھے۔ مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے کے شاگرد تھے۔ گو جبرائیل کی چوک نیائیں کی جامع مسجد اہل حدیث میں مولانا محمد اسماعیل مرحوم ۱۹۲۱ء میں آئے، ان کی آمد سے پہلے اس مسجد میں مولوی علاؤ الدین ہی امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، اسی بنا پر اس مسجد کو ”مولوی علاؤ الدین کی مسجد“ کہا جاتا ہے۔ مولانا حنیف ندوی نے بتایا کہ ساٹھ باسٹھ سال قبل کی بات ہے، مولوی علاؤ الدین مرحوم اس مسجد میں خطبہ جمعہ دے رہے تھے اور قرآن مجید میں جو زلزلہ قیامت کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس کے متعلق وعظ بیان کر رہے تھے۔

و غظ نہایت موثر تھا اور لوگ شدتِ تاثر سے اس طرح رو رہے تھے جیسے واقعی اس زلزلے کی زد میں آگئے ہوں۔ اتنے میں سچ مچ زلزلہ آگیا، زمین ہلنے لگی اور مسجد کی دیواریں لرز گئیں۔ لوگوں نے سمجھا قیامت آگئی ہے اور وہ زار و قطار رونے لگے۔

مولانا ندوی نے بتایا کہ وہ اس وقت مسجد میں موجود تھے، یہ منظر واقعی قیامت کا منظر تھا۔

### گرفتاری اور قید

مولانا نے آزادی برصغیر کی تحریک میں عملاً حصہ لیا۔ انگریزی حکومت کی مخالفت کی اور اس کی پاداش میں گرفتار ہوئے اور چھ مہینے قصور جیل میں رہے۔

مولانا کا تعلق اس زمانے میں نوجوان بھارت سمجھا سے تھا۔ یہ ۱۹۳۰ کا واقعہ ہے۔ گرفتاری کے وقت مولانا بیمار تھے اور ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق انھیں تپ دق ہوگئی تھی، لیکن اسی حالت میں انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کیں اور گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو مجسٹریٹ نے کہا آپ بیمار ہیں، اگر معافی مانگ لیں تو بری کر دیے جائیں گے۔ ان کے بعض ملنے والوں نے بھی یہ رائے دی، لیکن مولانا نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا اور اپنے موقف پر قائم رہے۔ سزا سنانے کے بعد انھیں قصور بھیج دیا گیا۔ قصور، گوجرانوالہ سے تقریباً اسی میل کے فاصلے پر ہے اور اس زمانے میں اتنا لمبا سفر کر کے کسی قیدی سے ملاقات کرنا نہایت مشکل تھا۔ جیل میں خوراک وغیرہ کا انتظام بھی اس دور میں بہت ناقص تھا۔

گوجرانوالہ کے ممتاز دیوبندی عالم مولانا محمد چراغ کا تعلق بھی اس دور میں نوجوان بھارت سمجھا سے تھا، وہ بھی ان کے ساتھ ہی گرفتار اور قید ہوئے تھے۔ ان کا جرم ”بھی انگریزی حکومت کی مخالفت تھا۔ انھیں نو مہینے کی سزا ہوئی تھی اور وہ بھی قصور جیل میں تھے۔

### دعا اور اُس کا اثر

قید کی مدت ختم ہونے پر مولانا ندوی رہا ہوئے تو بیماری بھی بڑھ گئی اور کمزوری بھی زیادہ ہوگئی۔ ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے کہا تپ دق دوسرے درجے کو پہنچ گئی ہے۔ یہ نہایت تشویش ناک بات تھی۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم جو ان کے انتہائی مشفق

استاد تھے، انھیں تبدیلی آب و ہوا کے لیے ضلع ہزارہ کے ایک قصبے ”کھلا بٹ“ لے گئے اور وہاں کے رئیس خاں مہدی زمان خاں کے ہاں ٹھہرے جو مولانا اسماعیل کے مخلص دوست تھے اور مولانا ندوی سے بھی تعلق رکھتے تھے۔

کھلا بٹ ایک صحت افزا مقام ہے۔ ایک دن خاں صاحب مدوح مولانا اسماعیل مرحوم اور مولانا ندوی کو پہاڑ کے نشیب میں ایک نلے پر لے گئے اور بتایا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سے جہاد کے لیے مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید کا قافلہ گزرا تھا۔ یہ سن کر مولانا ندوی پر رقت طاری ہو گئی اور وہیں بیٹھ گئے۔ پھر اللہ کی بارگاہ عالی میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ مولانا فرماتے ہیں، میں دعا سے فارغ ہوا تو ایسے محسوس ہوا کہ بخار اُتر گیا ہے اور بیماری ختم ہو گئی ہے۔ یہ بات مہدی زمان خاں صاحب اور مولانا اسماعیل صاحب کو بتائی تو وہ معائنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر کی دکان پہاڑ کے اوپر تھی۔ اس نے تھرمامیٹر منہ میں رکھا اور کہا، بخار سودر جے سے کچھ اوپر ہے۔ مولانا نے کہا بخار بالکل نہیں ہے۔ وہ چوں کہ پہاڑ کے نشیب سے آئے ہیں اور چڑھائی کی وجہ سے سانس پھول گیا ہے، اس لیے بخار کا شبہ ہوتا ہے۔ دس منٹ بعد دیکھیے گا۔ چنانچہ دس بارہ منٹ کے بعد دیکھا گیا تو بالکل ٹھیک تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیماری دُور کر دی اور صحت و تندرستی کی نعمت عطا فرمائی۔

”مولوی جی“

مولانا کے مسجد مبارک کے مقتدیوں میں سے ایک بزرگ مولوی عبداللہ گھڑی ساز ہیں۔ بہت نیک اور دھیمے آدمی ہیں۔ اصلًا پٹیالہ (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے ہیں اور قیام پاکستان کے قبل سے لاہور میں مقیم ہیں۔ پہلے گھڑی سازی کا کام کرتے تھے اور ہسپتال روڈ پر ان کی دکان تھی۔ اب اللہ کے فضل سے حالات بدل گئے ہیں اور انارکلی میں نیوالانا واچ کمپنی کے مالک ہیں۔ زمانہ خطابت میں بھی اور اس کے بعد بھی مولانا کا یہ معمول رہا کہ نماز جمعہ کے بعد ان کی دکان پر ہسپتال روڈ تشریف لے جاتے، عام طور پر یہیں بھی ساخنہ ہوتا۔ مولوی عبداللہ یہیں خود چائے بنا کر پلاتے اور نہایت عقیدت و محبت کا برتاؤ کرتے۔ گھر کے بعض معاملات میں ہم سے مشورہ بھی لیتے اور مولانا کو ”مولوی جی“ کہتے ہیں۔ مجھ پر بہت

شفقت فرماتے ہیں۔ جب بھی ملاقات ہو محبت سے پوچھتے ہیں۔

”مولوی جی کا کیا حال ہے۔ مولوی جی کو میرا سلام کہنا۔ آپ اور مولوی جی دکان پر آیا کریں، میں شام تک وہیں رہتا ہوں۔“

ہم نیوالانا داچ کمپنی میں کبھی ان سے ملاقات کو جائیں تو نہایت خوش ہوتے ہیں اور کھلانے پلانے میں مخلصانہ تکلف سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لڑکے بھی انتہائی احترام سے پیش آتے ہیں۔

اُس زمانے میں مولوی عبداللہ کے ساتھ اُسی ہسپتال روڈ والی دکان میں ایک صاحب احمد علی خاں مرحوم تھے۔ وہ چینی کے برتن بیچتے تھے اور مولانا کے معقد اور میرے مشفق تھے۔ وہ بھی مولانا کے منتظر رہتے اور اُن سے دُکھ سُکھ کرتے۔

### شیخ عظیم اللہ مرحوم

مسجد مبارک میں مولانا کے مقتدیوں میں ایک بزرگ شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ تھے۔ شیخ صاحب مرحوم وکالت کرتے تھے۔ ان کا مکان اور دفتر مسجد مبارک کے ساتھ تھا۔ وہ گلی انہی کے نام سے عظیم سٹریٹ کہلاتی ہے۔ شیخ صاحب کُٹھے پر مشدیدی پگڑی باندھتے تھے۔ پُرانی وضع کے بہت نیک آدمی تھے۔ بعض دفعہ کسی وجہ سے مولانا خطبہ جمعہ کے لیے تشریف نہ لاسکتے تو شیخ صاحب جمعہ پڑھاتے۔ وہ عام طور پر جمعے کے روز عدالت سے سیدھے مسجد آتے اور مولانا کی عدم موجودگی میں اسی لباس میں منبر پر کھڑے ہو جاتے۔ خطیب کی داڑھی منڈھی ہوئی، پنٹ کوٹ پہنے اور ٹائی باندھے ہوئے، سر پر کُٹھے والی پگڑی، یہ عجیب و غریب منظر ہوتا۔ پہلے عربی خطبہ پڑھتے، پھر قرآن مجید کی کوئی آیت تلاوت کرتے اور اس کا ترجمہ کر کے موضوع کے مطابق اُردو میں بچے نئے انداز میں مختصر تقریر کرتے۔ نئے آنے والے لوگ حیران ہوتے کہ اہل حدیث کی مسجد میں داڑھی منڈھا آدمی انگریزی لباس پہن کر خطبہ دیتے رہا ہے۔ شیخ صاحب مرحوم صرف خطبہ دیتے تھے، نماز نہیں پڑھاتے تھے، نماز مسجد کے مستقل امام پڑھاتے۔

سائیکل چلانا اور ٹکرانا ایک انگریز کی موٹر سے

قیامِ پاکستان سے قبل مولانا مغل پورہ گنج بہتے تھے اور وہاں سے روزانہ درسِ قرآن

کے لیے مسجد مبارک آتے تھے۔ اگر حبيب میں پیسے ہوتے تو ریل سے آتے، ایک طرف کا کرایہ ایک آنہ تھا۔ یعنی آمد و رفت کے دو آنے خرچ ہوتے تھے اور اس زمانے میں دو آنے بڑی قیمت رکھتے تھے۔ اگر پیسے نہ ہوتے تو یہ سفر پیدل طے ہوتا۔ درس قرآن نماز مغرب کے بعد ہوتا تھا، اس میں اسلامیہ کالج کے اساتذہ و طلباء کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ شریک ہوتے تھے۔ مسجد مبارک کے قریب برانڈر تھرو ڈپر لاہوری مرزائیوں کی انجمن اشاعت احمدیہ کا دفتر تھا۔ بعض دفعہ یہ لوگ بھی آجالتے اور متنازعہ مسائل میں ان سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ انجمن اشاعت احمدیہ کے صدر اور لاہوری مرزائیوں کے امیر مولوی محمد علی لاہوری سے بھی بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ مذہبی بحثوں کا دور تھا اور اس ضمن میں بہت سی دلچسپیوں کا حامل تھا۔

اس دور کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ کے کرائے سے بچنے اور آمد و رفت کی سہولت کے لیے آپ نے سائیکل خریدا۔ پہلے دن اس پر سوار ہوئے تو ہاتھ کانپنے لگے اور توازن بگڑ گیا اور یہ طے کر لیا کہ کسی سے بہر حال نکلنا ہے۔ لیکن کس سے ٹکرائیں؟ یہ فیصلہ ابھی زیرِ غور تھا کہ اتنے میں ایک انگریز کی کار پر نظر پڑی جو سامنے سے آرہی تھی۔ کار قریب آئی تو الٹے کا نام لے کر سائیکل اس میں دے مارا، خود نیچے گر پڑے اور سائیکل کا وہی حال ہوا جو کار کے ساتھ نکلنے سے ہونا چاہیے تھا۔ حسن اتفاق سے انگریز کوئی شریف آدمی تھا، فوراً کار سے اُترا، مولانا کو جو نیچے گرے ہوئے تھے، اٹھایا، ان کے کپڑوں سے مٹی جھاڑی اور اٹھارے افسوس کیا۔ پوچھا:

”ویل مولوی ہے؟“

فرمایا ”ہاں!“

کہا ”اسی لیے ایسا کیا“

پھر اس نے سائیکل پر نگاہ ڈالی، اس کا خلیہ بگڑ چکا تھا، اس کو ٹھیک کرانے کے لیے پیسے دیے، مولانا اور ان کے سائیکل دونوں کو تانگے پر سوار کر لیا اور کرایہ دے کر گھر پہنچا یا۔ اس کے بعد آپ نے سائیکل نہیں چلائی۔ یہ حضرت کے سائیکل چلانے کا پہلا اور آخری دن تھا۔

## ایک روپیہ ماہانہ

مولانا کے ایک اور مقتدی تھے، وہ بھی بہت مخلص اور نیک آدمی تھے۔ ان کو اپنی کسی ملازمت کی دس یا بارہ روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ جس دن انھیں پنشن ملتی، سیدھے مولانا کے گھر جاتے اور ایک روپیہ ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تمام زندگی ان کا یہ معمول رہا کہ وہ ہر مہینے اپنی پنشن سے ایک روپیہ مولانا کو دیتے۔ ان کا نام ان کو یاد نہیں رہا۔ لیکن یہ واقعہ کئی دفعہ بیان کیا۔

## خواجہ الشددتہ مرحوم

مولانا کے ایک مقتدی خواجہ الشددتہ تھے۔ ان کی مولانا بہت تعریف کرتے ہیں، بڑے پرہیزگار اور صاحبِ دل آدمی تھے۔ مرحوم کا یہ معمول تھا کہ خطبہ جمعہ کے وقت خطیب کے بالکل سامنے منبر کے ساتھ بیٹھتے اور نہایت انہماک اور توجہ سے خطبہ سنتے۔ اگر کبھی مولانا کے پاجامے کے پانچے ٹخنوں سے نیچے ہوتے تو آہستہ سے موڑ کر اوپر کر دیتے۔ اسی طرح اگر مولانا خطبے میں صرف لفظ ”اللہ“ بولتے اور ”اللہ تعالیٰ“ نہ کہتے تو خطبے کے بعد علیحدگی میں نرمی سے مولانا سے کہتے، ”اللہ تعالیٰ کہا کریں۔“

مولانا نے ان کی نیکی کا ایک عجیب واقعہ سنایا اور وہ یہ کہ ان کے ایک بیٹے خواجہ عبدالعزیز تھے، وہ بھی بہت نیک اور متدین آدمی تھے۔ اے جی آفس میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ وہ اگر گھر سے باہر ہوتے اور بیمار پڑ جاتے اور خواجہ الشددتہ کو بیٹے کی بیماری کا پتا چل جاتا تو وہ محلے میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرتے جو بیمار ہو اور غریب ہو، پھر اس کا علاج کراتے۔ ان کا تجربہ تھا کہ جس دن وہ غریب بیمار صحت یاب ہو جاتا، اسی دن خواجہ الشددتہ کے بیٹے خواجہ عبدالعزیز کا خط آ جاتا کہ اللہ نے ان کو صحت عطا فرمادی ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ خواجہ عبدالعزیز کی بیماری کی اطلاع آئی، لیکن باپ کو گاؤں میں کوئی مریض نہ ملا جس کا وہ علاج کرا سکیں۔ اتفاق سے ایک گدھے پر نظر پڑی جو بہت زخمی ہو چکا تھا۔ خواجہ الشددتہ نے ایک شخص سے رابطہ پیدا کیا جو ڈنگر ڈھوروں کا علاج کرتا تھا۔ چنانچہ گدھے کا علاج ہونے لگا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے کہ جس دن گدھا تندرست ہوا، اسی دن

خواجہ عبدالعزیز صحت یاب ہو گئے۔

خواجہ الشہدۃ مرحوم کو تو میں نے نہیں دیکھا، البتہ ان کے بیٹے خواجہ عبدالعزیز مرحوم میرے بہت مشفق بزرگ تھے اور خلوص و اتقائیں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے بیٹے خواجہ عبداللہ خواجہ محمد یوسف اور خواجہ قاسم میرے مخلص دوستوں میں سے ہیں اور مولانا کے عقیدت مند۔

## ایک عید کا واقعہ

منٹو پارک لاہور میں عیدین کی نماز مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم پڑھاتے تھے۔ وہ انگریز حکومت کے شدید مخالف تھے اور اس ”جرم“ کی پاداش میں مختلف اوقات میں تقریباً بارہ سال جیل میں رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ کسی سیاسی تحریک میں جیل گئے تو جیل سے پیغام بھیجوا یا کہ عید کا خطبہ مولانا محمد حنیف ندوی ارشاد فرمائیں۔ مولانا ندوی خطبے کے لیے کھڑے ہوئے تو چینیال والی مسجد کے ایک منتظم بابو شجاع الدین مرحوم نے جو نہایت نیک اور مخلص آدمی تھے، اعتراض کیا کہ مولانا ندوی کی ڈاڑھی چھوٹی ہے۔ اس پر ایک شور مچا ہو گیا اور سب نے شجاع الدین مرحوم کے اس اعتراض کو محسوس کیا اور کہا کہ مولانا ہی خطبہ ارشاد فرمائیں گے۔ پہلے تو مولانا نے انکار کیا لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو خطبہ شروع فرمایا۔ تقریر نہایت فصیح و بلیغ تھی۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی عید پڑھنے آئے تھے اور تقریر میں موجود تھے۔ وہ مولانا کی تقریر، ان کی زبان اور فصاحت و بلاغت سے بے حد خوش ہوئے اور نماز کے بعد مولانا کے پاس جا کر انھیں عید کی مبارک باد اور تقریر کی داد دی۔

یہ آزادی برصغیر سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہے جو میں نے بعض حضرات سے سنا اور موقع کی مناسبت سے یہاں بیان کر دیا گیا۔

## لکھنؤ کا ایک مناظرہ

آزادی سے قبل برصغیر پاک و ہند میں مناظروں کا بہت رواج اور زور تھا۔ مولانا ندوی بھی اس فن سے آگاہ تھے اور مناظرے کرتے تھے۔ طالب علمی کے دور ہی میں ان کی طبیعت اس طرف راغب ہو گئی تھی، لیکن اس کو انھوں نے ”پیشہ“ نہیں بنایا، کبھی کبھی یہ شغل فرماتے تھے۔ زیادہ تر آریہ سماجیوں سے ان کے مناظرے ہوئے۔



ایک مرتبہ جب کہ یہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے، مشہور آریہ سماجی مناظر دھرم بھکشو لکھنؤ گئے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں اسلام پر سخت حملے کیے، اس کی تعلیمات کا ہنسنے کا اڑانا شروع کیا اور مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج دیا۔ ان دنوں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم بھی لکھنؤ گئے ہوئے تھے اور حسبِ معمول ندوۃ العلماء میں اقامت گزیرے تھے۔ انھوں نے مولانا حنیف ندوی سے کہا کہ اسلام کی حقانیت کے موضوع پر دھرم بھکشو سے مناظرہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ ندوہ کے قریب ڈالی گنج میں مناظرہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ وقت مقررہ پر مولانا اور ندوہ کے اساتذہ و طلباء ڈالی گنج پہنچے۔ لکھنؤ کے بہت سے مسلمان اور ہندو وہاں موجود تھے۔ مناظرہ شروع ہوا، حاضرین مولانا کے دلائل سے بہت متاثر ہوئے اور دھرم بھکشو کسی بات کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ لیکن اس نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی۔ واپس آئے تو سید صاحب مناظرے کی روداد سننے کے لیے بے تاب تھے۔ پوچھا ”مناظرہ کیسا رہا؟“ جواب دیا ”میں تو چیت گیا ہوں لیکن دھرم بھکشو نہیں ہارا۔“ مطلب یہ تھا کہ اس نے دلائل میں ناکامی کے باوجود اپنی ہار نہیں مانی۔ سید صاحب اس جواب پر ہنس کر اٹھے اور مولانا کی حوصلہ افزائی کی۔

### کرچی میں رام چندر سے مناظرہ

رام چندر آریہ سماج کا ایک معروف مناظر اور منہما ہوا مقرر تھا۔ عربی، فارسی، اردو وغیرہ زبانیں جانتا تھا۔ قرآن کی بے شمار آیات اُسے از بر تھیں، بہت لسان اور چرب زبان تھا۔ مولانا کا اس سے کرچی میں مناظرہ ہوا۔ مسلمان اور ہندو کثیر تعداد میں مناظرے میں موجود تھے۔ ڈھائی تین گھنٹے سلسلہ بحث جاری رہا۔ مناظرے میں بنیادی چیز حاضر دماغی اور بروقت جواب سوجھ جانا ہے۔ جس شخص میں یہ صفت پائی جاتی ہے وہ کامیاب مناظرہ ہے۔ رام چندر نے قرآن کی چند آیات پڑھ کر مولانا سے کہا:

”مجھے آپ کی الہامی کتاب قرآن مجید کی بہت سی آیات زبانی یاد ہیں، جہاں سے آپ کہیں پڑھ سکتا اور ان کا مطلب بیان کر سکتا ہوں، کیا آپ بھی ہمارے کسی وید کا کوئی حصہ پڑھ سکتے اور اس کے معانی بیان کر سکتے ہیں؟“

مولانا نے جواب دیا، ”یہ آپ کا نہیں، میری کتاب کا کمال ہے کہ دشمن اور کافر کے سینے میں بھی محفوظ ہے اور آپ کی کتاب خود آپ کو بھی یاد نہیں“  
 ڈھائی تین گھنٹے بحث جاری رہی۔ بالآخر رام چندر نے ہتھیار ڈال دیے اور بھرے مجھے میں اعلان کیا کہ

”میں ہار گیا اور حنیف ندوی جیت گئے“

پھر اس نے مولانا کے گلے میں ہار ڈالا۔ مولانا کے دلائل سے متاثر ہو کر کراچی کا ایک ہندو وکیل سٹیج پر آیا اور اس نے ہندو مذہب ترک کر کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا اعلان کیا۔  
**ایک قادیانی سے بحث**

۱۹۵۰ کی بات ہے، اپریل کا مہینہ تھا کہ میں اور مولانا ندوی ”الاعتصام“ کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں جہلم گئے۔ وہاں کی مسجد اہل حدیث کے خطیب مولانا عبد المجید دینا نگری مرحوم تھے، پیکرِ خلوص اور انتہائی مہمان نواز تھے۔ ہمارا قیام مسجد سے متصل ایک مکان میں تھا۔ عشا کے بعد دس بجے کے قریب ایک قادیانی مبلغ اپنے چند رفقا کے ساتھ مسجد میں آیا اور بعض مسائل میں مولانا عبد المجید دینا نگری سے بحث شروع کر دی۔ مولانا دینا نگری بحث و مباحثوں کے عادی نہ تھے۔ انھوں نے مولانا حنیف ندوی کو بلالیا۔ اور چند منٹ کی گفتگو کے بعد قادیانی مبلغ دوڑ گیا۔

**خفا ہونا مولانا کا اس بندۂ عاجز پر**

میری ایک عادت ہے جو اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ زندگی کا جزیں گئی ہے اور وہ عادت یہ ہے کہ جو شخص مجھے کسی کام کے لیے کہے میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے وقت صرف کرتا ہوں، بھاگ دوڑ کرتا ہوں اور جہاں جاتا ممکن ہو، جاتا ہوں۔ بعض چھوٹے چھوٹے کام بھی ہوتے ہیں اور بعض اہم بھی۔! بسا اوقات ”اہم“ اور ”غیر اہم“ کا فیصلہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ صاحبِ غرض کے نزدیک تو سب کام اہم ہوتے ہیں اور جو ان کی تکمیل میں اس کی مدد کرنا چاہے وہ انھیں اہم ہی قرار دیتا ہے، لیکن جو شخص نہ کرنا چاہے وہ دوسرے کے بڑے سے بڑے کام کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے نزدیک اہم اور غیر اہم کے درمیان خط امتیاز نہیں کھینچا جاسکتا۔ جو شخص کسی مشکل میں پھنس گیا ہے وہ

کسی کے نزدیک چھوٹی ہو یا بڑی، اس سے نکالنے کے لیے اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔ بہر حال مجھے کامیابی ہو یا نہ ہو میں کسی دوست کا کام کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں بلکہ اس مسئلے کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لیتا ہوں لیکن مولانا کو میری یہ عادت پسند نہیں، وہ مجھ پر خفا ہوتے ہیں اور فرمایا کرتے ہیں کہ آپ اس چوہدریہٹ میں کیوں پڑتے ہیں اور لوگوں کے لیے کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ یہ فضول عادت ہے، اسے چھوڑ دیں — مولانا بھی صحیح فرماتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگ کام بھی عجیب و غریب قسم کے میرے ذمے لگا دیتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو، میں نہیں چاہتا کہ کسی دوست کا دل توڑوں یا اسے ٹھیس پہنچاؤں۔ اس سلسلے میں اپنا مسلک دہی ہے جو انیس کا تھا۔ یعنی

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم  
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبِ گینوں کو

میرے نزدیک ہر نقصان پورا ہو سکتا ہے اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کی تلافی کی جا سکتی ہے لیکن کسی کا دل دکھانا، اس کو ٹھیس پہنچانا اور اس کی جائز توقعات کو محروم کرنا اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اگر تھوڑی بہت کوشش اور بھاگ دوڑ سے کسی کا کچھ سنور جاتا ہے تو میرے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ تاہم مولانا کو اس سے اتفاق نہیں۔ لیکن آپ کا قریب کریں تو راز کی بات بتاؤں، اکثر اوقات خود مولانا بھی اپنے کام کے سلسلے میں ”چوہدریہٹ کے تاج“ کے لیے میرے ہی کمزور سر کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر بار بار دریافت فرماتے ہیں، میرا کام ہو یا نہیں؟ بعض دفعہ سختی سے بھی کہتے ہیں، ”اس کام میں دیر نہ کرو، جلدی کرو، فلاں آدمی سے یا جس سے مناسب سمجھو ملو اور پھر مجھے بتاؤ۔“ اور میں کوشش کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کام ہو جاتا ہے۔

اگر تعلیٰ پر محمول نہ کیا جائے تو عرض کروں کہ میں خود اپنے ذاتی کام کے لیے کسی دوست کو تکلیف دینے میں بہت محتاط ہوں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، دوستوں کو آزمائش میں ڈالنے سے بچتا ہوں۔ بسا اوقات اپنے جائز بلکہ انتہائی ضروری کام کے لیے بھی کسی مہربان

کے دروازے پر دستک دینے سے گریز کرتا ہوں — اگر کام کی نوعیت ایسی ہو کہ کسی سے کہنا بھی پڑے تو ایک دفعہ کہتا ہوں، بار بار کہتے اور اسے پریشان کرنے کی بالکل عادت نہیں۔

### مولانا کو نماز کی تلقین

مولانا حنیف ندوی کو طویل عرصے سے گھٹنوں کی تکلیف ہے۔ وہ نہ زیادہ چل پھر سکتے ہیں، نہ کھڑے ہو سکتے ہیں، نہ بیٹھ سکتے ہیں، نماز میں سجدہ کرتے ہوئے بھی ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ تشدد میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں۔ ان عوارض کی وجہ سے وہ زیادہ تر گھر ہی میں نماز پڑھتے ہیں۔ چوک بھونڈ پورہ (مرنگ) میں جہاں کم و بیش تیس سال یہ مقیم رہے، ان کے مکان کے بالکل قریب مسجد ہے۔ لیکن ان کے لیے مسجد میں جانا مشکل تھا، گھر ہی میں نماز پڑھتے تھے۔ ان کے محلے کے لوگوں کو کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ کوئی میاں جی کہتا تھا، کوئی حکیم جی، کوئی بابا جی اور کوئی مولوی صاحب کہہ کر پکارتا تھا۔ ایک دن ایک بزرگ نے ان کو روک لیا اور نہایت نرمی سے کہا:

”میاں جی! میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں“

کہا ”فرمائیے“

بزرگ نے کہا ”خفا نہ ہوں تو عرض کروں۔“

فرمایا ”بالکل خفا نہیں ہوں گا، آپ فرمائیے۔“

کہا ”نماز پڑھا کریں“

فرمایا ”میں نماز پڑھتا ہوں، لیکن گھر میں پڑھتا ہوں، بعض تکلیفوں کی وجہ سے (جوان بزرگ کو بتائیں) مسجد میں آنا مشکل ہے“

یہ سن کر وہ بزرگ خوش ہوئے اور مولانا کی صحت کے لیے اللہ سے دعا کی۔

### پالینا ”دس ہزاری منصب“ کا

گزشتہ صفحات میں متعدد مقامات پر مولانا کی تنگ دستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن انھوں نے زمانہ تنگ دستی میں بھی نہ دو سنتوں کے ہاں آنا جانا بند کیا اور نہ مسجد مبارک کا خطبہ جمعہ اور روزانہ کا درس قرآن اس سے متاثر ہونے دیا۔ جیب میں پیسہ ہوا نہ ہو،

چل پڑے ہیں اور نہایت اطمینان سے درسِ قرآن بھی دے رہے ہیں اور خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرما رہے ہیں۔ ان کی تنگ دستی اس زمانے میں یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ تکیوں کے لیے غلاف میسر نہ تھے اور کہیں آنے جانے کے لیے پیسہ حاصل کرنا مشکل تھا۔ خود مولانا نے ایک دفعہ بتایا کہ ایک دن ہمارے ایک مخلص دوست محمد حسین بابر نے انہیں کہیں لے جانا چاہتے تھے۔ بابر صاحب سائیکل پر سوار تھے اور مولانا کو تانگے پر بیٹھایا، مگر تانگے کا کرایہ جو دو آنے تھا، دونوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ بابر صاحب دو آنے ایک دکان دار سے مانگ کر لائے۔ مولانا فرماتے ہیں، میں تانگے پر بیٹھا تھا، بابر صاحب کو دکان دار سے دو آنے مانگے ہوئے دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور دعا کی ”یا اللہ! اگر ہمیں کچھ نہیں دیتا تو ہمارے دوستوں کی غربت تو دور فرما۔“

اب ۳۰۔ جولائی ۱۹۸۴ کو پاکستان کے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر محمد افضل کی صدارت میں مولانا کے ساتھ ایک شام منائی گئی تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے مولانا کو صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے دس ہزار روپے کا چیک پیش کیا، اس طرح ”بفضلِ افضل“ منحل دور کی اصطلاح میں مولانا ”دس ہزاری“ ہو گئے ہیں اور ماشاء اللہ موج میں ہیں۔ محمد حسین بابر صاحب کی مالی پریشانیاں بھی ان کے بچوں میں تقسیم ہو گئی ہیں اور ان کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ یعنی مولانا کی دعا بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو گئی۔

### نزاکتِ احساس کے چند واقعات

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مولانا کی تصانیف و مضامین کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کامل ایک سوئی اوپن شرط ہے۔ ذرا ذہن دوسری طرف منتقل ہوا، سب کیسے دھڑے پر پانی پھر گیا۔ ان کی تحریریں اس درجے نازک مزاج ہیں کہ کسی صورت میں ”شرکتِ غیر“ برواشت نہیں کرتیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جس اردو میں وہ لکھی گئی ہیں، وہ پلوے

لے بابر صاحب ہمارے انتہائی مخلص دوست تھے، ہم انہیں مجھ صاحب کہا کرتے تھے، انہیں ۸ فروری ۱۹۸۶ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عربستان میں گھومتی ہوئی ان کے پاس پہنچی ہے۔ ان کی تقریروں کا بھی یہی حال ہے۔ اسی لیے کچھ لوگ ان کو ”ثقیل“ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مارو یا چھوڑو، ان کو پوری طرح سمجھنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ میں نے بظاہر ثقہ قسم کے بعض لوگوں کو مولانا کی تقریر میں اونگھتے اور جگائیاں لیتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی ان کے لیے مولانا کی تقریر ”نیند آور“ ہوتی ہے۔ اس قسم کی حرکت کرنے والوں پر غصہ بھی آتا ہے، مگر بات چوں کہ ہمارے بس سے باہر ہوتی ہے، اس لیے دل پر پتھر رکھ کر سب کچھ دیکھنا اور برداشت کرنا پڑتا ہے۔

خود مولانا بھی انتہا درجے کے حساس ہیں اور ان کی نزاکتِ احساس کا یہ عالم ہے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ ان کی کسی تقریر یا اسلوبِ نگارش کے بارے میں لب کشائی کی جائے، یا یہ عرض کیا جائے کہ الفاظ مشکل ہیں یا مولانا کی زبان میں یوں کہیے کہ ”عسیر الفہم“ ہیں، آسان اور ”یسیر الفہم“ ہونے چاہئیں، یا یہ کہ فلاں بات جو انھوں نے بیان فرمائی ہے، اس میں اختصار یا ”ایجاز“ پایا جاتا ہے، اسے قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا تو سمجھنے میں آسانی ہوتی، تو فوراً ان کا موڈ بدل جاتا ہے، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور اس طرح کے الفاظ کہنے والا ان کی بارگاہِ فضیلت میں ”جاہل“ قرار پاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ لوگ ہمارے مخاطب ہی نہیں، یہ ہماری بات سمجھ ہی نہیں پاتے، ہمارے مخاطب پڑھے لکھے لوگ ہیں، جہلا نہیں۔

پھر کوئی تبصرہ نگار ان کی کسی تصنیف سے متعلق اگر ایسے الفاظ لکھ دے جو ان کے نقطہ نظر سے درجہِ صحت کو نہ پہنچتے ہوں، یا مطلب کو زیادہ واضح نہ کرتے ہوں، یا بد قسمتی سے کتاب کے کسی حصے سے اظہارِ اختلاف کر بیٹھے تو ان کے لیے یہ بات سخت تکلیف دہ ہوتی ہے، جس پر فاقی کا یہ شعر حرفِ سحر صادق آتا ہے:

میں نے فاقی ڈوبتے دیکھی ہے بنصِ کائنات  
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

اس کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں:

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۹ء کے شروع تک مولانا نے لاہور کی مسجدِ مبارک میں خطابت اور

درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابتدائیں ان کے سامعین پڑھ لکھ اور ”سیکٹڈ“ لوگ تھے۔ وہ اگرچہ ”عدداً“ کم تھے لیکن علمی اعتبار سے ”ذرائعاً“ اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد جو نمازی اور سامعین مسجدِ مبارک میں آئے وہ عدداً بے شک زیادہ تھے لیکن علمی لحاظ سے خاص اہمیت کے مالک نہ تھے۔ بس وعظ و نصیحت سننے کے عادی تھے، زیادہ گہری علمی اور فکری باتیں سننا اور مفہم کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ لوگ مولانا کے خطبے اور درس میں آتے اور بیٹھ کر چلے جاتے، ان کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ مولانا اپنی بات ان کے کان تک تو پہنچا سکتے تھے، حلق میں نہیں اتار سکتے تھے۔ بالآخر انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مولانا کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ صورتِ حال مولانا کے لیے قابلِ برداشت نہ تھی اور وہ اپنا معیارِ تقریر اور اسلوبِ کلام عوامی اور واعظانہ سطح پر نہیں لا سکتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ الٹا کہ درس و خطابت کا سلسلہ ہی ترک کر دیا۔

مولانا اٹھارہ انیس برس سے مسجدِ مبارک سے منسلک تھے۔ اس اثنائیں قرآن مجید کے درس میں شروع سے آخر تک تین مرتبہ قرآن مجید ختم کیا۔ خطبہ جمعہ میں بھی دو دفعہ قرآن مجید ختم کر کے دوسری مرتبہ سورہ والتین تک پہنچ گئے تھے، یعنی آخری پارے کی چند سورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ مولانا کے بعد خطبے کا سلسلہ تو جاری رہا اور حاضری بھی بہت بڑھ گئی مگر علم کی گہرائی اور زبان کی فصاحت و بلاغت کی جو روایت مولانا نے لاہور کی کسی مسجد میں قائم کی تھی باقی نہ رہی، اور پھر درسِ قرآن تو بالکل بند ہو گیا۔ مولانا درس کے لیے انتہائی تنگ دستی کے عالم میں دور کی مسافت طے کر کے باقاعدہ آتے تھے، مگر ان کے بعد کسی نے اس طرف عنانِ توجہ مبذول فرمانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

مسجدِ مبارک کے نمازی تو شاید مولانا کو بھول گئے کہ ان کی زبان ”اوکھی“ ہے اور نمازیوں کے لیے اس کو سمجھنا مشکل ہے، لیکن مولانا ان کو نہیں بھولے۔ وہ ۱۹۵۲ء میں گوجرانوالہ سے دوبارہ لاہور آئے تو نمازِ مغرب کے بعد پھر وہاں سلسلہ درس شروع کر دیا، میں بھی اس میں مولانا کے ساتھ جاتا تھا۔ لیکن یہ درس روزانہ نہیں، ہفتہ وار ہوتا تھا۔ کئی مہینے یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر علالت یا کسی اور مجبوری کی بنا پر بند کرنا پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح مولانا میری کمزوری ہیں، اسی طرح مسجدِ مبارک مولانا کی کمزوری ہے

دہاں جانے کے لیے وہ بہانے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اپنے پرانے مقتدیوں میں انھیں پرفیسر عبدالقیوم کے والد بزرگ و ارمنشی فضل الدین مرحوم بالخصوص یاد آتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نہایت مخلص اور فہیم شخص تھے، میرے بہت مہربان تھے۔

مولانا کو قرآن مجید سے انتہائی شغف ہے اور ان کا درس قرآن بہت سی خصوصیات کا حامل ہوتا تھا اور نئے نئے تفسیری عقدے سامعین کے سامنے کھلتے تھے۔ زبان و اسلوب میں بھی بے مثل تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ زبان ”اوکھی“ تھی اور مولانا کے سامعین جو آزادی وطن کے بعد تشریف لائے، ”سوکھیاں گلاں“ سننے کے عادی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ”اوکھ“ اور ”سوکھ“ کے چکر نے ایک بے حد علمی روایت ختم کر دی۔

میں کتنا یہ چاہتا ہوں کہ مولانا کی نزاکتِ احساس کا یہ عالم ہے کہ اپنی مقرر کردہ سطح سے ذرا بھر نیچے اُترنا برداشت نہیں کیا، لیکن مسجد چھوڑ دی جسے علمائے کرام بڑی جدوجہد سے حاصل کرتے ہیں اور اگر حاصل ہو جائے تو نمازی ان سے مطمئن ہوں یا نہ ہوں وہ مسجد نہیں چھوڑتے۔ ان کے نزدیک مسجد ”چھجو دے چارے“ کی حیثیت رکھتی ہے، ”جو چھجو دے چارے اوہ بلخ نہ بخارے“۔ نمازی متعدد دھڑوں میں بٹ جاتے ہیں، مسجد میں کئی کئی جماعتیں ہونے لگتی ہیں اور امام یا خطیب کی مخالفت و موافقت میں مقتدیوں کے باقاعدہ محاذ قائم ہو جاتے ہیں، بعض سنجیدہ قسم کے لوگ روز روز کی اس جھک جھک سے تنگ آکر مسجد میں آنا بند کر دیتے ہیں، مگر امام اور خطیب کو اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ نہ وہ اپنی کسی خلافِ شرع حرکت سے باز آتے ہیں اور نہ مسجد کی خطابت و امامت سے دست کش ہوتے ہیں۔ بس :

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

لیکن مولانا ندوی کی ذہنی کیفیت اس قسم کے علما سے بالکل مختلف ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے سامعین ان کی بات سمجھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو کھونڈی ہاتھ میں پکڑی اور ”باز آئے ہم محبت سے سنبھالو پان دان اپنا“ کہتے ہوئے مسجد سے باہر نکل گئے۔ مولانا کی نزاکتِ احساس کے بارے میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر معلوم ہوتا ہے کہ اگست



۱۹۴۹ء میں گوجرانوالہ سے اخبار ”الاغتصام“ جاری ہوا، مولانا اس کے ایڈیٹر تھے اور میں ان کا معاون اور خادم —! وہاں ایک بزرگ حاجی الشدتہ تھے جو وہاں کی انجمن اہل حدیث کے صدر تھے۔ مرحوم اپنی ذات سے بڑے نیک اور پارسا آدمی تھے، لیکن زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، البتہ امیر آدمی تھے، اور ہماری اس قسم کی انجمنوں کی صدارت کے لیے اصل ”کوالیفیکیشن“ یہی ہے، جس کی جیب کا بوجھ زیادہ ہو، اسے انجمن کی صدارت متفقہ طور پر تفویض کر دی جاتی ہے، بلکہ کتنا چاہیے کہ مستقل طور پر اس کے نام الاٹ کر دی جاتی ہے، ایسے مناصب کے لیے بے چارے علم کو کوئی نہیں پوچھتا — داناؤں سے سنا ہے کہ ایک منفی ہوتی ہے اور ایک مثبت، یعنی نیگیٹو اور پازیٹو — اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں تو روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ مذہبی انجمنوں میں ”نیگیٹو“ سے مراد علم ہے اور ”پازیٹو“ سے مراد دولت۔ جو خوش نصیب اس صفت سے متصف ہو، یعنی علم سے محروم اور دولت سے بہرہ مند ہو، وہ کسی انجمن کی صدارت کا منصب پالنے میں نہایت آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے اور پھر تادمِ مرگ اس پر قائم رہتا ہے۔

ایک دن حاجی الشدتہ مرحوم نے بہت سے لوگوں کے سامنے جن میں مولانا اسماعیل مرحوم بھی تھے، مولانا نے کہا ”آپ اخبار میں اتنے مشکل الفاظ لکھتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتے، مولوی نور حسین کی طرح آسان الفاظ لکھا کریں تاکہ ہم سمجھ سکیں“ حاجی صاحب کے علم کے اعتبار سے یہ بات غلط نہ تھی، لیکن مولانا کی نزاکتِ طبع کے منافی تھی۔ جواب دیا ”حاجی صاحب! آپ دعا کریں میں بھی مولوی نور حسین ہو جاؤں“ — یہ الفاظ فرماتے وقت مولانا کے چہرے اور لہجے میں خفگی کے آثار نمایاں تھے، لیکن حاجی صاحب خاموش رہے، نہ مولانا کی ”درخواست“ کے مطابق ”دعا“ فرمائی اور نہ کوئی اور بات کہی۔

مولانا نور حسین گھر جا کھی مرحوم کا نام آیا ہے تو جی چاہتا ہے ان کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ وہ اپنے دور کے مشہور و واعظ و مبلغ اور مناظر تھے۔ پنجابی میں بڑی ہوشِ تقریر کرتے تھے، پنجابی کے شاعر بھی تھے، میرے بہت کرم فرماتے تھے۔ میں اس زمانے میں ”الاغتصام“ میں ”ہمارے علما“ کے عنوان سے مرحومین و موجودین علما کا تعارف لکھا کرتا

تھا۔ ایک دن مولانا نور حسین نے مجھ سے فرمایا ”تم علما کا تذکرہ کس طرح لکھتے ہو، بہت عمدگی سے واقعات بیان کرتے ہو۔“

اس وقت مولانا اسماعیل سلفی مرحوم اور مولانا حنیف ندوی بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا حنیف صاحب تو خاموش رہے، مولانا اسماعیل مرحوم نے بے تکلفی سے فرمایا، ”مولوی نور حسین! یہ حسنِ طلب ہے۔“ پھر مجھ سے فرمایا ”اسحاق! ان کا تعارف بھی لکھ دو، لیکن مجھ سے پوچھ کر لکھنا۔“

یہ بھی کیا عجیب دور تھا۔ ایک مرتبہ مولانا نور حسین بیمار ہو گئے، وہ مولانا حنیف ندوی کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ ایک دن نماز فجر کے وقت مجھ سے کسی نے کہا کہ ”مولانا نور حسین وفات پا گئے ہیں“ مجھے انتہائی افسوس ہوا، تھوڑی دیر بعد اخبار چھپنے کے لیے پریس کو جانے والا تھا۔ میں مولانا ندوی کی طرف دوڑا اور مولانا نور حسین کی وفات کی اطلاع دی۔ وہ بہت مغموم ہوئے اور اخبار کے لیے تعزیتی اداریہ لکھنا شروع کر دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی، مولانا نور حسین زندہ ہیں۔ میں پھر مولانا ندوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے چند سطریں لکھ لی تھیں۔ اب ہم دونوں بعض حضرات کے ساتھ ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے، وہ بیمار تو تھے لیکن کوئی تشویش کی بات نہ تھی۔ مرحوم بہت زندہ دل اور خوش مزاج تھے۔ مولانا ندوی نے ہنس کر فرمایا:

”اسحاق صاحب کے کہنے سے میں نے تعزیتی اداریہ بھی لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن آپ تو اچھے بھلے ہیں، اب پھر لکھنا پڑے گا۔“

مولانا نور حسین اُٹھ کر بیٹھ گئے، قمقمہ لگایا اور بولے:

”اچھا آپ کے نزدیک میں اتنی اہمیت کا مالک ہوں، مجھے سنایے کیا لکھا ہے تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ میرے بعد مجھے یاد کیا جائے گا، سننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں بتا سکوں کہ میرے متعلق کون سی بات صحیح ہے اور کون سی صحیح نہیں۔“

یہ الفاظ کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور چند روز بعد اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گھر انوارہ میں ایک بزرگ حاجی محمد علی مرحوم تھے۔ طویل قامت اور باریک، پرستیزگار اور سراپا۔ خلوص۔ وطن کی انجمن اہل حدیث کے خاندان تھے سابق ایم۔ پی۔ اے جناب اسماعیل ضیا کے والد مکرم تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا :

”میری بات غور سے سنو۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریریں سنی ہیں، ان کی کتابیں پڑھی ہیں اور ان کے اخبارات ”المدلل“ اور ”البلاغ“ بھی پڑھتا رہا ہوں۔ ان کی سب تحریریں اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں، لیکن مولوی حنیف کی لکھی ہوئی اکثر باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ان سے کہو آسان زبان لکھا کریں جسے میرے جیسے لوگ بھی سمجھ سکیں۔“

میں نے تعجب سے عرض کیا ”حاجی صاحب! یہ بات مولانا سے میں کہوں؟ یہ ممکن نہیں، مجھے وہ اتنی سخت ڈانٹ پلائیں گے کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ حاجی محمد علی مرحوم مولانا کے علم و کمال کے بہت مداح تھے۔ ایک دن گھرائے ہوئے تشریف لائے، فرمایا :

”مولوی حنیف کہاں ہیں؟“

عرض کیا ”خیریت تو ہے؟“

بولے ”ایک کمیونسٹ ہمارے گھر آیا ہے اور میرے بیٹے اسماعیل کو گمراہ کر رہا ہے، مولوی حنیف ہی اس کی زبان بند کر سکتے ہیں اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، انھیں جلدی سے بلا دو۔ میں انھیں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔“

میں مولانا کو بلا لایا، وہ حاجی صاحب کے ساتھ گئے۔ اور بھی بہت سے لوگوں کو حاجی صاحب نے بلا لیا اور خوب چائے وغیرہ پلائی۔ مولانا سے ان صاحب کی گفتگو ہوئی تو ظاہر ہے مولانا کے مقابلے میں انھیں لاجواب ہی ہونا تھا۔ اس دن حاجی صاحب نہایت خوش تھے اور پھر مولانا کی ہمیشہ تعریف کرتے رہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے مولانا کی کتاب ”عقلیات ابن تیمیہ“ شائع ہوئی تو تبصرے کے لیے ہندوستان کے بعض رسائل کو بھی بھیجی گئی، جن میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا رسالہ ”برہان“ (دہلی) بھی شامل تھا۔ مولانا اکبر آبادی نے اس کتاب پر تبصرہ

کیا، لیکن یہ تبصرہ مولانا کی توقع کے خلاف تھا۔ کچھ عرصے بعد مولانا اکبر آبادی لاہور آئے تو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں بھی تشریف لائے۔ مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف مرحوم بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں مولانا کا کمرہ دفتر کی دوسری منزل میں تھا، اب یہ کمرہ ان سطور کے راقم عاجز کے ”قبضے“ میں ہے۔ یعنی میں ان کا ”خلیفہ“ ہوں اور یہ ”خلافت“ صرف کمرے کی حد تک ہے، علم و فضل یا تحقیق و قابلیت کی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تو مولانا کا معاملہ ”فرشتوں سے بازی بشر لے گیا“ کا سا ہے۔

مولانا اکبر آبادی، شیخ اشرف مرحوم کی معیت میں مولانا کے پاس آئے۔ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواڑی اور رئیس احمد جعفری بھی وہیں آ گئے، میں بھی حاضر تھا۔ خیر خیریت کے بعد مولانا نے ”برہان“ میں شائع شدہ تبصرے پر گفتگو شروع کر دی اور مولانا اکبر آبادی سے فرمایا، ”یا تو آپ میری کتاب کے مندرجات کو سمجھے نہیں، یا آپ کھل کر لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ آپ اپنے خاص حلقے کی کتابوں اور مصنفوں کی تحسین کرتے ہیں، دوسرا اگرچہ کتنا بھی اچھا لکھے، اس کی تحسین نہیں کرتے۔“ انھوں نے پہلے تو مولانا کو کچھ جواب دیے، لیکن بعد میں خاموشی کو ترجیح دی۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے سابق ڈائریکٹر میاں محمد شریف مرحوم سے بھی اس سلسلے میں مولانا کی جھڑپ ہو جاتی تھی۔ وہ مولانا سے کہا کرتے تھے کہ آپ مشکل زبان لکھتے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں جعفر شاہ صاحب اور رئیس صاحب کی زبان اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں، لیکن آپ جو زبان لکھتے ہیں وہ نہیں سمجھ پاتا۔ ایک دن مولانا نے ان سے کہا، آپ کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں، آپ کو اللہ ہی سمجھائے۔ میں اب آسان کتاب ”بچے پالنا“ لکھوں گا تاکہ آپ سمجھ سکیں۔

ایک دن انھوں نے کہا میں کئی سال علی گڑھ رہا ہوں، وہاں اردو بولتا رہا ہوں اور اردو بولنے والوں سے میرا تعلق رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا علی گڑھ میں رہنے اور اردو بولنے سے کیا ہوتا ہے، وہاں تو جا بیل بھی رہتے ہیں اور اردو بولتے ہیں۔

میاں شریف صاحب مرحوم باعتبار ترتیب کے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے دوسرے

ایڈمک ڈائریکٹر تھے، وہ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی وفات کے بعد اس منصب پر فائز ہوئے تھے۔ فلسفے کے آدمی تھے اور اپنے موضوع میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ ان میں یہ خوبی تھی کہ مولانا کی کسی بات سے خفا نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کی طنزوں سے خوش ہوتے اور مسکراتے رہتے تھے۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے اور بعض اسماء و اعلام کا تلفظ صحیح نہیں کر پاتے تھے اور بات لطیفہ کی سی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ ابن تیمیہ کو وہ ”ابن تیمیہ“ کہا کرتے تھے۔ ایک دن کوئی کتاب پڑھ رہے تھے جس میں ”نور علی نور“ لکھا تھا۔ لوہے کے بجائے محفل سی عبارت معلوم ہوتی ہے، ”نور علی نور“ معلوم نہیں کون شخص ہے اور یہاں یہ لکھنے کا کیا مقصد ہے۔ بغیر اعراب کے بعض عام سے عربی الفاظ پڑھنے میں بھی انھیں دقت پیش آتی تھی جو بسا اوقات ایسے ہنسی مذاق کا باعث بن جاتی تھی کہ اس کی صحت کا علم ہو جانے کے بعد وہ خود بھی ہنس پڑتے تھے۔ مثلاً ایک دن وہ اردو میں ایک مسلمان فلسفی کے حالات پڑھ رہے تھے اور اس فلسفی کے نام کے آگے لکھا تھا، ”لَوْ، اللہ سَرَّ قَدَا“، اس پر اعراب نہیں تھے۔ فرمایا یہ ”نور اللہ مرقدہ“ کیا لفظ ہے۔ یہ اس فلسفی کے نام کا جز تو نہیں ہے، یہاں کیوں لکھ دیا گیا ہے۔

میاں محمد شریف مرحوم کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ وہ اپنے موضوع کے بہت بڑے محقق تھے اور پرانے آئی، سی، ایس (سی، ایس، پی) تھے۔ ان سے بھی مولانا کی بعض دفعہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی جسے سی، ایس، پی حضرات سننے اور برداشت کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ لیکن مولانا اس کی پروا نہیں کرتے تھے، جو بات ان کی نزاکتِ احساس کے منافی ہوتی اس کا فوراً جواب دیتے۔ ایک دن اکرام صاحب مرحوم نے کہا ادارے میں سکالروں کی ضرورت نہیں ہے، ان پر بہت زیادہ رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ باہر کے لوگوں سے کتابیں لکھائی جائیں تو سستی پڑتی ہیں۔ مولانا نے فرمایا: سب سے زیادہ رقم ڈائریکٹر کی تنخواہ لے جاتی ہے میں آپ کو دو سو روپے تنخواہ پر ڈائریکٹر لادیتا ہوں۔ اکرام صاحب مرحوم یوں تو تمام رفقاء ادارہ کا احترام کرتے تھے، لیکن مولانا جعفر شاہ مرحوم اور مولانا حنیف ندوی کی بالخصوص تکریم کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے

کہا، ”ان دونوں بزرگوں کا وجود ادارے کے لیے باعثِ برکت ہے، ان کی قدر کرنا اور ان کے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔“ میں اس سے بہت خوش ہوا اور خوشی میں انگریز بات شاہ صاحب سے بھی عرض کر دی کہ اکرام صاحب آپ دونوں کے وجود کو باعثِ برکت قرار دیتے ہیں۔ شاہ صاحب یہ سن کر خلافِ توقع بھڑک اٹھے۔ فرمایا: ”اچھا اکرام صاحب کے نزدیک ہمارا وجود باعثِ برکت ہے اور ہمیں محض برکت کے لیے یہاں رکھا ہے۔ ہم کام و ام کوئی نہیں کرتے، کام کوئی اور کرتا ہے یا اکرام صاحب کرتے ہیں۔ ہماری صرف برکت ہے۔“

اس زمانے میں جعفر شاہ صاحب، رئیس صاحب، مولانا حنیف صاحب، شاہد حسین رزاقی صاحب اور ان سطور کا راقم روزانہ کچھ دیر کے لیے ایک کمرے میں بیٹھ جاتے اور پھر علم اور عمر کا لحاظ کیے بغیر بے تکلفی سے ہر قسم کی باتیں ہوتیں۔ سیدِ نذیر نیازی مرحوم کا مکان ہائے دفتر کے بالکل قریب ہے، اکثر اوقات وہ بھی آجاتے اور تھوڑی دیر کے لیے خوب محفلِ جمعی۔

**ایک تلخ حقیقت کا مختصر متن**

مولانا حنیف ندوی مسلکِ اہل حدیث ہیں اور گوجرانوالہ کے جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی اہل حدیث ہے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم اپنے گاؤں دھونی کے (مقل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ) سے ۱۹۲۱ء میں گوجرانوالہ تشریف لائے۔ وہ ممتاز علمائے اہل حدیث میں سے تھے اور انھوں نے اپنے مسلک کی بہت خدمت کی۔ مولانا حنیف ندوی نے ابتدا سے لے کر تمام درسی کتابیں انہی سے پڑھیں اور ان کے علم و فضل سے بہت متاثر بھی ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں مولانا ندوی انہی کی کوشش اور سفارش سے ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۹۳۰ء کو وہ بائیس سال کی عمر میں ندوہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور کی مسجدِ مبارک میں خطیب مقرر ہوئے۔ یہ جماعت اہل حدیث کی مسجد ہے۔ اس زمانے میں لاہور میں جماعت اہل حدیث کی صرف تین مسجدیں تھیں، ایک مسجد لسوڑیاں والی جو اندرونِ دروازہ شیرال والا بنگلہ ایوب شاہ کے قریب ہے۔ اس مسجد میں کسی زمانے میں مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم (وفات ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء) خطابت و امامت

کے فرائض انجام دیتے تھے۔ دوسری مسجد چینیال والی جس کی مسند خطابت پر پہلے مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم فائز تھے اور پھر ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم نے یہ مسند سنبھالی۔ تیسری مسجد جو بعد میں تعمیر کی گئی، مسجد مبارک تھی، اس میں درس قرآن اور خطابت کا سلسلہ مولانا محمد حنیف ندوی نے ۱۹۳۰ میں شروع کیا جو ۱۹۴۹ تک جاری رہا۔

مولانا داؤد غزنوی کی زندگی کا بڑا حصہ سیاسیات میں گزرا اور وہ برطانوی حکومت کی مخالفت کی پاداش میں مختلف اوقات میں کم و بیش بارہ سال جیل میں رہے۔ وہ عمر میں مولانا حنیف ندوی سے کافی بڑے تھے، لیکن مولانا ندوی کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کے علم و فضل کے مداح تھے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۴۸ کو جب مرکزی جمعیت اہل حدیث قائم ہوئی تو اس کے تاسیسی اجلاس میں مولانا ندوی موجود تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر، پروفیسر عبدالقیوم (سینئر ایڈیٹر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی) کو ناظم اعلیٰ اور میاں عبدالمجید مالوڈہ کو (جنھیں پوری جماعت میں اپنے بے پناہ خلوص کی بنا پر انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے) ناظم مالیات منتخب کیا گیا تھا۔ مولانا حنیف ندوی اس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور اس زمانے کی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ اپنے دور کے عظیم افراد پر مشتمل تھی۔ ان سطور کا راقم جمعیت کا ناظم دفتر تھا۔ مولانا داؤد غزنوی ہر اہم معاملے میں مولانا حنیف ندوی سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے کو تمام ارکان عاملہ خاص اہمیت دیتے تھے۔ ۲۷، ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۴۹ کو لاہور میں جمعیت اہل حدیث کا پہلا جلسہ عام منعقد کیا گیا تو اس کے صدر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کو اور صدر استقبالیہ مولانا حنیف ندوی کو بنایا گیا تھا۔ انھوں نے اس میں جو خطبہ استقبالیہ پڑھا وہ ہر لحاظ سے بہترین خطبہ تھا۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۹ کو جماعت اہل حدیث کا ترجمان ہفت روزہ ”الاعتصام“ جاری ہوا تو اس کی ادارت کے لیے اکابر جماعت کی نگاہ انتخاب مولانا حنیف ندوی پر ہی پڑی۔ اپریل ۱۹۵۵ میں لائل پور (حال فیصل آباد) میں جماعت اہل حدیث کا مرکزی دارالعلوم قائم کرنے کا مسئلہ زیر بحث آیا تو اس کا نام ”جامعہ سلفیہ“ مولانا ندوی کی تجویز سے رکھا گیا تاکہ اس کے فارغ التحصیل

حضرات کو ”سلفی“ کی نسبت سے پکارا جائے۔ پھر اس سے کئی سال بعد فیصل آباد ہی میں جماعت اہل حدیث کی ایک اور درس گاہ قائم کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو مولانا ندوی نے اس کا نام ”ادارۂ علوم اشریہ“ رکھا تاکہ اس سے فارغ ہونے والوں کو ”اشری“ کہا جائے۔ سلفی اور اشری کا اطلاق اہل حدیث حضرات پر ہوتا ہے۔ جماعت اہل حدیث کے مزاج و مسلک کے اعتبار سے یہ نام نہایت موزوں تھے۔

مولانا سید داؤد غزنوی کی وفات (۱۶- دسمبر ۱۹۶۳ء) تک مولانا حنیف ندوی جمعیت اہل حدیث کی تمام کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں کے رکن رہے اور جمعیت کے ہر مشورے اور فیصلے میں ان کی رائے کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ لیکن مولانا غزنوی کی وفات کے فوراً بعد جو حضرات آگے آئے (یا بعض مصالح کی بنا پر جن حضرات کو آگے لایا گیا) ان میں مولانا حنیف ندوی کو کسی عنوان سے بھی شامل نہیں کیا گیا بلکہ بعض حضرات نے تو ان کو اہل حدیث ماننے ہی سے انکار کر دیا اور ان کے چند ایسے افکار و تحریرات کا انکشاف فرمایا جن کی ذرا زکاہ تاویلیں کر کے انھیں زمرۂ اہل حدیث سے خارج کرنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ یہ ایک تلخ حقیقت کا مختصر سا متن ہے، جس کی تشریح بہت سی تفصیلات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، لیکن اس کے بیان کا یہ محل نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ تحقیق و کاوش، علم و ادراک، وسعت معلومات، علو فکر اور اصابت رائے کے اعتبار سے کم از کم جماعت اہل حدیث میں کوئی شخص مولانا حنیف ندوی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کوئی ان کے بارے میں جو جی چاہے کہے، لیکن ان کے مرتبہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس موقع پر مفتی صدر الدین آزادہ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے :

کامل اس فرقہ زہاد میں اٹھانہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی زندان قدر خوار ہوئے

جی چاہتا ہے جمعیت اہل حدیث اور اس کے اکابر کے بارے میں جو یادداشتیں میرے ذہن کے کباڑ خانے میں اوپر نیچے دبی ہوئی ہیں، انھیں خاص ترتیب کے ساتھ کسی وقت قلم و کاغذ کے حوالے کر دوں۔ اس میں ان شار الشدیہ واضح کروں گا کہ جمعیت اہل حدیث کے قیام و تاسیس کی



ضرورت کیوں پیش آئی، کن حضرات نے اس کے لیے ابتدائی تنگ و تاز کی، اس کے نظم و نسق کو مستحکم کرنے کے لیے عملی اور تحریری طور پر کن کن لوگوں نے کیا کیا خدمات انجام دیں اور اس کے کیا نتائج نکلے اور پھر ان لوگوں کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا اور کن لوگوں کے کہنے سے کیا گیا۔ جن لوگوں نے اخبار ”الاعتصام“ میں مسلک اہل حدیث کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مختلف جماعتوں اور افراد سے ملکر لی اور اس پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے، ان کی ممانعت کا فریضہ ادا کیا، ان کو بالکل بھلا دیا گیا۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے؟

جمیعت کی تاریخ اب مسخ کی جا رہی ہے اور اس کے مؤسبین میں صرف دو ایک بزرگوں کے نام لیے جاتے ہیں، باقی سب کی کوششوں پر پانی پھیرا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی وقت اصل حقائق کی نقاب کشائی کروں اور واقعات کی پوری تاریخ لوگوں کے سامنے رکھ دوں۔ مجھے معلوم ہے جماعت اہل حدیث کا کوئی اخبار اسے شائع نہیں کرے گا اور ظاہر ہے دوسروں کو اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ تاہم میں ان شامہ الشملہ واقعات و حالات ضرور تحریر کر دوں گا، ہو سکتا ہے میرے بعد جماعت اور اس کے مختلف اداوار و شخصیات سے متعلق کوئی شخص معلومات حاصل کرنا چاہے تو میرے کاغذات میں سے اسے کچھ مل جائے۔

بہر حال اس وقت صرف مولانا حنیف ندوی سے متعلق یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ جمیعت اہل حدیث کی تنظیم و تاسیس میں ان کی کوششوں کا بہت عمل دخل ہے لیکن مولانا داؤد غزنوی کی وفات کے بعد ان کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جماعت کے جو لوگ انھیں کسی جلسے یا میٹنگ میں بلاتے ہیں تو حصول برکت کے لیے بلاتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ پرانے بزرگوں کی نشانی صرف آپ ہی رہ گئے ہیں۔ آپ ہمارے لیے دعا فرمایا کریں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ان کا کام فقط دعا فرمانا ہی نہیں ہے۔ عبادت سے متعلق کسی مشورے یا فیصلے میں ان کو شریک کرنا ممنوع ہے۔ یہ کام آپ حضرات کا ہے جو نہ جماعت کی تاریخ سے واقف ہیں، نہ اس کے افراد و شخصیات سے آگاہ ہیں اور نہ اس مسلک کے حدود اور نزاکتوں کا علم رکھتے ہیں۔

بعض حضرات مجھے بھی ازراہِ کرم جماعت کے جلسوں میں بلالیتے ہیں اور مجھے بھی یہی فرمایا کرتے ہیں کہ آپ جمعیت کے بانیوں میں سے ہیں اور اس کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، جماعت کے موجودہ حضرات کا یہ کہنا بھی غنیمت ہے۔ اگر حالات کی رفتار یہی رہی تو ہمارے لیے یہ الفاظ کہنے والے بھی نہیں ملیں گے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مدتِ مدید سے مولانا سے میرے تعلقات ہیں۔ تعلقات (یا ملاقات) کے یومِ اوّل سے لے کر اب تک ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مولانا کی عمر ضرور بڑھی ہے اور روزانہ بڑھ رہی ہے اور دعا ہے کہ بڑھتی ہی رہے مگر وہی وضع، وہی قطع، وہی میل، وہی جول، وہی طول، وہی عرض۔ کسی چیز میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ پنجابی محاورے کے مطابق ”نہ ہاڑھ سکے، نہ سادن ہرے“ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بعض علمائے کرام بہت موٹے ہو گئے ہیں اور ہر آنے والی گھڑی ان کا وزن بڑھا رہی اور انھیں موٹا کر رہی ہے۔ مگر مولانا وہی دھان پان اور ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ انھوں نے ایک دن یہ خوش خبری نہ سنائی کہ

میری پچھلے سال دی کُرتی  
وکیاں توں اڑ دی اے

## آخری گزارش

مولانا جہاں فضل و کمال، تصنیف و تالیف اور درس و تقریر میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں وہاں لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ جس محفل میں بھی ہوں اس میں شگفتگی کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ پنجابی لوگ گیت کے مطابق کہنا چاہیے:

گوری لاہ کے پزیریاں رکھیاں  
دھرتی توں پھل لگ گئے

میں نے کوشش کی ہے کہ مولانا کے چھوٹے بڑے وہ تمام واقعات و لطائف ضبطِ تحریر میں آجائیں جو میں نے کچھ لوگوں سے سنے یا خود مولانا نے بتائے، یا جو میرے سامنے وقوع میں آئے اور جن کا میں ”یعنی اور سمعی شاید“ ہوں تاکہ ان کی شخصیت نکھر کر قارئین

کے سامنے آجائے۔ ان میں بعض واقعات یا لطائف ایسے بھی ہوں گے اور ہیں جو اپنے وقت وقوع اور حین صدور میں تو واقعی دلچسپی کا باعث تھے لیکن مرورِ ایام سے ان کی دلچسپی میں کسی حد تک کمی واقع ہو گئی ہے، اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے۔ ہر چیز اپنے وقت پر ہی زیادہ لطف دیتی ہے، وقت گزرنے پر اس میں پہلی سی جاذبیت باقی نہیں رہتی۔ بس پھر وہ ماضی کا ایک حصہ اور یادوں کا ایک جز بن کر رہ جاتی ہے۔

میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ سب باتیں سادہ زبان میں بیان کی جائیں اور یہی زبان واسلوب اس کے لیے موزوں بھی ہے اور تھوڑی بہت دلچسپی اسی میں قائم رہتی ہے۔ ان واقعات میں علمی اصطلاح میں کتنا چاہیے کہ بعض ”ذیلول“ بھی آگئے ہیں اور یہ وہ ذیلول ہیں جن سے مفر ممکن نہ تھا۔

مولانا سے میرا تعلق بہت عرصے سے ہے، اور تعلق کیا، امیر خسرو کے الفاظ میں معاملہ یہ رہا ہے کہ

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی

تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگر می

لیکن اس کے باوجود ان سے متعلق بہت سی باتیں میں نے ترک کر دی ہیں۔ ان متروکات میں سے بعض گفتنی تو بے شک ہیں، نوشتنی نہیں ہیں۔ بعض اس لیے چھوڑ دی ہیں کہ ان کے بیان کرنے سے مولانا مجھ پر خفا ہوں گے اور ان کی خفگی مجھے ہرگز منظور نہیں۔

مولانا میری کمزوری ہیں اور میں چاہتا تھا کہ ایک خاص اسلوب سے انھیں پڑھنے والوں کے سامنے لاکھڑا کروں۔ اگر میں ہی یہ کام نہ کرتا تو اور کون کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کامیاب رہا ہوں اور کامیاب کیوں نہ رہتا :

ذکر اس پر ہی وش کا اور پھر بیاں اپنا

میں یہ معذرت نہیں کروں گا کہ میری گفتگو بہت طویل ہو گئی ہے، میرے نزدیک ایسا ہونا ضروری تھا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

# مولانا محمد حنیف ندوی

کا  
سفر آخرت

محمد اسحاق بھٹی

مولانا محمد حنیف ندوی جن کو مرحوم کہتے ہوئے زبان تھر تھراتی اور لکھتے ہوئے ہاتھ لرزتا ہے، تقریباً ڈھائی سال کی مسلسل اور طویل علالت کے بعد ۱۲- جولائی ۱۹۸۷ء کی شب کو کوچ کر چالیس منٹ پر اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ اللہم اغفر لہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ۔

بیماری کے دورِ آغاز میں مولانا کا خیال تھا کہ انھیں مٹانے کا درد ہے۔ معالجوں سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا اور عرصے تک اسی تشخیص کے مطابق علاج ہوتا رہا۔ ایلوپتھی، یونانی اور ہومیوپتھی تینوں قسم کے علاج کرائے گئے اور اس مرض کے ماہر معالجوں سے کرائے گئے، مگر افادہ نہ ہوا۔ کبھی کبھی اتنا فرق ضرور پڑتا تھا کہ درد میں قدرے کمی آ جاتی تھی۔ درد کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا۔

دو تین دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بعض ڈاکٹروں نے مٹانے کے آپریشن کا ارادہ کیا، اس کے لیے تاریخ اور وقت کا تعین بھی کر دیا گیا، مگر ہر دفعہ عین موقع پر ارادہ بدل دیا گیا اور دواؤں کے ذریعے علاج جاری رکھنا مناسب سمجھا گیا۔

مولانا ۱۲- اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا، میں کل ۱۳- اکتوبر کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ فرمایا، کل تو میں اسلام آباد چلا جاؤں گا، پھر کل ہی وہاں سے علاج کے لیے لندن روانہ ہو جاؤں گا۔ یہ ہم سب کے لیے ان کی اچانک اطلاع تھی۔ وہ ملاقات کے لیے آئے تھے اور سب سے الگ الگ ان کے کمروں میں جا کر ملے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے میں آئے تو میں نے عرض کیا کہ آپ نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں جو تصنیفی خدمات انجام

دی ہیں، ان سے متعلق ”ارمغانِ حنیف“ کے لیے میں نے مضمون لکھا ہے، اجازت ہو تو ایک صفحہ سنا دوں، فرمایا ”سناؤ“ ایک صفحہ سنا چکا تو عرض کیا ”بس کروں“ فرمایا ”اور سناؤ!“ مضمون کے شروع اور آخر کے فلی سکیپ کے سمجھنے کے سات صفحے سنے اور نہایت خوش ہوئے۔ فرمایا ”آپ نے بہت اچھا لکھا ہے اور میرے انداز میں لکھا ہے۔ مر جاؤں تو افسوس نہیں ہوگا، کام تو انشاء اللہ زندہ رہے گا۔“

۱۳۔ اکتوبر ۱۹۸۶ کو وہ اپنے ذرائع سے علانِ ج کے لیے لندن چلے گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ بھی ان کے ساتھ گئیں۔ وہاں جا کر سب سے پہلے مٹانے کی بیماریوں کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس نے مختلف ٹیسٹ لیے تو اس نتیجے پر پہنچا کہ انھیں مٹانے کی تکلیف نہیں ہے بلکہ معدے کا عارضہ ہے۔ چنانچہ اس کے مشورے سے معدے کی بیماریوں کے ماہر ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا۔ اس نے کئی قسم کے ایکس رے لینے اور تجربے کرنے کے بعد بتایا کہ جس آنت کے ذریعے معدے کو خوراک پہنچتی ہے وہ آنت سکرٹ گئی ہے۔ اس کے لیے اس نے غذا بھی بتادی اور ضروری دوائیں بھی لکھ دیں۔

لندن کے ان دونوں ڈاکٹروں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس مریض کی حیثیت پاکستان کے گراں مایہ علمی سرمائے کی ہے اور یہ قدیم و جدید فلسفے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ڈاکٹر خود بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے اور ماتحت عملے کو بھی ان کی دیکھ بھال کے لیے خاص ہدایات جاری کر دی تھیں۔

امراضِ معدہ کے ماہر ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ ان کے پیشاب کا تجزیہ کیا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے ہیں، لیکن ان کے مرکز کا پتہ نہیں چل سکا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ چند ماہ بعد پیشاب کی نالی میں رسولی پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن اس رپورٹ کا آخر وقت تک مولانا کو علم نہیں ہو سکا۔

تقریباً تین مہینے کے بعد ۷ جنوری ۱۹۸۷ کو مولانا لندن سے لاہور واپس آئے۔ ایئر پورٹ پر استقبال کے لیے ان سطور کا راقم بھی موجود تھا۔ صحت بظاہر اچھی تھی۔

میں نے بغل گیر ہوتے ہوئے ان سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے، آپ نے لندن جانے کے لیے بیماری کا بہانہ بنایا تھا۔ میاں بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا وہاں بھی بعض لوگ یہی کہتے تھے۔

لندن سے واپس آنے کے بعد علاج کا سلسلہ وہاں کے ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق بدستور جاری رہا۔ اس اثنا میں وہ دو تین مرتبہ ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ بھی تشریف لائے، میں بھی گھر پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ کمزوری تو تھی، لیکن نظر بظاہر زیادہ خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔

میں نے ایامِ مرض میں کئی دفعہ ان سے عرض کیا کہ صحت اچھی ہو جائے تو اپنے ایک پرانے مضمون ”چہرہٴ نبوت قرآن کے آئینے میں“ کے آخری پندرہ بیس صفحے لکھ دیجئے تاکہ یہ مکمل ہو جائے اور اُسے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ انھوں نے بشرطِ صحت لکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ لیکن جون کے پہلے ہفتے میں طبیعت یکایک خراب ہو گئی اور ضعف و مرض نے ان کے جسمِ ناتواں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔

ابسترا میں مختلف ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا، لیکن جون کی آخری تاریخوں میں انھیں لاہور کے اتفاق ہسپتال کے جنرل وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔ ادارہٴ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر کو پتا چلا تو وہ ہسپتال پہنچے اور فوری طور پر ملک فیض الحسن (زکوٰۃ کونسل پنجاب) اور خالد شیرازی (ریڈیو پاکستان لاہور) سے ملے اور ان کو مولانا کی شدید بیماری کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے ہسپتال کی انتظامیہ کے بعض معزز ارکان سے رابطہ قائم کیا اور مولانا کو ہسپتال کے وی آئی پی روم میں منتقل کر دیا گیا۔ ان حضرات کی کوشش سے ہسپتال کی انتظامیہ نے علاجِ معالجے کی ذمہ داری خود قبول کر لی اور ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں ان کا علاج ہونے لگا۔

پیشاب کی نالی کے بجائے پیٹ میں رسولی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اس کا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ کینسر ہے، مگر قابلِ علاج ہے۔ اس کے بعد طبیعت کچھ سنبھل بھی گئی، لیکن یہ عارضی بات تھی۔

۹۔ جولائی کو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھ کر مسکرائے اور خیر خیریت پوچھی۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے سر پر ہاتھ رکھا اور چند ثانیوں کے بعد غنودگی طاری ہو گئی۔ اسی دن شام کو میں نے ان کے چھوٹے صاحب زادے حماد سے ہسپتال میں ٹیلی فون پر رابطہ کیا تو انھوں نے کہا آپ کے جانے کے بعد ابی کہہ رہے تھے کہ آپ ان کی عیادت کے لیے ہسپتال نہیں آئے۔ انھیں بتایا گیا کہ آپ آئے تھے تو فرمایا نہیں آئے۔ پھر بتایا گیا کہ آئے تھے اور آپ سے ایک آدھ بات بھی ہوئی تھی تو ”اچھا“ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

۱۰۔ جولائی کو گیارہ بجے کے قریب میں ہسپتال گیا تو بظاہر طبیعت اچھی تھی اور مولانا کرسی پر بیٹھے تھے۔ اپریشن کے مقام پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کچھ باتیں بھی کیں، پشت پر رکھنے کے لیے مجھ سے تکیہ بھی مانگا۔ بعض اور دوست بھی آگئے، انھوں نے خیریت پوچھی تو فرمایا۔ الحمد للہ ٹھیک ہوں۔

۱۱۔ جولائی کو حاضر خدمت نہیں ہو سکا۔ ۱۲۔ جولائی کو میں دفتر نہیں گیا، گھر پر ہی رہا۔ خیال یہ تھا کہ شام کو مولانا کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ لیکن ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر سراج منیر نے دفتر سے ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ ”کل آپ مولانا کے پاس گئے تھے؟ عرض کیا ”کل نہیں جاسکا، آج شام کو جانے کا ارادہ ہے۔“ انھوں نے بتایا کہ ”کل دوپہر سے ان کی طبیعت بہت خراب ہے اور بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔“

یہ تشویش ناک خبر تھی۔ میں اسی وقت گھر سے نکلا اور دفتر پہنچا۔ پانچ بجے کے قریب سراج منیر صاحب، جناب ذوالفقار احمد، ملک فیض بخش اور ان سطور کا راقم ہسپتال پہنچے تو دیکھا کہ علم و فضل کا یہ کوہِ گراں اپنی جگہ سے ہل چکا ہے اور زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے۔ ڈاکٹر انتہائی توجہ سے مصروفِ علاج ہیں اور اعزہ و اقارب تصویر یا س بنے ہوئے کمرے میں ان کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔

مجھ کو دیکھتے ہی پہلے ان کا چھوٹا بیٹا حماد میری طرف بڑھا اور لپٹ کر رونے لگا۔



پھر چھوٹی بیٹی سدرہ آئی اور روتے ہوئے بولی ”چاچا! اب کیا ہوگا؟“ (ان کے بچے مجھے چاچا کہتے ہیں) اس وقت خود میری حالت دیگرگوں تھی اور میرے پاس افسوس ہے، تلقینِ صبر کے چند الفاظ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ ایسی تکلیف دہ گھڑی تھی کہ سب کی آنکھیں پر نرم تھیں اور چہروں پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

شام کو ہم ہسپتال سے واپس لوٹے تو سراج منیر صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم سیدھے گھر جاؤ اور ٹیلی فون کے ذریعے ان سے رابطہ رکھو۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ زندگی کے آخری سانس ہیں اور چند گھڑیوں تک جسم و جان کا ۹۹ سالہ پرانا تعلق ٹوٹنے والا ہے۔ بہر حال گھر جا کر میں نے ہسپتال سے رابطہ قائم رکھا اور رات کو ساڑھے نو بجے سے چند منٹ بعد حُزن و ملال میں ڈوبی ہوئی یہ آخری اطلاع ملی کہ فضل و کمال کا یہ پیکر اس عالمِ خاکی سے مُتہ موڑ کر جنت کو روانہ ہو گیا ہے۔ قرآن کا یہ مفسر اور حدیثِ نبوی کا یہ محبِ صادق چشمہ کوثر پر جا بیٹھا ہے۔ چند گھنٹوں سے وہ جس کوفت میں مبتلا تھا، وہ دُور ہو گئی ہے، اب وہ باغِ بہشت میں جا کر آرام کی نیند سو گیا ہے۔

یہ خبر سننے ہی گزشتہ اڑتیس برس کے لمحاتِ زندگی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور یکے بعد دیگرے بے شمار یادیں تازہ ہو گئیں۔

ان کی وفات کی اطلاع پا کر اخلاقاً مجھے ان کے گھر جانا اور وہیں رات رہنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے ان کے لڑکوں سے کہہ دیا کہ میں نہیں آؤں گا، اس لیے کہ اب اخبارات کو ان کی وفات کی اطلاع دینا، ان کی زندگی کے حالات بتانا اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات کی تفصیلات سے مطلع کرنا ضروری تھا اور میرے سوا کوئی اور یہ فریضہ انجام دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ چنانچہ تمام اُردو انگریزی اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کو مناسب تفصیل سے اطلاع دی گئی، ان کے حالات بتائے گئے، ان کی علمی تحقیقی اور تصنیفی تہ تک و دو سے مطلع کیا گیا اور اخبارات کے طلب کرنے پر ان کی مختلف تصویریں مہیا کی گئیں۔ تمام رات اخبارات سے رابطہ رکھا اور انھوں نے جو کچھ پوچھا،

بتایا۔

صبح ۱۳۔ جولائی کے اخبارات میں صفحہ اول پر نمایاں طور سے ان کی خبر وفات شائع ہوئی۔

اسی صبح کو ساڈھے چھ بجے سراج منیر صاحب نے ریڈیو پاکستان لاہور کے خصوصی پروگرام میں دس منٹ ان کے بارے میں تقریر کی اور ان کے ضروری حالات وضاحت سے بیان کیے۔ (یہاں یہ عرض کر دوں کہ صبح ساڈھے چھ بجے کے پروگرام میں ریڈیو پاکستان، لاہور سے روزانہ کئی روز سے سراج منیر اور خالد شیرازی مولانا کی بیماری کی تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں اعلان نشر کر رہے تھے۔)

مولانا حنیف ندوی نے ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء (۱۵ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ) کو اتوار کے دن رات کو نو بج کر چالیس منٹ پر وفات پائی اور دوسرے دن گیارہ بجے ان کا جنازہ اٹھایا گیا، اور انھیں کلفٹن کالونی (وحدت روڈ) کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ نمازِ جنازہ مسجد مبارک کے خطیب مولانا فضل الرحمن نے پڑھائی۔

علمی اعتبار سے گزشتہ کئی سال سے واقعات نے جو رخ اختیار کر لیا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے آئندہ بظاہر حالات برصغیر پاک و ہند میں علم و عرفان کی اس قسم کی مثال پیدا ہونے کی توقع نہیں۔ وہ قدیم و جدید کے پیکرِ حسین اور کائناتِ فضل و کمال تھے۔ مفسرِ کتابِ ہدیٰ، فنونِ نقلیہ و عقلیہ کے ماہر، خزانہٴ علومِ قرآن، محبتِ رسولِ عربیؐ، دلدادہٴ حدیثِ نبویؐ، حاضرِ جواب، مقررِ شیریں بیان، خطیبِ نکتہ طراز، خلوتِ گزینِ مجمعِ کمال اور گوشہ نشینِ محفلِ آرا تھے۔ دنیا اور اہلِ دنیا سے بے نیاز، دولت و ثروت سے مستغنی، لوگوں کی داد و تحسین سے بے پروا، عربی کے ادیب، اردو کے صاحبِ طرز مصنف، متوکل علی اللہ، مجسمہٴ فہم و تدبیر، اسلامی فلسفے میں یکتا، عمرانیات و علومِ حاضر میں منفرد، اور علم و مطالعہ کے علاوہ ہر شے سے بے تعلق!۔

یہ قناعت پیشہ صاحبِ علم و ہنر، جسے اس عالمِ خاکی میں محمد حنیف ندوی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے شمار خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ عملاً اپنے نام ”حنیف“

کا صحیح ترین ترجمہ تھے۔ یعنی سب معاملاتِ غیر علمی سے کٹے ہوئے اور امورِ ناپائیدار سے الگ تھلگ۔ اگرچہ مال و دولت سے تنہا دامان تھے مگر اعلیٰ علوم و فنون پر ان کی حکمرانی تھی۔ یہ وہ خوش قسمت عالمِ دین ہیں جن کا علم ان کے سینے میں بند نہیں رہا اور ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن نہیں ہو گیا بلکہ کثرت کے ساتھ کاغذ کے سفینے میں منتقل ہوا، اور صفحاتِ قرطاس نے ہمیشہ کے لیے اُسے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا۔

اس گراں مایہ ہستی کو اپنے اوصافِ گوناگوں اور کمالاتِ بوقلموں کی بنا پر موجودہ کاروانِ علم کا آخری مسافر کہنا چاہیے۔ یہ انگریزی کالجوں اور مغربی طریقِ تعلیم کی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ نہیں تھے، بلکہ عربی مدارس کے بوریا نشین گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس طائفہٴ انکسار کے رکن تھے جو مسجدوں کی چٹائیوں پر تکیم پوش اور درویش منش اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں۔

اس مردِ قلندر نے گوجرانوالہ کی ایک مسجد سے تعلیم کا آغاز کیا اور وہیں درسِ نظامیہ کی تکمیل کی۔ پھر وہاں سے لکھنؤ گئے اور ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔ پانچ سالِ ندوہ میں رہے۔ یعنی ان کے معلومات کا ابتدائی سرمایہ عربی مدارس کا رہینِ منت ہے۔ اس مردِ فقرِ پیشہ نے مسجد کی چٹائیوں سے ابھر کر اپنی خدا داد ذہانت اور کثرتِ مطالعہ سے فلسفہٴ منطق کی بلند و بالا چوٹیوں کو سر کیا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ علم و ادراک کے اسلمہ سے مسلح ہو کر یونان کے فلاسفہ اور اصحابِ منطق کے افکار و تصورات کے صنمِ کدوں کی خبر لائے۔ پھر ان کے بعض نظریات پر اس درجے زور دار حملے کیے کہ اس کی ضربیں برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کے ایوانوں میں سنی گئیں اور ان کے تحلیل و تجزیہ کے بہت سے حصوں کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا گیا۔

فلسفہ پر ان کے عبور کا یہ عالم تھا کہ وہ ۱۹۵۲ء سے فلسفہ کانگریس کے رکن تھے جو دنیا بھر کے فلسفیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس کے اجلاسوں میں وہ جاتے اور مقالے پڑھتے تھے، یہ مقالے دیگر فلاسفہ کے مقالات کے ساتھ کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں فلسفہ کانگریس کا جو اجلاس پشاور میں ہوا تھا، اس کے مولانا صدر

تھے، اس کا افتتاح صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق نے کیا تھا اور مولانا نے اس میں صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔

مولانا کا فلسفہ کا ذوق بہت پرانا ہے۔ تمام یونانی اور مغربی فلاسفہ کی کتابیں نہ صرف مولانا نے پڑھی ہیں بلکہ اپنے بہت سے مضامین میں ان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور ان کے بعض فلسفیانہ نظریات پر چبھتے ہوئے اعتراضات کیے ہیں۔ ان اعتراضات اور تنقیدات میں جو وزن اور زور ہے، اس کا اندازہ مختلف کتابوں میں پھیلی ہوئی ان کی تحریروں سے ہو سکتا ہے۔

مولانا کے فلسفہ کے سلسلے میں یہاں ایک دلچسپ واقعہ بھی سننے جایے۔ ۱۹۴۹ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ مولانا حنیف ندوی مسجدِ مبارک میں خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے۔ دورانِ خطبہ میں زیرِ تلاوت آیت کے ضمن میں مشہور فلسفی کانٹ کے فلسفہ کا کوئی نظریہ بحث کی زد میں آگیا اور مولانا نے قرآن کی رو سے فلسفیانہ انداز میں اس کو محلِ نقد و جرح ٹھہرایا۔ اس وقت مولوی محمد ابراہیم صاحب جو نج تھے اور عام طور پر مولانا کی اقتدا میں نمازِ جمعہ ادا کرتے تھے، خطبے میں موجود تھے۔ وہ بڑی وجاہت اور باریج شخصیت کے مالک تھے اور علمِ فلسفہ سے شناسا تھے۔ وہ یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ مسجد کا ایک خطیب فلسفہ کی زبان میں کانٹ کے فلسفیانہ افکار کو تنقید و اعتراض کا ہدف بنا سکتا ہے۔ خطبہ ختم ہوا اور نمازِ جمعہ ادا ہو چکی تو نج صاحب مولانا کے پاس آئے اور بطریقِ نصیحت فرمایا کہ آپ کو خطبے میں دینی مسائل بیان کرنے پر کتنا کرنا چاہیے، فلسفہ کے نازک مباحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔

اس واقعہ پر اٹیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن یہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مسجد کے بہت سے نمازیوں کے علاوہ اس وقت اسلامک کالج کے چند اساتذہ اور طلباء بھی وہاں موجود تھے۔ نج صاحب نے مولانا سے فرمایا۔

”آپ فلسفہ جانتے ہیں؟“

مولانا نے کہا! ”آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟“

نچ صاحب بولے: ”آپ نے کانٹ کے فلسفے کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس کی ضرورت نہ تھی۔“

مولانا نے پوچھا: ”آپ کو میری کس بات پر اعتراض ہے؟“  
 نچ صاحب نے اپنے اندازِ خاص سے کچھ سوال کیے تو مولانا نے جواب دینا شروع کیا اور اس نچ سے سلسلہ کلام کو آگے بڑھایا کہ مولوی ابراہیم حج کو سوائے خاموشی اختیار کرنے کے مولانا کی گرفت سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ مولانا سے کچھ سمجھنے کے اسلوب میں بات کرتے اور بودب ہو کر ان کی مجلس میں بیٹھتے۔ محمد حنیف اپنے جسمِ نحیف میں ایک جہانِ دانش سمیٹے ہوئے تھے اور ان کے تنِ زار میں ایک دنیا کے علم آباد تھے۔ ان کی خلوت میں معارف و ہنر کی بہت سی جلو تیں پنہاں تھیں، ان کی تنہائی کئی مجلسوں پر بھاری تھی، ان کی گوشہ نشینی کتنی ہی محفلوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھی، ان کی خاموشی میں انتہا درجے کا تلاطم تھا، ان کے سکوت میں تکلم کے بے شمار بھید و مضمّن تھے، ان کی قلندری کے حضور سکندری سرنگوں تھی اور ان کی فقری کے آگے میری کی گردن جھکی رہتی تھی۔ ان کی زبان کی جنبش سے لڑوئے لالہ بکھر نے لگتے اور قلم کی حرکت سے الفاظ کی شکل میں کاغذ پر موتیوں کی بارش شروع ہو جاتی۔

ان کی خصوصیت یہ تھی کہ منکسر کے سامنے انکسار اور نرمی کا پتلا بن جاتے اور اگر کوئی غرور اور نخوت کا اظہار کرتا تو ان کے لہجے میں فوراً سختی اور خود داری کا عنصر اُبھر آتا۔ میدانِ علم میں کسی سے دب کر بات کرنا یا مرعوب ہونا ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ کسی کو اپنا حریف نہ سمجھتے تھے نہ بناتے تھے، لیکن اگر کوئی حریف کا روپ دھار کر سامنے آتا تو اس سے کئی قدم آگے بڑھ کر بات کرتے۔ آبروئے علم کی حفاظت کرنا اور علما کے صحیح و قار کو ملحوظِ خاطر رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن جو علما علم کو مادی منافع اور عاجل فوائد کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں، ان سے وہ سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔

انھوں نے علم و فن کے سرِ دشت کی سیاحی اور فضل و کمال کے سرِ گلستان کی سیر کی

اپنا وظیفہ حیات قرار دیا۔ جب تک صحت نے اجازت دی وہ طلبِ علم اور مطالعہ کتب میں مصروف رہے، اور یہی جذبہ ان کے معلومات کی وسعت کا باعث ہوا۔ قرآن سے متعلق انھوں نے تین مستقل کتابیں لکھیں جو کم و بیش تین ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔

ان میں سے ایک تفسیر ”سراج البیان“ ہے جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۶ء تک پندرہ مرتبہ چھپی۔ یہ برصغیر کی پہلی کتاب ہے جو تیس اکتیس برس میں اتنی دفعہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب تقریباً دو ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کا رہ ہوا قلم پچاس سال سے زائد عرصے سے شہرہٴ تحقیق پر محوِ خرام تھا۔ قرآن کے سلسلے کی دوسری کتاب ”مطالعہ قرآن“ تصنیف فرمائی جو تین سو سے اوپر صفحات پر محتوی ہے۔

پھر ”لسان القرآن“ کے نام سے دو جلدیں معرضِ اشاعت میں آئیں جو حروفِ ہجاء کی ترتیب سے قرآن مجید کا توضیحی اور جامع لغت ہے۔ اسے علوم و معارف قرآن اور تفسیری جواہر پاروں کا گنجینہ کہنا چاہیے۔ افسوس ہے یہ کتاب مکمل نہ ہو پائی۔ یہ سلسلہ حرف دال تک پہنچا تھا کہ مولانا اس دُنیا سے فانی سے کوچ کر گئے۔ مطبوعہ صورت میں یہ دونوں جلدیں آٹھ سو صفحات پر محیط ہیں۔ اس سے آگے تقریباً سو صفحات کا مسودہ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا پڑا ہے۔ قرآن کے اس لغت کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ان کی بہت بڑی خواہش تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں، اللہ کو یہی منظور تھا جو ہو چکا۔

مولانا اگرچہ یہ کام تیزی سے کر رہے تھے اور اپنے عام معمول سے زیادہ محنت سے کر رہے تھے، لیکن انھوں نے عمر کی جس منزل میں اس کام کا آغاز کیا تھا، اس کے پیش نظر کئی دفعہ میرے دل میں یہ خیال آیا (اور بعض دیگر حضرات نے بھی اس کا اظہار کیا) کہ اگر یہ سلسلہ اتمام کی منزل کو پہنچ گیا تو اسے معجزہ ہی قرار دیا جائے گا۔ بہر حال اگر یہ کام مکمل ہو جاتا تو لغت کے ساتھ ساتھ اسے اچھی خاصی تفسیر کا درجہ بھی حاصل ہوتا۔

ان تین کتابوں کے علاوہ قرآن کے مختلف موضوعات پر ان کے بہت سے مضامین متعدد رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہوئے۔

علمِ حدیث سے ان کو خاص شغف اور گہرا تعلق تھا۔ اس پر تنقید برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس ضمن میں ایک مستقل کتاب ”مطالعہ حدیث“ تصنیف فرمائی اور بے شمار مضامین تحریر فرمائے جو کئی رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے۔

سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضبطِ تحریر میں لانے کا سلسلہ انھوں نے ”چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں“ کے دلکش عنوان سے شروع کیا تھا۔ ان کا مقصد قرآن کی روشنی میں آنحضرت کی حیاتِ طیبہ کو معرضِ کتابت میں لانا تھا۔ افسوس ہے یہ سلسلہ تمام کو نہ پہنچ سکا۔ تاہم کتابی شکل میں یہ اب بھی تین سو صفحات کی کتاب ہو سکتی ہے جو اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہوگی۔

”اساسیاتِ اسلام“ اپنے موضوع میں ان کی ایک اہم کتاب ہے، جس میں اسلام کے بنیادی تقاضے بیان کیے گئے ہیں۔

اسی طرح مسئلہ اجتہاد، افکار ابن خلدون، افکار غزالی، سرگزشتِ غزالی، تعلیماتِ غزالی، عقلیاتِ ابن تیمیہ، تہافتِ الفلاسفہ کی تلخیص و تفہیم اور اس پر طویل مقدمہ، قدیم یونانی فلسفہ (غزالی کی مقاصد الفلاسفہ کا اردو ترجمہ)، مسلمانوں کے عقائد و افکار (ابوالحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین کا دو جلدوں میں ترجمہ) وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو ہر اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

مولانا ندوی نے متنوع موضوعات کو ہدفِ بحث ٹھہرایا اور ان میں خوب دادِ تحقیق دی۔ تفسیر، حدیث، اجتہاد، سیرتِ رسول، اسلامی فلسفہ وغیرہ عنوانات پر انھوں نے جس نہج سے لکھا، وہ انہی کا حصہ ہے۔ زبان و بیان نہایت عمدہ اور ادبیّت سے مزین۔ ان موضوعات میں اتنی وسعت ہے کہ ان میں سے ہر موضوع پر اصحابِ تحقیق کے لیے پی، ایچ، ڈی کا ایک ایک مقالہ ہو سکتا ہے۔

مولانا کی ”لسان القرآن“ کے بارے میں ایک لطیفہ بھی نوکِ قلم پر آگیا ہے۔ ۱۹۸۵ء

کے نمبر کی بات ہے کہ ایک مشہور خاندان کے ایک عالم دین نے مجھ سے پوچھا کہ ”مولانا محمد حنیف ندوی آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟“

میں نے بتایا کہ وہ ”لسان القرآن“ کے نام سے قرآن مجید کا لغت لکھ رہے ہیں جس کی پہلی جلد شائع بھی ہو چکی ہے۔

بولے ”قرآن مجید کا لغت کیا ہوتا ہے؟“

میں حیران ہوا کہ ایک عالم دین کو اس کا کیا جواب دوں۔ عرض کیا :  
 ”حروفِ تمجی کی ترتیب سے انھوں نے یہ کام شروع کیا ہے۔ مثلاً آدم کا کیا مطلب ہے، ابراہیم کس شخصیت کا نام تھا، انسان کے کیا معنی ہیں، جن کون سی مخلوق ہے، جہنم کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ اس طرح بہت سے الفاظ گنوانے کے بعد آخر میں عرض کیا کہ مثلاً جہل کیا ہے اور جاہلیت کا کیا مفہوم ہے۔“

وہ چوں کہ عالم دین ہیں اور عربی کے آدمی ہیں، سوچا کہ اس موضوع کی کسی عربی کتاب کا نام ہی ان کے سامنے لینا چاہیے۔ لہذا بتایا کہ مولانا اسی طرح قرآن کا لغت لکھ رہے ہیں، جیسے امام راغب اصفہانی کی مفردات القرآن ہے۔ فرق یہ ہے کہ مفردات القرآن مختصر ہے، مولانا کا لغت جامع اور توضیحی ہے، جس میں بہت سے الفاظ قرآن کے مطالب، وضاحت و جامعیت سے بیان کیے گئے ہیں۔

وہ مفردات القرآن کے حروف کو کسی قدر طوالت دیتے ہوئے بولے :

مفردات — ت — القرآن — ن

میں سمجھ گیا کہ قصور ان کا نہیں، میرا ہے جس نے ان کے سامنے ایسی بات کی جو ان کے ذہن سے ہم آہنگ نہیں۔ اس کے بعد دس بارہ منٹ ہم اکٹھے رہے، نہ انھوں نے کوئی بات کی اور نہ میرے لیے کچھ عرض کرنے کی گنجائش چھوڑی۔

دوسرے دن دفتر آکر مولانا کو یہ لطیفہ سنایا۔ پہلے تو سن کر حسبِ عادت مسکرائے۔

پھر کہا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وضع قطع اور ہیئت کذائی کے اعتبار سے مولانا کا انداز ہماری تہذیب کے انیسویں



صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے اساتذہ فن سے ملتا جلتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غالب، ذوق، ڈپٹی نذیر احمد، راشد النجری اور حالی و شبلی کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالوں کی تراش خراش، شکل و شباهت، چال ڈھال، گفتگو، رکھ رکھاؤ، وضعداری، لب و لہجہ، خوش ذوقی اور خوش مزاجی میں انہی کی مجلس کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کی غربت و تنگ دستی اور گھریلو معاملات سے بے پروائی کے اوصاف بھی مولانا میں پائے جاتے تھے۔

موجودہ عہد کے علمائے برصغیر میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے مزاج اور فہم و فکر کے تنہا عالم تھے۔ نہایت روشن خیال، عالی فکر، صاف ذہن اور وسیع ظرف و ضمیر کے مالک۔! بعض لوگوں نے ان کے بعض افکار پر تنقید تو کی، جسے انھوں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی، لیکن طرزِ بیان و ادا اور اسلوبِ دلائل و استنباط میں یہ لوگ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور نہ حقائق کا جواب حقائق کی روشنی میں دے سکے۔ انھوں نے بیماری سے کچھ عرصہ پہلے ہی عام مجلسوں میں شریک ہونا اور تقریر و خطا کی محفلوں میں جانا بند کر دیا تھا۔ اگر کسی کے اصرار پر بامرِ مجبوری جانا بھی پڑا تو خواہش بیٹھے لوگوں کی باتیں سنتے رہے، خود بہت کم بات کی۔ البتہ اگر درسِ قرآن کے لیے کہا جاتا تو تیار ہو جاتے اور اس میں نہایت علمی نکات بیان فرماتے۔ آخری علمی اور تدریسی مجلس جس میں وہ شریک ہوئے، دارالعلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ، لاہور) کی تھی جو ان کی وفات سے تین مہینے قبل ۱۳۔ اپریل ۱۹۸۷ (۱۲ شعبان ۱۴۰۷ھ) کو اختتامِ صحیح بخاری کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔

اس مجلس میں ان کو شرکت پر آمادہ کرنے کے لیے دارالعلوم کے اربابِ انتظام نے ان سے رابطہ کیا تو انھوں نے اپنی جسمانی کمزوری اور بیماری کی بنا پر معذرت کر دی۔ واقعہً وہ اس معذرت میں حق بجانب تھے۔ پھر اصحابِ انتظام نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں شرکت پر آمادہ کروں۔ میں پروفیسر محمد یحییٰ (انجینیئرنگ یونیورسٹی) کے ساتھ مولانا کے گھر پہنچا اور ان سے بات کی۔ پہلے تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر میرے کہنے

پرمان گئے۔ لیکن شرط یہ عائد کی کہ تقریر نہیں کریں گے، صرف پندرہ منٹ وہاں بیٹھیں گے۔ وہ انھیں محض تہرہ کا لے جانا چاہتے تھے۔ دوسرے دن دس بجے کے بعد وہ انھیں لے گئے۔ پندرہ منٹ کے بجائے پینتیس منٹ وہاں تشریف فرما رہے۔ تقریر وغیرہ نہیں کی۔ کمزوری کی وجہ سے تقریر کر بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ کسی تدریسی اور تعلیمی مجلس میں ان کی زندگی کی آخری شرکت تھی۔

مولانا ندوی جسم و جان کے اعتبار سے ہماری اس آب و گل دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن ان کا کام جو انتہائی وقیع ہے، ہمیشہ باقی رہے گا اور لوگ رہتی دنیا تک اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ انھوں نے علم و فضل کا جو گلستاں سجایا ہے، اس کی ہر قیامت تک باقی رہے گی اور بہت سے گلچیں اس گلستاں سے اپنی اپنی پسند کے گل چننے اور مشامِ جاں کے لیے اس سے خوشبو حاصل کرتے رہیں گے۔

مولانا ندوی ۱۰ جون ۱۹۰۸ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء کو ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس طرح شمسی حساب سے انھوں نے ۷۹ سال ایک مہینہ دو دن عمر پائی۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء کی سر دیوں میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک کئی دفعہ ان سے ملاقات کے مواقع میسر آئے، لیکن ۱۹۴۸ء میں ہمارے تعلقات نے ایک نہایت خوش گوار کروٹ لی۔ اس وقت سے لے کر ان کی تاریخ وفات تک ہمارے باہمی مراسم میں روز بروز استحکام ہی پیدا ہوتا گیا۔ ان کی وفات کے بعد اس بھری پڑی دنیا میں، میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے مشفق، کرم فرما اور انتہائی خیر خواہ تھے۔

۱۵۔ مئی ۱۹۵۱ء کو وہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستہ ہوئے۔ اپنی وفات تک (چھتیس سال دو مہینے) وہ ادارے سے منسلک رہے۔

مولانا ندوی نہایت بلند اخلاق، عالی کردار، خوش مزاج اور باغ و بہارِ عالم دین تھے۔ میں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف

ہوں۔ وہ انتہائی خوددار تھے۔ انھوں نے اپنی خودطاری اور وضع داری کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور مکان یا پلاٹ خریدنے کی مالی اعتبار سے ان میں سکت نہ تھی۔ وہ کبھی کسی سرملیہ دار کے ہاں نہیں گئے۔ انھوں نے کبھی کسی کی جیب کے بوجھ کو قابلِ اعتنا نہیں گردانا، کبھی کسی کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کیا اور کبھی کسی سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کی کہ مخاطب کے دل میں ان کے لیے جذبہٴ ترحم پیدا ہو اور وہ ان کی اعانت کرے۔ وہ بے شمار خصوصیات کے حامل تھے اور اس ضمن میں طبقہٴ علما میں کوئی ان کا حریف یا متقابل نہیں تھا۔ وہ اپنے انداز کے تنہا عالم تھے۔

بعض حضرات نے مولانا حمید ندوی کو علامہ سید سلیمان ندوی کا شاگرد دکھا ہے۔ وہ اس اعتبار سے سید صاحب کے شاگرد نہ تھے کہ انھوں نے سید صاحب سے کچھ پڑھا ہو۔ البتہ ان کے زمانہٴ طالب علمی میں سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمدِ تعلیمات تھے۔ ندوہ لکھنؤ میں ہے اور سید صاحب دارالمصنفین (اعظم گڑھ) میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھے۔ تین چار مہینے کے بعد وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض انتظامات کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لے جاتے تھے اور اساتذہ و طلباء سے وہاں ان کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس حیثیت سے اگر مولانا ندوی کو سید صاحب کے شاگرد کہا جائے تو الگ بات ہے، ورنہ انھوں نے براہِ راست سید صاحب سے کچھ پڑھا نہیں۔ مولانا حمید ندوی کی موت تنہا ایک شخص کی موت نہیں ہے۔ ایک خاص قسم کے رکھ رکھاؤ اور وضعداری کی موت ہے، تہذیب و ثقافت کی صاف ستھری روایت کا خاتمہ ہے، فضل و کمال کی بلندیوں کے روبرو زوال ہونے کا ماتم ہے، تحقیق و کاوش کی اعلیٰ قدروں کی جان کنی ہے، زبان و انداز کے پُر شکوہ اسلوب کے ختم ہو جانے کا دردناک نوحہ ہے اور تصنیف و تالیف کے پاکیزہ ذوق کو شدید دھچکا لگنے پر اظہارِ حزن و ملال ہے۔ اپنے دور کی ندوی برادری کے مولانا حمید ندوی آخری رکن تھے، ان کی وفات کے ساتھ ہی بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے ندوی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ مولانا

سید ابوالحسن علی ندوی کا دور ان کے بعد کا ہے۔

مولانا حنیف ندوی علم و فضل کی محفلِ دوشیں کی وہ شمعِ فروزاں تھے جن کی تصنیفات و تحقیقات کی ضوفشانیوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا اور جن کے کمالاتِ علمیہ سے اصحابِ ذوق رہتی دنیا تک کسبِ ضیا کرتے رہیں گے۔

وہ اگرچہ طبعی عمر کو پہنچ گئے تھے، لیکن ان کا شمار ان اربابِ فضیلت میں ہوتا ہے، جن کی منازلِ عمر کو ماہ و سال کے پیمانوں سے نہیں پایا جاتا، بلکہ اللہ سے ان کے لیے مزید درازیِ عمر کی دعا کی جاتی ہے، تاکہ ان کے علمی فیضِ رسانیوں کا دائرہ اور وسیع ہو اور ان کی تحقیق و کاوش کے حلقے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ اختیار کریں۔

موت و حیات کے ہمہ گیر قاعدے کے مطابق ہر متنفس کو مرنا ہے۔ مولانا کو بھی ایک دن مرنا تھا اور وہ موت کا لقمہ بن گئے۔ لیکن موت اور موت میں فرق ہے، انسان اور انسان میں بھی فرق ہے۔

قضا کس کو نہیں آتی ہے، یوں تو سب ہی مرتے ہیں

پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

مختلف مسائل و معاملات سے متعلق مولانا ندوی نہایت عمدہ تجزیہ کرتے تھے۔ ایک دن عام علمائے دین اور صوفیائے کرام کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تبلیغِ حق کے سلسلے میں دونوں ایک ہی قسم کی بات کہیں گے، لیکن دونوں کے لب و لہجے اور اسلوبِ کلام میں نمایاں فرق ہوگا۔

عالمِ دین کلمہ حق کہنے میں انتخابِ الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دے گا۔ نرم یا سخت جو الفاظ زبان پر آئے بلا تاثر کہہ دے گا، یہ خیال نہیں کرے گا کہ مخاطب پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ حق کڑوا ہوتا ہے اور اس کی کڑواہٹ کا اثر مخاطب کے حلق اور معدے تک پہنچنا چاہیے۔ لیکن صوفی اور عارف اس طرزِ ادا کو نہیں اپنائے گا۔ وہ سخت سے سخت بات کہنے کے لیے بھی نرم سے نرم الفاظ تلاش کرے گا۔ اس کی کوشش یہ ہوگی کہ اپنی بات بھی کہہ دی جائے اور

مخاطب کو ذہنی اور قلبی تکلیف بھی نہ پہنچے۔

مولانا کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ آج کل اکثر مبلغین کو ہم دیکھتے ہیں کہ انتخابِ الفاظ کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ایسا ترش اور کڑوا انداز اختیار کرتے ہیں کہ مخاطب پر اچھا اثر پڑنے کے بجائے بُرا اثر پڑتا ہے۔ حلال کہ قرآن کا واضح حکم ہے کہ نرم و ملائم لفظوں میں تبلیغ کرنی چاہیے اور نوبت جھگڑے تک بھی پہنچ جائے تو گفتگو میں احسن طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

موت کے بارے میں مولانا ندوی کہا کرتے تھے کہ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ موت، تغیرِ مقام اور تغیرِ احوال کا نام ہے۔ جو شخص اس کا رگاہِ آفرینش میں اس ڈھب سے زندگی بسر کرتا ہے کہ جو موت کے بعد پیش آنے والے ماحول و اسلوب سے ہم آہنگ ہو سکے، اس کی وہاں پہنچتے ہی اس ماحول اور اس طرزِ حیات سے مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور اسے وہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا ابتدا ہی سے اسی ماحول اور اسی نواح سے اس کا تعلق ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اس دنیا میں رہ کر بعد از موت کے اسلوبِ زلست کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، وہاں انھیں بلاشبہ دقت پیش آئے گی۔ انھیں تھوڑی بہت اذیت اٹھانے اور کچھ عرصہ گزارنے کے بعد بہ تدریج اس ماحول سے موائست و مطابقت پیدا ہوگی۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس دنیا میں بھی ماحول کی عدم مطابقت اور اجنبیت کی وجہ سے عام طور پر ہمیں یہ دقت پیش آتی ہے۔ مثلاً ہم کسی ایسے علاقے یا ملک میں چلے جاتے ہیں جہاں کی زبان، ثقافت، تہذیب اور طرزِ معاشرت سے واقفیت نہیں ہوتی تو جب تک اس سے ذہنی مطابقت اور لسانی مناسبت نہیں پیدا ہو جاتی، احساسِ اجنبیت قائم رہتا ہے اور جوں ہی مناسبت و مطابقت پیدا ہوتی، غیریت اور دوئی کے تمام حجاب ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال انسان کی قلبی اور علیٰ استعداد سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر یہ استعداد تیز ہے تو مطابقت جلد پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اس

میں کمی ہے تو مطابقت کی رفتار ظاہر ہے، کم رہے گی۔

یہ بات خالص عارفانہ ہے اور معرفت و سلوک کا کوئی ماہر ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔

اتنی بڑی حقیقت کو اس درجہ حکیمانہ پیرائے میں کوئی عام عالم بیان نہیں کر سکتا۔

مولانا کہا کرتے تھے کہ ہمارا خدا اپنے بندوں کو ان شائر اللہ عذاب و عقاب کی

ناقابل برداشت شدت سے دوچار نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ وہ رحمن ہے، رحیم

ہے، رؤف ہے، غفور ہے، غفار ہے، تو اب ہے۔ وہ اپنے بارے میں خود کہتا ہے:

رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ - (الاعراف : ۱۵۶)

میری رحمت (کی فراوانی) کا حال یہ ہے کہ ہر شے پر پھیلی ہوئی ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمہ گیر ہے اور دنیا کی ہر چھوٹی بڑی شے کو

اس نے گھیر رکھا ہے۔ اس جہان ہست و بود میں اس کی رحمتوں کا فیضان اس

قدر عام ہے کہ اس کو حیطہ شمار میں لانا اور اس کی وسعتوں کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔

جدھر دیکھو رحمتِ الہی کے فیوض ہی نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ بارگاہِ خداوندی سے

فقط رحمت ہی کا صدور اور ظہور ہوتا ہے:

كُتِبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ ط (الانعام : ۱۲)

اس (اللہ) نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ رحمت فرمائے۔

کائنات کے گوشے گوشے میں اس کے فضل و رحمت کی بارش ہو رہی ہے اور

اس کا یہ قانون اور اصول ہے کہ زمین و آسمان کے دور دراز کناروں تک اپنی رحمت

کو پھیلا دے اور ہر چیز کو اس سے مستفیض ہونے کے مواقع مہیا کرے۔

محمد حنیف! تو نے خودداری کی زندگی بسر کی۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے

جو کچھ مانگا اللہ سے مانگا۔ تجھ پر دنیا نے فانی میں کئی دور آئے، اللہ نے ہر موقع

پر تیری مدد فرمائی۔ تو عمر بھر اللہ اور اس کے رسول کے دین کی خدمت کرتا رہا۔

حدیثِ رسول پر جب کسی نے حملہ کیا، تیرا قلم جوش میں آگیا، تو نے حدیثِ رسول کا

دفاع بھی کیا اور معتزینِ حدیث پر حملے بھی کیے۔ تیری زندگی کے لمحات خدمتِ قرآن

میں گزرے۔ تو اللہ کے کلام اور سینہ لاہوت کے آخری بول کی خدمت میں مصروف تھا کہ تجھ پر مرض الموت نے حملہ کیا، تو اسی حالت میں آسودہ لحد ہوا اور اطمینان کی نیند سویا۔ قرآن بھی تیرا شفیع ہوگا اور صاحبِ حدیث (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تیری شفاعت فرمائیں گے۔ تو ہماری اس عارضی دنیا میں ہمیشہ اور ہر حالت میں مطمئن اور پرسکون رہا۔ ہم عاجز بندوں کو یقین ہے کہ اللہ کے نزدیک بھی جہاں دوام کی زندگی ہے، تو اطمینان و سکون میں ہے۔ اپنی حسنت کے پیشِ نظر اب تو عرشِ الہی کے سامنے ہوگا، قبول و مغفرت کے پھول تجھ پر نچھاور کیے جا رہے ہوں گے۔ موت کے بعد بارگاہِ قدس سے تجھے یہ مسرت انگیز ندا آئی ہوگی :

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ اِرجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً  
مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّاتٍ

